جلد چہارم

مشتمل بر

دیوانِ چہارم

غلام ہمدانی مصحفی امروہوی [متوفی 1240ھ / 1825ء]

بتصحیح

نثار احمد فاروقی

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

ویسٹ بلاک۔1 آر۔کے۔پورم، نئی دہلی 110066

جلد چہارم

مشتمل بر

دیوانِ چہارم

غلام ہمدانی مصحفی امروہوی [متوفی 1240ھ / 1825ء]

بتصحیح

نثار احمد فاروقی

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارتِ ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
ویسٹ بلاک۔ 1 آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی 110066

Kulliyat-e-Mus'hafi

Volume IV

by

Ghulam Hamdani Mus'hafi

Edited by: **Prof. Nisar Ahmad Faruqi**

پہلا ایڈیشن : 1100

سنہ اشاعت : اپریل، جون 2005 شک 1927

قیمت : -/216 روپے

شمارسلسلۂ مطبوعات : 1228

ISBN : 81-7587-097-4

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 1، آر۔ کے۔ پورم نئی دہلی-110066

فون نمبر: 26103938، 26103381، 26179657، فیکس: 26108159

ای۔میل: urducoun@ndf.vsnl.net.in، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in

طابع: لاہوتی پرنٹ ایڈز، جامع مسجد دہلی- 110006

پیش لفظ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ایک قومی مقتدرہ کی حیثیت سے کام کررہی ہے۔ اس کی کارگزاریوں کا دائرہ کئی جہتوں کا احاطہ کرتا ہے جن میں اردو کی ان علمی و ادبی کتابوں کی مکرّر اشاعت بھی شامل ہے جو اردو زبان و ادب کے ارتقاء میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں اور نایاب ہوتی جارہی ہیں۔ ہمارا یہ ادبی سرمایہ محض ماضی کا قیمتی ورثہ ہی نہیں، بلکہ یہ حال کی تعمیر اور مستقبل کی منصوبہ بندی میں ہماری رہنمائی بھی کرتا ہے اور اس لیے اس سے کماحقہ، واقفیت نئی نسلوں کے لیے ضروری ہے۔ قومی اردو کونسل ایک منضبط منصوبے کے تحت عہدِ قدیم کے شاعروں اور نثرنگاروں سے لے کر عہدِ جدید کے شاعروں اور نثرنگاروں تک تمام اہم اہلِ فکروفن کی تصنیفات شائع کرنے کی خواہاں ہے تاکہ نہ صرف اردو کے اس قیمتی علمی و ادبی سرمائے کو آنے والی نسلوں تک پہنچایا جاسکے اور زمانے کی دستبرد سے بھی اسے محفوظ رکھا جاسکے۔

عہدِ حاضر میں اردو کے مستند کلاسیکی متون کی حصولیابی، نیز ان کی کمپوزنگ اور پروف ریڈنگ ایک بہت بڑا مسئلہ ہے، لیکن قومی اردو کونسل نے حتی الوسع اس مسئلے پر قابو پانے کی کوشش کی ہے۔ کلیاتِ غلام ہمدانی مصحفی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جسے کونسل قارئین کی خدمت میں پیش کررہی ہے۔

اہلِ علم سے گزارش ہے کہ کتاب میں کوئی خامی نظر آئے تو تحریر فرمائیں تاکہ اگلی اشاعت میں دور کی جاسکے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ

ڈائرکٹر

فہرست

دیوانِ چہارم

(غزلیات)

ردیف ب

ردیف پ

ردیف ت

ردیف ٹ

ردیف ث

ردیف ج

ردیف چ

ردیف ح

ردیف و

ردیف ہ

ردیف ی

(ب) دیگر اصناف

حرفِ اوّل

شیخ غلام ہمدانی مصحفی امروہوی [وفات 1240ھ/1825ء] نے رسالہ ''مجمع الفوائد'' میں اپنا مولد اکبر پور بتایا ہے۔ میر حسن کے مطبوعہ تذکرۂ شعرائے اُردو میں اُسے ''متصل دہلی'' لکھا گیا ہے۔ مگر مولانا امتیاز علی عرشی نے تذکرۂ میر حسن کے قلمی نسخے کے حوالے سے، جو رام پور رضا لائبریری میں محفوظ ہے، بتایا ہے کہ تذکرے کی اصل عبارت میں متصل کے بعد لفظ ''دہلی'' نہیں ہے۔ یعنی اکبر پور امروہہ کے متصل ہے اور یہی صحیح ہے۔ اس نام کا ایک چھوٹا سا گانو جو اکبر پور پٹی کہلاتا ہے آج بھی امروہے کے شمال میں موجود ہے۔ ممکن ہے یہاں کبھی مصحفی کے آباء واجداد کی زمینداری رہی ہو یا اُن کا خاندان یہاں سے نقل مکانی کر کے امروہے میں آیا ہو۔ اُن کی قومیت راجپوت کلال بتائی گئی ہے۔ مولانا محمد علی جوہر کی والدہ بی امّاں بھی امروہے کے کلال خاندان سے ہی تھیں۔ عہدِ مغلیہ میں اِس خاندان کے اکثر لوگ امروہے کے محلّہ کالی پگڑی میں رہتے تھے، کچھ خاندان اب بھی رہتے ہیں۔ مصحفی کی ابتدائی تعلیم و تربیت امروہے میں ہی ہوئی، میرا خیال ہے کہ وہ 1183ھ تک وہیں رہے۔ اُس وقت اُن کی عمر 22-21 سال رہی ہوگی۔ اُن کی شاعری کا آغاز بھی امروہے میں ہو چکا تھا۔ یہ اندازہ اِس سے ہوتا ہے کہ وہ اپنے تذکرے میں اُس وقت کے بعض معمر شاعروں سے اپنی ملاقات کا حال بیان کرتے ہیں۔ مثلاً محتشم خان محتشم خاصے عمر رسیدہ تھے، اُنھیں مصحفی نے امروہے میں دیکھا تھا۔ اسی طرح وہ آفتاب رائے

رُسوا کا ذکر کرتے ہیں۔ شاہ عبدالرسول نثار اکبر آبادی سے اپنی ملاقات بیان کرتے ہیں جو میر تقی میر کے شاگرد اور قادری سلسلے کے بزرگ ہیں۔ رئیس امروہوی، کمال امروہوی اور جون ایلیا وغیرہ کے جدامجد ابدال محمد بن محمد منور [ساکن محلّہ لکڑہ] اُن کے مرید تھے، اِسی لیے نثار 1165ھ اور 1168ھ کے درمیان کسی وقت امروہے میں جا کر رہنے لگے تھے۔ وہیں اُن کا انتقال ہوا اور شرف الدین سہروردیؒ کی درگاہ کے قریب ابدال محمد کی تعمیر کردہ ایک مسجد کے شمال مشرقی گوشے میں آج بھی اُن کی قبر موجود ہے۔ اُس پر ابدال محمد نے ایک مقبرہ بھی تعمیر کرا دیا تھا۔ اِس مسجد کا وقف نامہ 26 رشعبان 1186ھ کا لکھا ہوا ہے۔ اُسی زمانے میں کسی وقت نثار اکبر آبادی کا انتقال ہوا۔ مصحفی اُن کی زندگی کے آخری ایام میں اُن سے ملتے رہے تھے۔ کہتے ہیں: ''فقیر او را در ابتدائے شاعری در قصبۂ امروہہ دیدہ بود۔ اکثر بعد ہفتہ وعشرہ ملاقات می شد وتذکرۂ شعر بمیان می آمد''۔ شاہ عبدالرسول نثار کی عمر اُس وقت ساٹھ سال سے زیادہ تھی۔ ایسے معمّر استاد کی خدمت میں حاضر ہونا اور شعر خوانی کرنا خود اِس بات کی علامت ہے کہ مصحفی اور اُن کی شاعری دونوں سنِ شعور کو پہنچ چکے تھے۔ 1184ھ میں وہ امروہے سے نکل کر ممکن ہے پہلے دہلی آئے ہوں، پھر وہاں سے ٹانڈے گئے، جہاں نواب محمد یار خان امیر اپنا دربار سجائے بیٹھے تھے۔ میرا خیال ہے کہ وہ 1183ھ یا 1184ھ میں امروہے سے نکلے تو پھر کبھی اُنھیں وطن واپس آنا نصیب نہیں ہوا۔ وہ خود کہتے ہیں:

آشیاں دور رہا ہم سے، چمن سے نکلے　　گھر سے آوارہ ہوئے، شہر و وطن سے نکلے

اے مصحفی نہ دیکھا روئے وطن پھر آکر　　شاید کہ چھینکتے تو اے یار گھر سے نکلا

اس ساعت بد نکلے وطن سے کہ پلٹ کر　　منھ ہم نے نہ دیکھا کبھی پھر صبح وطن کا

قسمت مری بُری تھی، کیا پوچھتے ہو یارو　　میں کیا کہوں کہ کیسے گلزار گھر سے نکلا

اُنھیں اس کا رنج بھی رہا کہ وطن کی سرزمین میں اُنھیں دفن ہونے کے لیے دوگز

زمین بھی نصیب نہ ہوئی:

غربت میں یوں جو مجھ کو آوارہ کر کے مارا　　جائے لحد نہ تھی کیا خاکِ وطن کی تہ میں؟

مصحفی کی شاعری کے رموز و علائم میں اور زبان و بیان میں امروہہ پوری طرح جھلک رہا ہے مگر اُس کا واضح لفظوں میں تذکرہ صرف دو شعروں میں ملتا ہے۔ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کے چھوٹے بیٹے حضرت شیخ صدرالدین محمد یعقوبؒ سفر کرتے ہوئے امروہہ آئے تھے اور یہاں اُنھیں ٹھگوں نے شہید کر دیا تھا۔ اِس لیے بعد کے زمانے میں وہ جھنڈہ شہید یعنی چلتے پھرتے شہید ہونے والے کہلائے اور جہاں اُن کا مزار ہے وہ محلّہ جھنڈا شہید کہلانے لگا۔ امروہے میں پہلی خانقاہ شیخ صدرالدین محمد یعقوب کی ہی قائم ہوئی تھی، جس کے نگراں حضرت بابا فریدؒ کے نواسے خواجہ محمد امامؒ کے پوتے شیخ نصیرالدینؒ تھے۔ جب غالباً 741ھ میں ابن بطوطہ امروہہ آیا ہے تو شیخ نصیرالدینؒ نے ہی اُس کا استقبال کیا تھا اور دعوت بھی کی تھی۔ بعد کو محض یادداشت سے اپنا سفرنامہ لکھتے وقت وہ اُن کا نام بھول گیا اور صرف ''شیخ زادیہ'' لکھا۔ زاویہ سے مراد خانقاہ ہے اور شیخ صدرالدینؒ کی مذکورہ خانقاہ کے سوا اُس وقت امروہے میں دوسری کوئی خانقاہ نہیں تھی۔ مصحفی کہتے ہیں:

مقام اُس کا گر امروہے میں ہو تو کاش یاروں سے　　کوئی یہ شیخ صدو کی ہے یاں درگاہ بول اُٹھے

116i ھ میں جب محمد شاہ کی وفات کے بعد احمد شاہ تخت نشین ہوا اور نواب صفدر جنگ وزیر اعظم ہوا تو اس خانقاہ میں رہنے والوں کو جاگیر دے کر مذہب اثنا عشری میں شامل کر لیا گیا۔ شیخ صدرالدینؒ کو ''شیخ سدو'' بنا کر خانقاہ کے عقب میں واقع کیقبادی مسجد (تعمیر 686ھ) میں منتقل کر دیا اور اُن کے بارے میں نہایت بیہودہ روایات خود اُن لوگوں نے مشہور کر دیں جو رشتے میں اُن کے نواسے ہوتے تھے۔ مصحفی نے دیوانِ اول کے ایک شعر میں بہت بلیغ اشارہ کیا ہے۔ 1168ھ میں کیقبادی مسجد کی مرمت ہوئی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت تک اس میں باقاعدہ نماز ہوا کرتی تھی۔ یہ اس سال کے بعد کسی

وقت ''شیخ سدو کا تھان'' بنادی گئی:

جہاں شیخ جی روز سجدہ کریں تھے وہاں شیخ سدو کا اک تھان نکلا

مصحفی کا دوسرا امتیاز یہ ہے کہ وہ امرو ہے کی زبان اور محاورے کے بہترین نمایندے ہیں۔ عوامی اردو کی مثالیں اتنی بہتات کے ساتھ دوسرے کسی شاعر کے کلام میں نہیں ملتیں۔ اُن کی زبان اور علامتوں میں طبقۂ متوسط کی قصباتی زندگی اور روزمرہ کی جو تصویر مصحفی کے کلام میں ملتی ہے وہ شاید ہی کہیں اور نظر آئے۔ یہاں صرف چند الفاظ بطور نمونہ لکھتا ہوں جن کا استعمال دوسرے قدیم شعراء کے کلام میں مشکل سے ملے گا اور یہ سب مستند عوامی بولی کے الفاظ ہیں جسے ''کھڑی بولی'' کہا گیا ہے حالانکہ یہ ''کھری بولی'' [یعنی معیاری زبان] ہے:

''بوڑھے چونڈے پہ کرم کیجیے۔ کھندلیے ایڑیوں سے۔ کھڑاگ۔ تیلیا کپڑے۔ چل بچل۔ گھٹتا ہے۔ بذّات (بدذات)۔ گراں ڈیل۔ للاہٹ۔ اُداہٹ۔ سوندھا۔ چنّیاں۔ چمپی (مالش)۔ توباہ (توبہ)۔ میدے کی لوہی۔ ہمسار کے (ہم جیسے)۔ گھرسنا۔ ٹھاٹھر کبوتروں کا۔ لپیٹ سپیٹ (حیلے بہانے) وغیرہ''۔

یہ صرف چند سرسری مثالیں مصحفی کے روزمرہ کو سمجھنے کے لیے کافی ہیں۔

نواب محمد یار خان کے دربار تک مصحفی کی رسائی ممکن ہے قائم چاندپوری کی وساطت سے ہوئی ہو، اُس وقت روہیلہ ریاست سخت بحران کا شکار تھی 1185ھ میں مرہٹوں نے شاہ عالم [1173ھ/1221ھ] کو اُکسا کر روہیلوں پر حملہ کیا [23/فروری 1772ھ]۔ سکرتال کی اِس جنگ میں نواب نجیب الدولہ [وفات 31/اکتوبر 1770ء] کے بیٹے ضابطہ خان [وفات 1775ء] کو شکست ہوئی۔ اُسے میدان چھوڑ کر ایسے بھاگنا پڑا کہ اپنے حرم کو بھی ساتھ نہ لے جا سکا۔ اُس کی تاریخ مرزا رفیع سودا نے یوں کہی تھی:

''غوث گڑھ سے گیا وہ کھو کر شرم'' اس میں ''غوث گڑھ'' کے اعداد 1725 میں سے ''شرم'' کے 540 نکال دیں تو 1185ء حاصل ہوتے ہیں۔ سکرتال سے واپسی میں مرہٹوں نے سارے روہیل کھنڈ کو بری طرح سے لوٹا۔ امروہہ اِس لوٹ سے بچ گیا تھا کیونکہ مرہٹوں کو نجف خاں [وفات 6/اپریل 1782ء] کی وساطت سے جو مع اپنی فوج کے تین ہزار روپیہ یومیہ تن خواہ پر مرہٹوں کا ملازم ہو گیا تھا، ساٹھ ہزار روپیہ تاوان جنگ دے دیا گیا۔ ٹانڈے کی یہ بزم آرائیاں چار پانچ مہینے سے زیادہ جاری نہ رہ سکیں۔ بقول مصحفی ''فلک حقہ باز نے سنگ تفرقہ پھینکا اور یہ محفل درہم برہم ہو گئی''۔

اس میکدے میں بر سر جام و سبوے عیش　　پھینکا ہے آسماں نے زبس سنگِ تفرقہ
لایا نہیں زباں پہ کبھی گفتگو عیش　　دستِ سبو شکستہ ہے اور جام اب تلک

ٹانڈے میں مصحفی قائم چاند پوری کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ کھانا پینا بھی دونوں کا ساتھ ہی تھا۔ اُن کا کسی رئیس کی محفل سے منسلک ہونے کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ مصحفی کا عنفوان شباب تھا اس لیے اُن دنوں کو وہ ہمیشہ یاد کرتے رہے۔ یہ محفل برہم ہوئی تو قائم چاند پوری نے لکھنؤ کا رُخ کیا اور مصحفی دہلی آ گئے تھے۔ دہلی میں 1186ھ سے 1198ھ تک نواب نجف خاں کا طوطی بول رہا تھا۔ مصحفی نوجوان تھے اور ابھی اُنھیں کوئی سماجی امتیاز بھی حاصل نہ ہوا تھا، اُس وقت کے سیاسی حالات بھی ایسے تھے کہ ایرانی و تورانی گروپ میں خوب کھینچا تانی ہو رہی تھی۔ اس لیے مصحفی کا شاہی دربار سے یا نجف خاں کی سرکار سے فیض یاب ہونا ممکن نہ تھا۔ وہ اُس زمانے میں خانہ نشین ہو گئے تھے اور کوئی چھوٹی موٹی تجارت شروع کر دی تھی جس کی طرف میر حسن نے بھی اشارہ کیا ہے۔

کیا پوچھو ہو اُس بے سر و سامان کی اوقات　　ہے خانہ نشیں مصحفی افلاس کے مارے

دہلی میں مصحفی خوش حالی کی زندگی نہیں گزار رہے تھے، بلکہ دہلی کی عام تباہی اور دربار شاہی کے تدریجی زوال کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔

وے دن گئے کہ دبدبۂ خسروی تھا یاں سونے پڑے ہیں دیکھ تو کیا کیا مکان آج
جن کے جلو میں چلتے تھے لاکھوں نشان، واں دیکھو تو کچھ زمیں پہ ہے اُن کا نشان آج؟
کلہ پوشوں نے یوں غارت کیا اس خانۂ دل کو کہ جیسے فوجِ شہ آکر جہان آباد لوٹے ہے

کیسی کیسی شاندار عمارتیں اور بڑی بڑی حویلیاں تھیں جو لُٹ پٹ کر تباہ و برباد ہو چکی تھیں۔ دیوان عام، دیوان خاص، مقبرہ ہمایوں اور مقبرۂ عبدالرحیم خان خاناں تک کے قیمتی پتھر نوچے جا چکے تھے:

کیا پوچھتے ہو حادثۂ حضرتِ دہلی واں خاک برابر ہوئیں کیا کیا نہ عمارت
دلی کی وہ عمارتیں آتی ہیں جب کہ یاد مرتے ہیں ہم بہ حسرتِ دیوارِ سنگ وخشت
محلوں کی واں کے کیا میں کہوں خوبصورتی دیکھا نہ اِس طرح کا کہیں کارِ سنگ وخشت
دلی سے پختہ محلوں کے وارث کدھر گئے؟ اب تک ڈھی پڑی ہیں جو دیوار سنگ وخشت

مگر لکھنؤ جانے کے بعد اُس زمانے کی اُجڑی ہوئی دہلی کو بھی بڑی حسرت سے یاد کرتے رہے۔ میر نے بھی کہا تھا:

خرابہ دلی کا وہ چند بہتر لکھنؤ سے تھا وہیں اے کاش مر جاتا سراسیمہ نہ آتا یاں

مصحفی کی ولادت سے تقریباً دس گیارہ سال پہلے تو دلی کو 1151ھ/1739ء میں نادر شاہ نے ایسا تباہ کر دیا تھا کہ سلطنتِ مغلیہ کی ریڑھ کی ہڈی ہی توڑ کر رکھ دی تھی۔ حملۂ نادری سے دس گیارہ سال بعد مصحفی پیدا ہوئے اور تقریباً 34 سال بعد دہلی میں آئے ہیں، تو اب یہاں وہ اُس دلی کے اصلی رنگ روپ کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ جس کے لیے میر نے کہا تھا:

دلی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصوّر تھے جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

یا

دلی جو ایک شہر تھا رشکِ نعیم آہ ہم رہنے والے ہیں اُسی اُجڑے دیار کے

پھر موئے پر سو دُرّے احمد شاہ ابدالی نے لگائے۔ اُس نے تابڑ توڑ سات حملے کیے۔ اُس کی فوجوں نے اُجڑی ہوئی دلی کو بھی دونوں ہاتھوں سے خوب لوٹا۔ شاہی قلعہ اور امراء کی حویلیوں میں تو پہلے ہی جھاڑو لگ چکی تھی، اب عام باشندوں کے گھر اور املاک ان لٹیروں کی زد میں آتے تھے۔ ابدالی کے ایک حملے میں میر تقی میر کا گھر بھی لوٹا گیا تھا۔ اُس کے بعد مرہٹوں کی بن آئی تھی، کبھی اُنھیں ایرانی گروپ اپنی حمایت میں بلاتا تھا، کبھی وہ تورانیوں کے ساتھ ہو جاتے تھے، کبھی خود ہی آ کر شہر کو لوٹ لیتے تھے۔ مرہٹہ فوج کے جھنڈے پر ایک سانپ بنا ہوتا تھا۔ مصحفی نے کہا ہے:

ہے نشاں موذی گری کا دکھنیوں کے ہاتھ میں　　تب تو فوج اُن کے لیے پھرتی ہے بیرق سانپ کی

مصحفی نے بھی وہ نہایت معمولی سہی مگر روز مرہ ضرورت کا جو کچھ سامان جوڑ رکھا تھا اُن کے لکھنؤ جانے سے پہلے ایک بار وہ بھی لوٹ لیا گیا تھا۔

دلی میں اپنا تھا جو کچھ اسباب لٹ گیا　　اِس دل کو لے کے آئے ہیں اُس سرزمیں سے ہم

اُس وقت دلی کے عام شہریوں کا وہ حال تھا جو مرزا غالب نے 1857ء کے حشر اجساد کے بعد دلی والوں کی کیفیت لکھی ہے کہ باعزت پردہ نشین عورتیں کسبیاں اور بھکارنیں بن گئی تھیں۔ مصحفی نے وہی بات اِس شعر میں کہی ہے:

جن پردگی زنوں نے دیکھا نہ تھا در اپنا　　وہ گردشِ فلک سے روزی کو در بدر ہیں

اس آئے دن کی لوٹ مار کا نتیجہ یہ تھا کہ جس کے لیے بھی ممکن ہوتا تھا وہ شہر سے نکل کر اِدھر اُدھر پناہ ڈھونڈھتا پھرتا تھا۔ میر نے بھی اِسی طرح کبھی ڈیگ میں کبھی کاماں اور کبھی کمھیر میں اپنا سر چھپایا تھا۔ اِس طوائف الملوکی اور سیاسی بحران کا پورا فائدہ نہایت خاموشی اور چالاکی سے انگریز اُٹھا رہے تھے۔ شاہ عالم ثانی کا عہد آنے تک وہ سلطنت میں پوری طرح دخیل ہو چکے تھے اور بادشاہ اُن کا وظیفہ خوار بن کر رہ گیا تھا۔ مصحفی کو اس کا بھی احساس تھا:

ہندستاں کی دولت وحشمت جو کچھ کہ تھی　　کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی

دَور ہے مصحفی فرنگی کا　　کام ایسا نہ کر کہ کھاوے کیٹ

مصحفی نے دلی کی اصلی تصویر کہاں دیکھی تھی، اُس کے کھنڈر دیکھے تھے۔ یہ شہر جو کبھی رشکِ بغداد وصفاہان وشیراز تھا۔ جب مصحفی یہاں آئے ہیں تو ایسا ہو گیا تھا کہ:

دلی ہوئی ہے ویراں سونے کھنڈر پڑے ہیں　　ویران ہیں محلے، سنسان گھر پڑے ہیں

قریاتِ ہند کا اب، یہ رنگ ہے کہ کوسوں　　جاوے کوئی جدھر کو اُجڑے نگر پڑے ہیں

کچھ امراء جو مجبوراً دلی میں پڑے رہ گئے تھے اُن کا فاقوں سے وہ حال تھا جو میر تقی میر نے اپنی آپ بیتی میں لکھا ہے۔ مصحفی بھی کہتے ہیں:

حال یہ سرکاروں کا اب کے امیروں کی ہے　　دیگچے بیکار ہیں، سرد پڑے ہیں اُجاغ

اے مصحفی مودی کو لوں ٹوک تو وہ مجھ سے　　کہتا ہے کہ ہاتھی بھی سرکار کے بھوکے ہیں

لکھنؤ میں اگرچہ کسی قدر خوش حالی اور فارغ البالی کا ماحول تھا مگر مصحفی وہاں بھی دلی ہی کو یاد کرتے رہے۔ اُنھیں وہاں بھی معاشی فراغ نصیب نہ ہوا۔ عبدالقادر غمگین جب لکھنؤ میں مصحفی کے گھر جا کر اُن سے ملے ہیں تو وہ بچوں کو پڑھا رہے تھے۔ نہایت معمولی گھر تھا جس کا نقشہ خود اُنھوں نے اپنی مثنوی میں کھینچا ہے۔ لکھنؤ میں اُن کے شاگرد بہت تھے مگر وہ اِس لیے تھے کہ مصحفی نہایت زود گو، قادر الکلام شاعر ہونے کے ساتھ مفلس اور ضرورت مند بھی تھے۔ اُن سے چند معمولی سکّوں کے عوض میں اشعار حاصل ہو سکتے تھے۔ اِس میں شک نہیں کہ اُن کے بعض ہندو شاگردوں نے اُنھیں مالی امداد دی جس کا خود مصحفی نے اعتراف کیا ہے۔ لکھنؤ میں وہ زمانہ نواب آصف الدولہ کا تھا جس کے لیے اِس حد تک مبالغہ کیا گیا ہے کہ ''جسے نہ دے مولا اُسے دے آصف الدولہ''۔ مگر مصحفی کو نہ دینے میں مولا اور آصف الدولہ دونوں ہی برابر تھے:

اے مصحفی مت کر ہوس مجلس آصف　　معلوم نہیں ہے تجھے دربار کا انداز

"دربار کا انداز" کیا تھا اِس کے لیے ہم عصر تاریخوں کی ورق گردانی کرنی ہوگی۔ آصف الدولہ کی مجلس میں مسخرے، پھکڑ باز، فحش گو، کھلنڈرے، اوباش زیادہ بار پاتے تھے۔ مصحفی اپنے مزاج کے اعتبار سے سیدھے سادے قصباتی مزاج کے اور کچھ شرم وحیا کے مشرقی انداز رکھنے والے سنجیدہ انسان تھے۔

اوروں نے آکے یاں زر وافر کیے حصول ہم بیٹھے گھر میں کاٹتے ہیں مفلسی ہنوز

دلی کی ایسی خرابی اور ویرانی کے باوجود وہ لکھنؤ میں بھی اُسی کے برہے گاتے رہے۔ کبھی اُنھیں چاندنی چوک دلی میں نیل کے کٹرے کی یاد آتی ہے:

ہے نیل کا کٹرہ بھی کوئی طرفہ مرقع نکلے ہے سدا جس سے پری زاد کا عالم

کبھی اُن کے خیالات سعد اللہ خاں کی نہر کے ساتھ بہہ نکلتے ہیں:

فراق دہلی میں روتا ہوں میں جب یاد آتا ہے وہ پھرنا آبجو کا اور وہ عالم ہزارے کا

کبھی وہ صبح ہی صبح جمنا کی سیر کو نکل جاتے تھے اور وہاں اپنی آنکھوں کو اشنان کراتے تھے:

وہ رعشہ مہ میں کہاں ہے جو میں نے جمنا میں ادائیں دیکھی ہیں کافر کے تھرتھرانے کی

کبھی دلی کے حسینوں کو یاد کر کے ریشہ خطمی ہوئے جاتے ہیں:

خورشید جھانکتا ہے دلی کی مہ جبیناں جس دم نقابیں اپنے رخ سے اُلٹتیاں ہیں
نازک نہال جتنے ہیں دلی کے قہر ہیں یعنی قدم قدم پہ خم و چم بہت ہے یاں
لیلائے عرب ہے تو، آشوبِ ملاحت ہے دلی کے پری پیکر سارے ترے مجنوں ہیں

کبھی دلی کے میلے ٹھیلے یاد کرتے ہیں:

قطب صاحب کی اب کے چھڑیوں میں اُمنڈ آئی ہے جو سبھی میوات
چھاتیاں دیکھ سادہ وضعوں کی دلی کے نوجواں ملیں ہیں ہاتھ
یادِ دہلی سے تو دل اپنا بھرا آتا ہے ہائے وہ شیریں وہ طفلانِ پری زاد کہاں

آیا مشرق کو تو مغرب سے، اب آگے آگے دیکھوں لے جاوے مجھے طالع ناساز کہاں

پورب میں آئے چھوڑ کے دلی سے شہر کو اے مصحفی لے آئی ہے قسمت کدھر ہمیں

دلی سے ہم جو نکلے تو آوارہ ہوگئے صورت نہ دیکھی پھر کے اُس اُجڑے دیار کی

اے مصحفی مت پوچھ کہ دلی سے نکل کر کیا کہیے کہ ہم کتنے پشیمان ہوئے ہیں

مصحفی دلی سے نکلے پر گیا سب دل کا چین تھے جو اوراق اپنی جمعیت کے سب برہم ہوئے

دلی کی قدر دلی سے نکلے پہ ہوئی ہمیں غربت میں یاد آئے ہے، سچ ہے وطن کا حظ

مصحفی کی شعر گوئی کا آغاز یقیناً امروہے میں ہو چکا تھا۔ ٹانڈے سے نکلنے کے بعد وہ بارہ سال دہلی میں رہے۔ یہاں اُن کا پہلا دیوان مرتب ہو چکا تھا مگر وہ چوری ہوگیا۔

اے مصحفی شاعر نہیں پورب میں ہوا میں دلی میں بھی چوری مرا دیوان گیا تھا

اب جو دیوان اول ہے اُس کا کچھ حصہ ممکن ہے دہلی میں تیار ہو چکا ہو مگر اُس کی تکمیل لکھنؤ میں ہوئی۔ اُن کی عمر کے 22-20 برس امروہے میں، 13-12 برس دلی میں اور 42 سال لکھنؤ میں بسر ہوئے مگر اُنھوں نے سب سے زیادہ اشعار دلی ہی کی تعریف میں لکھے ہیں۔

پروفیسر نثار احمد فاروقی

الف

1

کاشکے پڑتے ہوں تیرے جس زمیں پر نقشِ پا
کر کے ٹکڑے جسم کے میرے وہاں دیویں بچھا

طرح نرگس کی جھکی پڑتی ہیں ہر دم بر زمیں
بسکہ اُن آنکھوں سے اُٹھ سکتا نہیں بارِ حیا

دیکھیے کس طرح سے آپس میں یہ صحبت بنے
ہم ہیں کافر عشق کے، اور عشق کافر ماجرا

کاشکے ٹک رہبری کر ہم کو لے جاوے کوئی
بیچتے ہوں جس نگر میں دردِ حرماں کی دوا

عشق کی وادی میں رکھا تو قدم ہم نے و لے
ہر قدم پر ہم کو واں آئی نظر اک کربلا

کس عروسِ جلوہ کا گلشن میں اُترا آ کے مہد[1]
دم بہ دم بٹنے[2] کی بو دیتی ہے جو بادِ صبا

جلد تو نے منہ دکھایا مجھ کو قاصد آن کر
اور تو میں کیا کہوں صد آفریں، اے مرحبا

ناقۂ لیلیٰ کے پھرتا ہے بگولا سا جو گرد
خاکِ مجنوں ہے کہ وہ ہوتی ہے صدقے جا بہ جا

اس سے بہتر مصحفی مطلع نہ تھا عاشق فریب
ہے یہ میرا ریختہ دیوانِ چارم کی بنا[3]

2

مشکیں بخورِ[4] گل سے ہے دامن نسیم کا
موجِ ہوا کے ساتھ ہے بُکّا[5] شمیم کا

قیمت میں لعل پارۂ دل کی مرے ہنوز
عینک طلب ہے باصرہ ہر اک مقیم کا

1۔ مہد = پالکی، پالنا 2۔ بٹنا = اوبٹن 3۔ بِنا (بہ کسرِ اول) بنیاد 4۔ بخور (بروزن فتور) = دھونی
5۔ بُکّا = (بُقعہ کی اردو شکل) خوشبو کی لپٹ

طالع نہ ہوں تو پائے کہاں آدمی فروغ
ہے خوبیِ سہیل[1] سے رنگ اس ادیم[2] کا

ادراکِ کُنہِ[3] جزوی و کلی میں اُس کی ہے
قابل[4] بہ عجز، مُدرِکہ[5] ہر اک حکیم[6] کا

آتش سے عشق کی جو پڑا دل میں آبلہ
وہ آبلہ بنا یدِ بیضا کلیم کا

کیا جانتا ہے لذتِ داغِ فراقِ دوست
جس نے چکھا نہ ذائقہ نارِ جحیم کا

سرتاجِ افصحاں میں نہ ہوں کیوں کے مصحفی
سایہ ہے میرے سر پہ محمدؐ کی میم کا

3

رکھا جنوں نے مرے سر پہ تاج شاہی کا
دیا خطاب مجھے گل نے کج کُلاہی کا

بیاں حقیقتِ گیتی میں کیا کروں یارو
کسی کو صدمہ نہ پہنچے مری تباہی کا

نہ جا تو سیر کو لالے کی، جی دھڑکتا ہے
کہ پیرہن ہے ترے بر میں سرخ لاہی کا

اگرچہ نشترِ مژگاں بھی تیز ہیں لیکن
چبھے ہے دل میں یہ انداز کج نگاہی کا

نہ نکلے کیوں کے تری چشمِ سرمہ سا سے نگاہ
وقار ہند میں کم تر ہے اب سپاہی کا

بہ ساحلِ افق آئی نہ زورقِ[7] خورشید
شبِ فراق بھی دریا ہے اک سیاہی کا

پھرے ہے خاک میں رلتا ہوا یہ لاشہ مرا
ہر استخواں کو ہے اب حکم ریگ ماہی[8] کا

نسیمِ صبح سے کاہے کو ہم بگاڑیں کہ وہ
بھرے ہے دم تری زلفوں کی خیرخواہی کا

لکھا ہے خط نے ترے میرے خوں کا وہ محضر
نشان جس پہ نہیں مُہر اور گواہی کا

کوئی جہان میں ایسا بشر نہیں ہرگز
کہ مرتکب نہ ہوا ہووے وہ مناہی[9] کا

نہ زاہدوں کی تقاوت[10] پہ مصحفی جانا
گناہ اُن پہ بھی ثابت ہے بے گناہی کا

1۔ سہیل ایک ستارہ 2۔ ادیم= چمڑا 3۔ کُنہ= حقیقت 4۔ قابل= قبول کرنے والا 5۔ مُدرِکہ= سمجھ، فہم 6۔ حکیم= فلسفی 7۔ زَورق= کشتی 8۔ ریگ ماہی= سقنقور جسے فارسی میں سوسمار اور انگریزی میں Skink کہتے ہیں۔ دوا میں بھی استعمال ہوتی ہے۔ 9۔ مناہی= وہ کام جو ممنوع ہیں۔

10۔ تقاوت بمعنی تقویٰ پرہیزگاری استعمال کیا ہے مگر عربی قاعدے سے یہ درست نہیں۔

4

شب کہ سرگرمِ تماشا یہ دلِ صد پارہ تھا / ہر سرشک آنکھوں میں میری دیدۂ نظارہ تھا

گرد اس کوچے کے ساری رات دل پھرتا رہا / بدگمانی سے کہ خود جاسوس و خود ہرکارہ تھا

چاہتا تھا اُس کا دل، گر میرے ہوتے غیر کو / میں تو عاشق تھا، ولے اس میں مرا کیا چارہ تھا

مہر نے فوجِ شبِ ہجراں کو جب دی تھی شکست / صبح گاہی نعرہ میرا فتح کا نقارہ تھا

اپنی جانب سے تو الفت میں کمی ہم نے نہ کی / گو ترے پہلو میں دل مانندِ سنگِ خارہ[1] تھا

دیکھ کر اس کو میں کیا کیا لے گیا دل میں خیال / دوشِ دہقاں پر جو گل مہندی کا کل پشتارہ تھا

گل کے پتے یوں چباتا تھا سحر مرغِ چمن / تو کہے بلبل نہ تھی وہ مرغِ آتش خوارہ[2] تھا

رات نشتر کاریِ مژگانِ چشمِ یار سے / ہر سرِ موئے تن اپنا خون کا فوّارہ تھا

آفتابِ اوجِ خوبیِ لالۂ گلزارِ حسن / کون تھا، یعنی وہ میرا آتشیں رخسارہ تھا

دن پھرے اُس کے کہ پھر دلی میں آیا مصحفی
ایک مدت کا یہ اپنے شہر سے آوارہ تھا

5

دامن ہے مرے ہاتھ میں نت ہجر کی شب کا / اتنا تو میں مشتاق نہیں روزِ طرب کا

کچھ جی میں ٹھہرتی نہیں جز جرمِ محبت / ہر چند ہوں جویا تری رنجش کے سبب کا

افسوس کہ کرتا نہیں آرام لحد میں / تا روزِ جزا کشتہ تری جنبشِ لب کا

ہرگز نہ کھلی آنکھ تری خواب سے، غافل! / اور قافلۂ صبح سفر کر گیا کب کا

یاں کانٹوں پہ لوٹوں ہوں میں بے تابی کے مارے / واں ہے ترے پہلو کے تلے فرش قصب[3] کا

افسوس کہ دی بادۂ سر جوش عدو کو / ساقی نے خمِ مے کا ابھی توڑ کے بھپکا[4]

1۔ فارسی میں خارا (الف سے) ہے Granite کو کہتے ہیں، مصحفی نے ہائے ہوز کے ساتھ غلط استعمال کیا ہے۔ 2۔ مرغ آتش خوار = ایک فرضی پرندہ جو آگ کھاتا ہے۔ 3۔ سونے چاندی کے تاروں سے گوندھا ہوا 4۔ بھپکا = مُہر، Seal

اس کشتے کے صدقے میں کہ ہنگام تپیدن　　جس نے نہ دیا ہاتھ سے دامان ادب کا
ہرچند کہ ہم لطفِ قدیمی کے گرو ہیں　　اندیشہ ہے اس پر ہمیں سلطاں کے غضب کا
اے مصحفی کیا کام تشخص سے ہے اُس کو
جو رند کہ وابستہ نہیں نام و نسب کا

6

غم اس کا کچھ نہیں گر مجھ سے آشیاں چھوٹا　　غم اس کا ہے کہ بہاراں میں گلستاں چھوٹا
قضا نے لا تو ملایا تھا اس سے لیلیٰ کو　　یہ ناقہ ہاتھ سے مجنوں کے رایگاں چھوٹا
شبِ فراق یہ حالت رہی کہ صبح تلک　　نہ گالیوں سے زمیں اور نہ آسماں چھوٹا
نہاں ہے دل میں مرے خار خارِ عشق ہنوز　　ابھی تو قیدِ محبت سے میں کہاں چھوٹا
بھلا وہ بچنے کی صورت تھی کون سی کہ مدام　　اُدھر سے تیر جو چھوٹا تو بے گماں چھوٹا
اسیر جتنے تھے آزاد ہوگئے، صیاد!　　قفس سے ایک نہ یہ مرغِ ناتواں چھوٹا
شبِ فراق رہا میں بھی برجِ عقرب میں　　زبسکہ ماہ نہ عقرب سے اک زماں چھوٹا
ہُما کی کیا میں ضیافت کروں کہ سگ سے ترے　　مرا تو ایک بھی جھوٹا نہ اُستخواں چھوٹا
کہیں جو شب مرے دھوکے میں وہ گیا پکڑا　　تو لال خاں[1] سے سحر تک نہ پاسباں چھوٹا
تڑپ تڑپ کے جو میں جان دی تو اس نے کہا　　''بڑے عذاب سے یہ صیدِ نیم جاں چھوٹا''
کبھی کبھی گزر اپنا تھا جس مکان کے بیچ　　ہزار حیف کہ یوں ہم سے وہ مکاں چھوٹا
خیالِ مرغِ دل اب مت کرو کہ یہ وحشی　　کسی کی قید میں آتا نہیں، جہاں چھوٹا
جہاں سے کام ہے کیا مصحفی کو اے پیارے
ترے بچھڑتے ہی بس اُس سے سب جہاں چھوٹا

7

وصل کا کس کے یہ پیغام مجھے آیا تھا　　جس کے سننے سے ٹک آرام مجھے آیا تھا

1۔ لال خاں = بڑا لکڑی کا تختہ جو درمیان سے چرا ہوا ہوتا تھا اُس میں مجرم کو سزا دینے کے لیے جکڑ دیتے تھے۔ یہ کسی لال خاں کا ایجاد تھا اُسی کے نام سے مشہور ہوگیا۔

جی ہی جی میں اسے پڑھ کر میں ہوا شاد کہ رات
نامہ پیچیدہ بہ دشنام مجھے آیا تھا

بول اُٹھتا نہ میں اُس کی سی تو دل کے ہاتھوں
کیا کہوں مفت میں الزام مجھے آیا تھا

میں کہاں اور کہاں عشقِ بتاں، روزے چند
کرنے ناحق کو یہ بدنام مجھے آیا تھا

پھر وہ بے تابیِ دل یاد دلائی گل نے
اک ذرا صبر تہِ دام مجھے آیا تھا

مصحفی باغ میں کل قد کشیِ سرو کو دیکھ
یاد وہ سروِ گل اندام مجھے آیا تھا

8

بہار آئی ہوا صیاد کو سودا اسیروں کا
خدا حافظ ہے یارو اِن دِنوں میں ہم صفیروں کا

پکارے ہے پڑی ہر اک لبِ سوفار کی سرخی
لہو پینا چھپے کیوں کر ترے ترکش کے تیروں کا

جو عزت مردِ دانا کی بیش از بیش کرتے تھے
فسانہ رہ گیا ان بادشاہوں اور امیروں کا

گزرتی ہے جو اس شدت سے با تنگی معاش ان کی
خدا ہی گوشہ گیری میں ہے شاہد گوشہ گیروں کا

دنائت پیشہ ہم کو ٹال دو بیڑوں[1] پہ، کہتا ہے
ہوا نقصان ناحق آج دو پیسوں کے بیڑوں کا

بدو نیک اپنا ہر صورت ہم اس میں دیکھ لیتے ہیں
کہ دل ہے صاف آئینہ سا ہم روشن ضمیروں کا

کبھی تو سیر کر آ تو بھی اپنے بے نواؤں کی
کہ اک دن دید کے قابل ہے یہ میلہ فقیروں کا

ذرا اے مصحفی ان لکھنؤ والوں سے بچتا رہ
کہ تو ہے بے شر اور یاں دَور ہے ناداں شریروں کا

9

شب جو پہلو میں تپاں یہ دلِ شیدائی تھا
کچھ غمِ ہجر، کچھ اندیشۂ تنہائی تھا

میں کہاں اور تو کہاں، لیک تصور میں ترے
اتنا جانوں ہوں کہ تاراجِ شکیبائی تھا

کیا بلا ٹوٹ پڑی مجھ پہ شبِ وصل کی صبح
رات بھر تو مجھے مقدور شکیبائی تھا

میں جو سرگوشی میں کچھ یار سے کہہ کر بھاگا
ہنس کے بولا کہ عجب یہ کوئی سودائی تھا

1۔ بیڑے (بروزن ہیرے) = پان، مصحفی نے یہ قافیہ بے میل استعمال کرلیا ہے۔

اس کے کوچے میں اشارات سے اور چشمک سے　آہ جو تھا وہ مرے درپۓ رسوائی تھا
باغ میں دیکھ کے پیارے تری مہندی کی بہار　گلِ رعنا بھی ترا کشتۂ رعنائی تھا
یاں فرشتے[1] نظر آتے تھے مجھے ہجر کی شب　اور وہ واں آئینے میں محوِ خود آرائی تھا
کیا ہوا، تیری کسی گل سے مگر آنکھ لڑی　چمپئی رنگ ترا اتنا نہ صفرائی[2] تھا
تیر باراں مجھے کرتی تھیں نگاہیں تیری　اور عالم ترے کوچے میں تماشائی تھا
الفتِ شہر کی بو نکلے تھی دل میں اس کے　قیسِ صحرا زدہ ہر چند کہ صحرائی تھا

مصحفی کے تئیں اے چرخ، نہ جان اتنا ذلیل
کبھی یہ بھی کسی دربار کا مجرائی تھا

10

میں گل کے ہاتھ میں اپنا جو کل سوال دیا　صبا نے باغ سے جل کر مجھے نکال دیا
اسی سبب تجھے کرتے ہیں سیکڑوں مجرا　کہ چرخ نے لبِ[3] ناں تجھ کو اے ہلال دیا
گیا جو مجرے کو اس کے میں وقتِ صحبتِ غیر　سمجھ کے دور سے درباں نے مجھ کو ٹال دیا
لیا میں بوسہ، شب اُس کے ہلالِ غبغب کا　خدا نے مجھ کو عجب ساغرِ ہلال دیا
وہ دن ہیں یاد جو تو، نۓ سوار ہونے لگا　ہمیں نے پیچھے سے دامن ترا سنبھال دیا
علاجِ تشنگیِ سینہ کس طرح ہوتا　قدح نہ بھر کے کبھی تو نے اے ہلال دیا
عبیر مل کے مرے منھ سے جب وہ شاد ہوا　مرے بھی ہاتھ میں تھوڑا سا پھر گلال دیا
ہوا جو پرگنۂ دل پہ نصب عاملِ عشق　شبِ فراق کا بس ہم کو اک محال[4] دیا
خیالِ ناف سے ہوتی نہیں رہائی ہائے　عجب طرح کے بھنور میں خدا نے ڈال دیا

سخن کا ہم کو ملا مصحفی خزانۂ غیب
فلک نے اوروں کو جس روز ملک و مال دیا

1۔ موت کے فرشتے　2۔ صفرائی = پیلا (یہ بھی مصحفی نے خلاف قاعدہ استعمال کیا ہے)
3۔ لبِ ناں = روٹی کا ٹکڑا　4۔ محال = زمین کا ایک حصہ، علاقہ

11

ناقے کے پیچھے کل جو وہ اک گرد باد تھا
مجنوں کہیں ہیں جس کو وہی نامُراد تھا

شاید کل اُس کے دل کی پھری تھی ادھر کہ شب
کچھ آپ ہی آپ دل مرا سینے میں شاد تھا

ہم لا کے جنسِ دل کے تئیں پھیر لے گئے
بازار روزگار میں از بس کساد[1] تھا

کھانا پڑا ہمیں غمِ معشوق و یار بھی
ہر چند جانتے تھے یہ غم مستزاد تھا

آخر وہ بت ہی تشنۂ خوں ہوگیا مرا
جس کا ہر ایک مطلعِ رنگیں پہ صاد تھا

سورج کی آج بھی رہی اُودھر کو چشمِ شوق
کل کا وہ تیرا بام پہ آنا جو یاد تھا

حیراں ہوں میں کہ اس سے کیا تو نے کیا سلوک
بے ہوش، مصحفی تو ترا خانہ زاد تھا

12

قصہ باہم پاٹو کی مہندی کے اوپر ہووے گا
خوں کسی کا اُس کی مجلس میں مقرر ہووے گا

آئینہ مت اس کو دکھلاؤ کہ ہے ہنگام خط
دیکھ کر وہ اپنی صورت کو مکدر ہووے گا

ذکر جب سروِ سہی کا لے چلیں ہیں ہم تو وہ
ہنس کے کہتا ہے مرے قد کے برابر ہووے گا؟

ہے خللِ اندازِ صحبت میرے اور اس کے، رقیب
تب کٹے گی گند[2] جب یہ گھر سے باہر ہووے گا

جب وہ ہرجائی پٹے پر اپنے باندھے گا کمر
میری رسوائی کا چرچا کیوں نہ گھر گھر ہووے گا

اس ادا سے سر کے بالوں کو پریشاں مت کرو
دیکھو کہتا ہوں کسی کا حال ابتر ہووے گا

کل تو ہم تھے موردِ دشنام ہائے لاتُعَد[3]
آج دیکھیں تو انھوں کا طیش کس پر ہووے گا

ہم شبِ ہجراں کا کہتے تم سے سارا ماجرا
لیک پھر کیا فائدہ، کب تم کو باور ہووے گا

جاں نثاروں کا ہے اب مجلس میں اس کی کام کیا
آئیں گے اس وقت یہ جب طشت و خنجر ہووے گا

کب تلک یارب جئیں جھوٹا تصور باندھ باندھ
دیکھنا اُس کا کسی صورت میسر ہووے گا؟

کر کے وعدے مہربانی کے سراسر بھول گئے
آفریں، تم سے یہی تو بندہ پرور ہووے گا

1- کساد = ارزانی، مندہ 2- گند کٹنا = دلدّر دور ہونا 3- لاتُعَد = بے شمار

ہر کبوتر کا نہیں مقدور جو واں جاسکے نامہ بر میرا کوئی دانا کبوتر ہووے گا
دن بہت ہو جاتے ہیں تو مجھ تلک آتا نہیں جانتا ہے یہ کہ واں شکووں کا دفتر ہووے گا
روزِ محشر جب اُٹھیں گے مصحفی ہم گریہ ناک
ہر بنِ مو پر ہمارے دیدۂ تر ہووے گا

13

اگر یہی دلِ پُر اضطراب ہووے گا تو مجھ پہ روز نیا اک عذاب ہووے گا
مریضِ غم کا ترے آج دم نکلتا ہے خدا کے واسطے ہو جا، ثواب ہووے گا
خیالِ زلف ترا ساتھ لے گئے تو میاں لحد میں بھی ہمیں اک پیچ و تاب ہووے گا
کبھی وہ رات بھی آوے گی، اے خدائے کریم کہ میرے ہاتھ میں اُس کا نقاب ہووے گا
یہی ہے گریے کا پھیلاؤ اپنے تو یارو! تمام روے زمیں سطحِ آب ہووے گا
جو نیم روز رُخ اُس کے سے اُٹھ گیا پردہ تو استوا[1] میں غروب آفتاب ہووے گا
نہ سوئے چین سے اک شب یہ سرنوشت میں تھا کہ ہم نہ ہوں گے تب آرام و خواب ہووے گا
نہ جا تو مصحفی اُس حیلہ جو کی باتوں پر
قسم خدا کی، دوانے، خراب ہووے گا

14

مہندی سے جن دنوں کہ کچھ اپنا لگاؤ تھا اُس کو بھی میرے خوں میں ملانے کا چاؤ تھا
ہم چہرہ نوچتے تھے وہ رکھتے تھے رخ پہ خال یاں یہ بگاڑ تھا تو وہاں وہ بناؤ تھا
نیرنگیِ فلک کو جو کرتا تھا میں رقم نامہ تمام کاغذِ ابری[2] کا تاؤ تھا
ہم گرمیِ سمور[3] سے واقف ہیں کیا کہ یاں جاڑے کی راتیں اور وہی اپنا الاؤ تھا

1۔ استوا = نصف النہار 2- کاغذ ابری میں ہلکے سُرمئی اور سفید دھبّے ہوتے تھے۔ تاؤ سے مراد کاغذ کا ایک شیٹ۔ 3- سمور جسے انگریزی میں Fur کہتے ہیں۔

نامرد تھے زبسکہ امیر اس زمانے کے — سُفرے[1] پہ ان کی دیکھا تو خصّی پلاؤ تھا
نت اہلِ جاہ رکھتے رہے فربہوں کو دوست — از بسکہ اِن خروں کے تئیں شوقِ گاؤ تھا
جاوے گا بیٹھ جب کبھی یہ گنبد فلک — ہم تم سے تب کہیں گے کہ دیکھو لداؤ[2] تھا
کچھ یہ نچوڑ دل پہ پڑا تھا کہ ساری رات — پلکوں کی سمت خونِ جگر کا کھنچاؤ تھا
اب ایک قطرہ اشک کو ترسیں ہیں رات دن — جن آنکھوں سے کہ خونِ جگر کا بہاؤ تھا
مژگاں کی کس کی یاد تھی یا رب کہ تا سحر — کل ساری رات دل میں مرے کاؤ کاؤ[3] تھا
جوں جوں دوائیں کیں وہ ہوا اور بھی زیاد — تیغِ نگہ کا کس کی مرے دل میں گھاؤ تھا

کل کی اندھیری رات میں چوکا تُو مصحفی
لے کر کمند کوٹھے پہ چڑھنے کا داؤ تھا

15

شبِ ہجراں میں مرے دل پہ جو سودا گزرا — دلِ شب[4] یار کے کوچے سے میں روتا گزرا
خضر ہوتا تو نہ پڑتا قدم اس کا بھی وہاں — جس گلی سے کہ شبِ تیرہ، میں تنہا گزرا
آبِ شمشیر تری جس کے گلے تک آئی — اُس نے جانا کہ مرے سر سے یہ دریا گزرا
شبِ ہجراں میں ہوا سے بھی ہلا در جو کبھی — آمدِ مرگ کا دل میں وہیں کھٹکا گزرا
شعر یوں اس پہ کہے ہم نے ہزاروں لیکن — ایک شب دل میں نہ مضمونِ تمنا گزرا

میر و مرزا کے جو طالع نہ ملے ہم کو تو کیا
مصحفی اپنا زمانہ بھی پر اچھا گزرا

16

ہر روز ہمیں گھر سے صحرا کو نکل جانا — کھیتوں کا مزہ لینا، جنگل کو نکل جانا
جی کیوں نہ بھلا اُن کی پھر بھوں پہ لگے اپنا — اک وسعتِ مشرب کے ہے ساتھ یہ ویرانا

1۔ سُفرہ = دسترخوان 2- لداؤ = بھاری بوجھ 3- کاؤ کاؤ = چبھن، بے چینی
4- دلِ شب = آدھی رات

سطح پہ زمیں کی ہے تا مدِّ نظر سبزہ کیا سیر کا عالم ہے، اپنا ہے نہ بیگانا
ہم عشقِ حقیقی کے یہ رنگ سمجھتے ہیں نے لیلیٰ نہ مجنوں ہے نے شمع نہ پروانا
جس حسن کے جلوے ہیں عارف کی نگاہوں میں وہ حسن بناوے ہے کعبے کو صنم خانا
دیوانۂ شہری تُو، دیوار کا سایہ لے سایے میں مغیلاں کے بیٹھے گا یہ دیوانا
غربت کے بیاباں میں ہے مصحفی آوارہ
اے خضرِ خجستہ پے ٹک راہ تو بتلانا

17

دستِ قاصد سے خط اس بت نے جو لے کر کھولا اُس نے واں اپنی ہی تقریب کا دفتر کھولا
فکرِ کیں[1] میں وہ رہا میری یہاں تک کہ کبھو کمر اپنی سے نہ اک رات بھی خنجر کھولا
لب بہ دشنام تو آلودہ نہ کرتا سچ ہے ایک بوسے نے ترا حقۂ گوہر[2] کھولا
اشک لوٹن کی طرح تا مژہ لڑھتا ہی گیا کعبک دل سے یہ میں طرفہ کبوتر کھولا
دودِ دل، تیرے نکلنے کے لیے، لے بھائی ہر بنِ مو سے میں اک روزنِ مجمر[3] کھولا
کوچۂ فقر بھی ہے طرفہ مسافر خانہ آیا جو، اُس نے یہاں آتے ہی بستر کھولا
ماہ کی آنکھ جو رہتی ہے لگی اودھر ہی اُس نے پھر روزنِ نظارہ مقرر کھولا
مصحفی ماہ ہے کیا اور ہیں ستارے کیسے
صانعِ چرخ نے یہ بھید نہ ہم پر کھولا

18

ملنے کا تم کو وعدہ ہر صبح و شام کرنا یعنی اس آرزو میں ہم کو تمام کرنا
آیا ہوں میں اُدھر سے کوچے گلی میں ہوکر تم بھی گزر ادھر سے بالائے بام کرنا
پامال دل ہے کس کا، ٹھوکر لگی ہے کس کو اتنا تو دھیان، پیارے، وقتِ خرام کرنا

1- کیں = کینہ 2- حقۂ گوہر = موتیوں کا ڈبہ 3- مجمر (بروزن مسطر) انگیٹھی

سجدے میں قتل میرا منظور گر نہیں تو کیوں غیر کو کہے ہے "اس کو امام کرنا"

یاروں کا قافلہ تو سب کوچ کر چلا ہے کیا فائدہ رکھے ہے پھر یاں مقام کرنا

گر مصحفی وہ تم سے ملتا نہیں ہے صاحب ق تو تم کو میں بتاؤں تم ایک کام کرنا

یعنی کہ اُس کے در سے دیکھو جسے نکلتا ہنگام صبح اُس کو جھک کر سلام کرنا

پوچھے جو وہ تو کہیو "آیا ہوں نوکری کو" اس ڈھب سے اور بھی کچھ کلمہ کلام کرنا

یک چند اُس گلی میں آ، اب روز کی طرح یوں ہی گزر ہمیشہ ہر صبح و شام کرنا

گر مل چلا وہ تم سے تو بات بن رہے گی
ورنہ اُس آستاں کو اک دن سلام کرنا

19

دیکھتا چشم کو یا زلف سے سودا کرتا فرصتِ کم پہ بھلا یاں کوئی کیا کیا کرتا

تھی لڑی آنکھ مری تیرے سراپا سے صنم کس طرح تجھ سے سوا تیری تمنا کرتا

تیری تلوار کا پاتا جو ترا کشتہ مزہ بعد ازیں زندگیِ خضر تمنا کرتا

پردہ داری میں تری نبھ گئی، تھا لطف تو جب کہ میں سودائی ہو تجھ پر، تجھے رسوا کرتا

اتنی فرصت نہ ملی دستِ فلک سے ورنہ اپنے دیوان کو میں آپ محشاؔ[1] کرتا

ہوں بد آموز میں شوریدہ سروں کا ورنہ خواہشِ سبزہ نہ میلِ لب دریا کرتا

گر تصور بھی ترا بہرِ تسلی آتا یوں میں راتوں کو ترے واسطے رویا کرتا

جی تو چاہے تھا مرا یوں کہ شبِ وصل میں میں ق بوسے لیتا ترے تا صبح، تو سویا کرتا

سو میسر نہ ہوئی آج تلک تو وہ شب گریہ کرتا نہ بھلا اور تو پھر کیا کرتا

عشق میں ہوتی نہ رسوائی نصیب اس کے تئیں
مصحفی حوصلۂ ضبط جو پیدا کرتا

1- محشّیٰ = جس پر حاشیے لکھے گئے ہوں

20

خط کے آتے ہی ورق خوبی کا برہم ہوگیا
عالمِ تصویر کا کچھ اور عالم ہوگیا

سن کے بیمارِ محبت کی ترے حالت تباہ
شب مسیحا اس قدر رویا کہ بے دم ہوگیا

وقت غصّے کے عرق آیا جو روے یار پر
کھیت سا پھولوں کا اک تاراجِ شبنم ہوگیا

ہم تمنا ہی میں اُس کی سینہ مالی کی رہے
اور وہاں چھٹتے ہی دستِ غیر محرم ہوگیا

ہوکے جو آیا سیہ پوش ایک شب وہ رشکِ ماہ
ہم پہ ماہِ عید بس ماہِ محرم ہوگیا

خوش نصیب اُس کے کہ جس کے زخم پر جرّاح نے
سُودۂ الماس بھی چھڑکا تو مرہم ہوگیا

میری اِس بے عزّتی پر بھی ہے عزت اس قدر
جس نے دیکھا مجھ کو مثلِ ماہِ نو خم ہوگیا

اپنی ہم ہنگامہ آرائی کی باتیں کیا کریں
دن بھی وہ جاتے رہے، وہ شوق بھی کم ہوگیا

کچھ تجھے روزِ قیامت کا بھی غم ہے یا نہیں
مصحفی یاں آکے تو ایسا ہی بے غم ہوگیا

21

دل جس کے رُوے خوب کا خواہاں رہا سدا
وہ ماہ ابرِ شرم میں پنہاں رہا سدا

بوسہ کب اس نے مجھ کو دیا روے لطف سے
غصّے سے اُس کا لب تہِ دنداں رہا سدا

حیرت سے تیرے سامنے نکلا نہ ایک دن
یوسف کا ہاتھ زیرِ زنخداں رہا سدا

زیر و زبر قلق سے دل اپنا ہوا کیا
سینے میں جوشِ اشک کا طوفاں رہا سدا

ممنون اس کے گوشۂ دامن کا کب ہوا
دستِ جنوں کہ وقفِ گریباں رہا سدا

اک شب بھی کامِ دل کو نہ پہنچا میں یا نصیب
اس ربط پر وہ مجھ سے گریزاں رہا سدا

سینے میں چین ہی نہ پڑا اِس کو مصحفی
یہ دل فراقِ یار سے نالاں رہا سدا

22

جنوں نے لا کے بیاباں میں مجھ کو چھوڑ دیا
برہنہ پائے مغیلاں میں مجھ کو چھوڑ دیا

کچھ اور چھور نہیں جس کا، تو نے اے وحشت
عجب طرح کے بیاباں میں مجھ کو چھوڑ دیا

جو کشتنی تھے کیے قتل، اور قاتل نے
ضعیف جان کے زنداں میں مجھ کو چھوڑ دیا

قریبِ مرگ تو تھا میں، مجھے یہ حیرت ہے
اجل نے کیوں شبِ ہجراں میں مجھ کو چھوڑ دیا

بغیرِ خضر کرے میری دستگیری کون
کہ موجِ گریہ نے طوفاں میں مجھ کو چھوڑ دیا

ہوئی رسائی گر اس تک تو تیرہ بختی نے
سوادِ زلفِ پریشاں میں مجھ کو چھوڑ دیا

فغاں کہ دستِ جنوں خود نکل گیا آگے
بہ رنگِ چاک، گریباں میں مجھ کو چھوڑ دیا

ہنوز اسیر ہوں جوں مرغِ رشتہ برپا میں
کیا میں فرض گلستاں میں مجھ کو چھوڑ دیا

بڑا ستم یہ کیا تو نے مجھ پہ، اے صیاد!
کہ ذبح کر کے گلستاں میں مجھ کو چھوڑ دیا

فلک سے کیونکے رِہا ہوں میں مصحفی حق نے
طلسم خانۂ زنداں میں مجھ کو چھوڑ دیا

23

اب صبر تجھ کو اے دلِ بیتاب آ چکا
ہے یہ قلق تو جان مری، خواب آ چکا

اے موج، کیا نکالیں ہوئی ہم کو تب خبر
جب اپنے گھر کی نیو[1] میں سیلاب آ چکا

اے موجِ گریہ مجھ کو ڈبووے گی کیا کہیں
بس بس، کہ تا گلو تو مرے آب آ چکا

محرابِ تیغِ یار کے آگے جھکا جو سر
وہ سر فرو بہ سجدۂ محراب[2] آ چکا

گر تیرہ روزی اپنی یہ ہے، اے شبِ فراق
تو بس ہمارے بام پہ مہتاب آ چکا

جُوں لعلِ تازہ گرنے لگے پارہ ہائے دل
جب روتے روتے چشم سے خوناب آ چکا

آنسو گرا جو چشم سے، مژگاں نے یوں کہا
ہاتھ اپنے اب یہ گوہرِ نایاب آ چکا

1- نیو = بنیاد 2- آ چکا = یعنی نہیں آئے گا (روزمرّہ)

آنے کی کہہ کے وعدے سے اپنے وہ پھر گیا گھر میں مرے جب اُس کا سب اسباب آ چکا
گر ہیں یہ اُس کے پنجۂ رنگیں کی شوخیاں تو شاخ پر یہ لالۂ سیراب آ چکا
میں ہی گیا نہ سوے عدم مجھ کو مصحفیؔ
سو بار واں سے تو خطِ احباب آ چکا

24

ایک تو تھا ہی محبت سے جگر پر صدما پر کہوں کیا، جو ہوا دیدۂ تر پر صدما
حسن بجلی کی طرح کوندے ہے اُس کافر کا جی دھڑکتا ہے نہ آجائے نظر پر صدما
ساتھ تعویذوں کے کم بخت جھکی جاتی ہے بسکہ ہے بوجھ سے ہیکل[1] کے کمر پر صدما
آشیاں بلبلِ شیدا کا جلا جوں بہ چمن یوں نہ آوے کسی دشمن کے بھی گھر پر صدما
لٹ گئے راہِ محبت میں ہم اُس کی اس طرح جیسے آ جائے کسی تازہ سفر پر صدما
راہ اٹھکھیلی سے چلتا ہے، تو کیا جانے ہے کیا گزرتا ہے کسی خاک بہ سر پر صدما
تیری ذلت نہیں کچھ جاے عجب، پڑتا ہے
مصحفی عشق میں ہر ایک بشر پر صدما

25

بے سیر نہیں انجمِ رخشاں کا تماشا راتوں کو دکھاتے ہیں چراغاں کا تماشا
چاہے نہ کبھی سیر کو دریا کی ترا جی دیکھے جو تو اس دیدۂ گریاں کا تماشا
ازبسکہ کہ اسے دھجیاں کر کرکے اُڑایا یاروں کو دکھایا میں گریباں کا تماشا
جلتا تھا ادھر دل تو اُدھر سینہ پھُنکے تھا یاد آئے ہے مجھ کو شبِ ہجراں کا تماشا
کیا عکس سے تیرے یہ پری خانہ بنا ہے ٹک دیکھ تو اس دیدۂ حیراں کا تماشا
میں سینۂ صد داغ کی کرتا ہوں زیارت بلبل کو مبارک ہو گلستاں کا تماشا

1- ہیکل = گلے میں پہننے کا ہار یا تعویذ وغیرہ

کیوں باغ کو جاؤں کہ نظر آئے ہے مجھ کو	ہر زخمِ جگر میں گُلِ خنداں کا تماشا
کس لطف سے باہم یہ اشارات ہیں ان کی	ٹک دیکھ تو تو مجلسِ خوباں کا تماشا
تاروں کے حواس اب تیئیں گم ہیں شبِ مہ میں	دیکھا تھا جو رُخ پر ترے، افشاں کا تماشا
لے جاؤ خزاں میں نہ کوئی مجھ کو کہ مجھ سے	دیکھا نہیں جائے گا گلستاں کا تماشا
اے مصحفی جنگل ہیں ہرے گھر میں نہ رہ یار
چل دیکھ ذرا کوہ و بیاباں کا تماشا

26

کیوں قتل کی خاطر ہی نہ میداں میں بٹھایا	جو بختِ زبوں نے ہمیں زنداں میں بٹھایا
معشوقِ تصور نے مجھے سامنے اپنے	تا صبح دو زانو شبِ ہجراں میں بٹھایا
بد یُمن ہوا قیس پہ مکتب، نہیں معلوم	کس ساعتِ بد اُس کو دبستاں میں بٹھایا
تجھ بن میں کہوں کیا شبِ مہتاب کا جلسہ	گویا مجھے تاریک شبستاں میں بٹھایا
کم بخت ہو مجنوں ہی تو پھر کیا کرے لیلیٰ	ناقہ تو کئی بار مُغیلاں[1] میں بٹھایا
اس تفرقہ پردازیِ الفت کا بُرا ہو	عاشق کے تئیں جس نے کہ حرماں میں بٹھایا
یوسف کو دیے ووں قدمِ آبلہ فرسا	یعقوب کو یوں کلبۂ احزاں میں بٹھایا
آغاز کیا پھر دلِ بد بخت نے رونا	دیوانے کو کیوں ہم نے گلستاں میں بٹھایا
فرہاد صفت گاہ رکھا کوہ میں قایم	مجنوں کی طرح گاہ بیاباں میں بٹھایا
اے مصحفی شکوہ ہے یہ طالع سے کہ اُس نے
اک شب نہ ہمیں مجلسِ خوباں میں بٹھایا

27

دیکھ اُس کو میں نے سب کو بہ یک بار تج دیا	اک آشنا کے واسطے، ہر بار تج دیا
جانا نہ اس نے ترک کیا گھر کا غیر کے	یاں میں نے جس کے واسطے گھر بار تج دیا

1- مُغیلاں = کیکر

مت پھول قتل کر کے مجھے، تا کہے نہ خلق　　صیّاد نے یہ مرغِ گرفتار تج دیا
زنّار زلفِ یار کا آیا جو اس کے ہاتھ　　رہباں نے اپنا رشتۂ زنّار تج دیا
شہرہ یہ تیرے حسن کا، پیارے ہوا کہ بس　　دیوانگاں نے دامنِ کہسار تج دیا
آیا جو دارچینی کی خواہش میں، عاقبت　　دارو فروش نے اُسے ناچار تج دیا
شیریں نے کچھ بھی دیکھ لیا کوہ کن کے پاس؟　　پرویز سا جو اُس نے خریدار تج دیا
صورت کو تیری دیکھ کے، اے بادشاہِ حسن　　یاروں نے بادشاہوں کا دربار تج دیا
کیا لکھنؤ کو چھوڑتے لگتا ہے مصحفی
جب ہم نے دلّی شہر سا گلزار تج دیا

28

بغل میں اُس کی جس شب آ کے تو اے یار سووے گا　　اُسی شب چارپائی پر یہ ماتم دار سووے گا
ہوس ہو سایۂ طوبیٰ کی جس کو، سو رہے جا کر　　یہ دیوانہ تو زیرِ سایۂ دیوار سووے گا
بنالا وَبدھی[1] پھولوں کی چادر، وصل کی شب ہے　　کہ فرشِ گل پہ، اے گل چیں مرا دلدار سووے گا
میں سمجھا تھا کہ تو میری طرف بھی منھ کو پھیرے گا　　نہ سمجھا تھا کہ اک کروٹ ہی، ہو بیزار سووے گا
غنیمت جان بیداری کا عالم، اے زخود غافل　　کہ جب خوابِ اجل آئی تجھے، ناچار سووے گا
ہم آغوشی کا کشتہ ہووے گا تیری جو ہجراں میں　　بغل میں لے کر اپنی وہ تری تلوار سووے گا
سگِ اصحاب کہف اِس سے تو بہتر ہے، معاذ اللہ　　وہ دن ہووے گا جو یہ نفسِ ناہنجار سووے گا
ہمیں لگتا ہے خطرہ مصحفی بدخوابیِ دل سے
توقع زیست کی ہوگی جو یہ بیمار سووے گا

29

شوق میں اپنے مجھے آوارۂ ہر کو کیا　　میں ترے صدقے گیا یہ تو نے کیا جادو کیا

1- بدھی = (یہ تشدید کے ساتھ بدّھی بھی ہے) = پھولوں کی سیج، مالا

یار قابو پر مرے چڑھ کر گیا آخر نِلوہ[1]　اضطرابِ دل نے شب مجھ کو جو بے قابو کیا

منھ پھرا کر وہ لگا اک بار پیچھے دیکھنے　اس کی چوٹی کو تصور میں بھی گر میں بُو[2] کیا

اضطرابِ عشق کو جس نے بنایا زیبِ حسن　پیچ و تابِ دل کو لے، چینِ خمِ ابرو کیا

دیکھ لافِ ناکساں میں کی خموشی اختیار　بیت بحثی کب تلک، قصہ ہی میں یکسو کیا

وصف نے مینوں کے چھلّوں کے ترسائے شاخِ گل　صفحۂ کاغذ کو رشکِ گلشنِ مینو[3] کیا

تب کہیں آیا وہ مہ صندل لگائے بام پر　غم کے مارے جب ہمارا دل جگر لوہو کیا

وہ بتِ نحوی نہ سمجھے اِس کو تا اسمِ ضمیر　اپنے نامے میں رقم میں نے نہ حرفِ 'ہو[4]' کیا

تھا بساط اپنی میں اک تعویذ کوچک[5] سا جو دل　سو اُسے ہم نے بہارِ ساعد و بازو کیا

آستانے سے ترے جس شب رکھا طالع نے دور　سجدہ گاہ اُس شب میں اپنا کاسۂ زانو کیا

ہم تو سمجھے تھے کہ ہے دعوائے فنِ شاعری　مل کے یاروں نے ہمیں کو آخرش نکّو[6] کیا

مصحفی گلخن سے تربت کم نہیں اس شخص کی
خاک کو جس کی جلا کر عشق نے بالو[7] کیا

30

ہوتے ہی تیغِ جفا سے اُس کی بسمل رہ گیا　وائے وہ بسمل کہ پیشِ پائے قاتل رہ گیا

کر گیا جب ناقہ طے منزل، یہ لیلیٰ نے کہا　''وائے قیسِ ناتواں دنبالِ محمل رہ گیا''

وائے نومیدی کہ بیماری ہوئی عائد ہمیں　کعبۂ مقصود جب دو چار منزل رہ گیا

جان، ہم آغوشی میں دی میں نے شب وصل اُسکی ہائے　اور یہ دستِ ہوس وو ہیں حمائل رہ گیا

لے گئی تختہ مری کشتی کا آ کر موجِ تند　ہائے اس تختے سے جب کچھ دور ساحل رہ گیا

1- نِلوہ = ناکام　2- بُو کیا = سونگھا　3- مِینو = جنت، اور زمرّد یا زَبَرجد (قیمتی پتھر)

4- خط یا عبارت کے آغاز میں بسم اللہ کی جگہ صرف ھُو بھی لکھتے تھے جو اللہ کی جانب اشارہ ہے اور عربی میں ھُوَ واحد غائب کی ضمیر بھی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ وہ اِس ھُو کو کسی اور کی طرف اشارہ نہ سمجھے اس لیے میں نہیں لکھتا۔

5- کوچک = چھوٹا　6۔ نکّو کرنا = طعنے دینا، رسوا کرنا　7- بالُو = راکھ، ریت یا خاکستر

جس کو گالی دی سوالِ بوسہ پر اُس شوخ نے دنگ ہو اپنا سا منھ لے کر وہ سائل رہ گیا
اس کو آنے سے ادھر کے، کیا ہوا مانع رقیب جو تڑپ کر رات پہلو میں مرا دل رہ گیا
جب خلافت کا کوئی کرنے لگا مجھ سے بیاں ہو کے میں حیراں میانِ حق و باطل رہ گیا
شعر سے پائی نہ میں نے فرصتِ تحصیلِ علم اِس کے قبضے میں پھنسا ایسا کہ جاہل رہ گیا
مصحفی جس دم کنارہ کر گئی تن سے یہ روح
اُس گھڑی یہ جان لے تو نقشِ باطل رہ گیا

31

وحشت کا گھر جو یہ دلِ دیوانہ بن گیا جنگل کو اُٹھ گیا کبھی سوے چمن گیا
آنکھوں کی مار کھائی یہ اُس کی کہ آخرش روتا ہوا ختن کو غزالِ ختن[1] گیا
رویا جو شب میں یاد میں اُس کی کفک کی خوب تا صبح خون آنکھوں سے بھر بھر لگن گیا
اُس سنگ دل کے دل میں نہ مطلق ہوا اثر نالوں سے میرے گرچہ دلِ کوہ چھن گیا
جب دشتِ پُر خطر میں رہا صرفِ جاں کنی عاشق ترا، اُدھر نہ کبھی کوہ کن گیا
رخت[2] وسلاح یاروں نے بھجوائے بعدِ مرگ تحفہ یہ اُس غریب[3] کا سوے وطن گیا
برگشتگی تو دیکھ نصیبوں کی مصحفی
روٹھا وہ مجھ سے اور مرے دشمن سے من گیا

32

تنہا نہ قیسِ دل شدہ دیوانہ بن گیا یہ عشق وہ ہے جس میں سرِ کوہ کن گیا
اُس شخص کو سراہیے جو اپنے بعدِ مرگ لے کر جوابِ نامہ بہ سوے وطن[4] گیا
جی غش میں آ کے اُس پہ سدا ڈوبتے رہے کس روز تشنہ بر سرِ چاہِ ذقن گیا

1- ختن = اک علاقے کا نام جہاں کے ہرن مشہور ہیں 2- رخت (بروزن بخت) سامان، سلاح = ہتھیار 3- غریب = پردیسی 4- یعنی وطن کو زندہ نہ جا سکا

گریے کا حال پوچھو ہو کیا میرے مثلِ شمع میں روتے روتے اشک کا پُتلا تو بن گیا
پر کس اسیر کا تھا جو اس اضطراب سے اُڑتا ہوا ہَوا میں بہ سوے چمن گیا
مژگاں کے اُس کے تیر ہوائی تو تھے ولے آیا جو مرغِ سِدرہ [1] مقابل وہ چھَن گیا
دل مصحفی کا ہند سے ناخوش ہے دوستو
سن لوگے آج کل وہ سُوے دکن گیا

33

ہے اک تو قہر اُس شکمِ صاف کی ادا تس پر کنویں میں کھینچے ہے دل، ناف کی ادا
مژگاں سے بندھ گیا ہے مرے اشکِ خوں کا تار دیکھی تھی ایک شب تری مُوباف [2] کی ادا
آٹھوں پہر جو سر بہ گریباں رہوں ہوں میں نکلے ہے بیٹھنے میں مرے قاف کی ادا
ہر لحظہ بے ادائی ہے مجھ کم زباں کے ساتھ ان دوستانِ دور از انصاف کی ادا
پہلو میں میرے دل کو شب و روز مصحفی
مسلے ہے اس کے سینۂ شفاف کی ادا

34

رنگ چہرے کا ترے اُٹھتے ہی فَق ہونے لگا تو چلا گھر کو یہاں دل پر قلق ہونے لگا
گرمیِ حسن کی تاثیر سے کچھ آپ ہی آپ پھول سا چہرہ ترا غرقِ عرق ہونے لگا
سطح اُس بادیہ کا، جس پہ گرا تھا مرا خوں ہر سحر رو کشِ دامانِ شفق ہونے لگا
دستکاری سے تری، المدد اے دستِ جنوں سینہ بھی ساتھ گریباں ہی کے شق ہونے لگا
منھ لگانا مجھے موقوف کیا تھا تم نے پھر کئی روز سے بوسے کا سبق ہونے لگا
آنے دیتا نہیں ہم کو بھی تمھارا درباں بارے سرکار میں اتنا تو نسق [3] ہونے لگا

1- سِدرہ = ایک اُسطوری درخت جو عرش پر ہے 2- مُوباف = جس سے چوٹی گوندھتے ہیں
3- نسق (بروزن سبق) = انتظام، بندوبست

مصحفی نالے کیے ایسے قلق سے میں کہ رات
تہ و بالا فلکِ ہفت طبق ہونے لگا

35

گو ہم نے کیا الفتِ خوباں سے کنارا　جب ہاتھ کرے چاکِ گریباں سے کنارا
وارفتگیِ عشق کا عالم ہے جنھوں پر　کر جاتے ہیں وہ شہر و بیاباں سے کنارا
اشکوں کے تلاطم میں گرفتار ہے نت چشم　کشتی مری کرتی نہیں طوفاں سے کنارا
پیکاں جو ترا آئے ہے دل پر ہی لگے ہے　اور اس پہ یہ کرتا نہیں پیکاں سے کنارا
سچ ہے یہ وہ زندانی بڑے رنج سے چھوٹے　جو جی سے گزر، کر گئے زنداں سے کنارا
شاید نظر آیا ہے اُسے دور سے مجنوں　ناقے نے کیا ہے جو مُغیلاں سے کنارا
نظارگیانِ چمنِ حسن کو تیرے　گلشن سے ہے پرہیز، گلستاں سے کنارا
اب گوشہ نشینی کا مزہ مصحفی سمجھا
جو اُس نے کیا صحبتِ یاراں سے کنارا

36

جی خوش نہ کیا تم نے مری جان کسی کا　کھینچا نہ کبھی ہنس کے گریبان کسی کا
اک روز تو مل، دیکھ تو بے درد کہاں تک　آنکھوں پہ رہے گوشۂ دامان کسی کا
سنبل کے حواس اب تئیں درہم ہیں چمن میں　جُوڑا[1] کہیں دیکھا تھا پریشان کسی کا
ہم کشتۂ شمشیرِ تغافل ہیں، نہ ہووے　گردن پہ کسی شخص کی احسان کسی کا
گلیوں میں تو یوں پان چبا کر نہ پھرا کر　خوں مفت میں ہو جائے گا، نادان کسی کا
میں سیکڑوں گل[2] کھائے ہیں تب یار ملا ہے　چھاتی سے لگانا نہیں آسان کسی کا
ہاتھوں سے میں اس دل کے ہوں ناچار الٰہی　گرویدہ نہ ہو اتنا بھی انسان کسی کا

1- جُوڑا (بروزن گھوڑا)= گُندھے بال　2- گُل کھانا = داغ، دکھ جھیلنا

اے مصحفی ہرگز ترے دیوان کے آگے
ہم کو تو خوش آتا نہیں دیوان کسی کا

37

ہر طرف باغ میں پھولا ہے ہزارا گیندا
آ، نا کرنے کو چلیں اُس کا نظارا گیندا

ہے ولا کان میں اُس گل کے جو پکھراج کا گول[1]
دیکھ رہتا ہے سدا اس کو بچارا گیندا

بسکہ گل[2] بازی میں کٹتی تھی مری شب تا صبح
لے کے دوڑے تھا ہر اک شوخ ستارا گیندا

پڑ گیا نیل نزاکت کے سبب ہی ظالم
اُس کے عارض پہ جو میں پھینک کے مارا گیندا

گیندا بازی کا، شب اُس گل کو جو بندھتا ہے خیال
لا کے دیتا ہے اُسے صبح کا تارا گیندا

دست[3] خوش اس کو بنایا ہے گل اندا موں نے
اُن کی باتوں سے کرے کیونکے کنارا گیندا

مصحفی تب میں ترا زورِ طبیعت مانوں
گلشنِ فکر میں پھولے جو دوبارا گیندا

38

گلشن میں جو کل اُس کو میں مارا گیندا
گر پڑا عذر کو پاؤں پہ بچارا گیندا

کہکشاں بن گئی تھی گیندے کے پھولوں کی چھڑی
شب، کہ گوندھے تھا ستارے پہ ستارا گیندا

سینے بند اپنے پہ گیندے کا نہ پھول اُس نے کیا
غیر کے ہاتھ میں کیوں جائے ہمارا گیندا

نیل عارض میں عیاں زردی سی کچھ ہے، سچ کہہ
کس نے تک کر ترے رخسار پہ مارا گیندا

سیبِ غبغب کے ترے رنگ سنہرے پہ صنم
کون سے روز کہ سورج نے نہ وارا گیندا

نازنیں کیوں نہ ملیں اب کفِ افسوس کہ ہائے
جلد اس باغ سے رخصت ہو سدھارا گیندا

رُوکشی[4] اس کی خوش آئی مجھے شب گلشن میں
ارے مہتاب سے بازی تو نہ ہارا گیندا

بیچ ہر برگ میں انداز ہے اک چشمک کا
گوے خورشید[5] کو کرتا ہے اشارا گیندا

1- گول = چھلا 2- گل بازی = پھولوں سے کھیلنا، یہ گلباری (پھول برسانا بھی ہوسکتا ہے)
3- دست خوش = پسندیدہ 4- رُوکشی = منھ پھیر لینا 5- گوے خورشید = سورج گیند

مصحفی دل پہ شکست آئی مرے وقتِ سحر
شاخ سے تازہ جو گل چیں نے اُتارا گیندا

39

آنکھوں کی راہ جس نے پیا جام حسن کا — سرشار ہی رہا وہ ہے آشام حسن کا
جنبش میں لائے یہ دلِ افسردہ کے تئیں — مردے سے کام لیوے یہ ہے کام حسن کا
اس باغ میں سمجھ کے قدم رکھیو، عندلیب — چاروں طرف بچھا ہے یہاں دام حسن کا
ہرگز رہا نہ کافر و مومن سے اُس کو کام — دل نے کیا قبول جب اسلام حسن کا
قاصد نہ ہووے اس کا اگر اضطرابِ دل — پہنچے نہ شاہِ حسن کو پیغام حسن کا
سرگشتہ ہی رہے یہ، کہ خورشید و ماہ نے — دیکھا نہ تیرے دور میں آرام حسن کا
خالی نہیں بناؤ سے اک دم وہ رشکِ حور — آٹھوں پہر ہے ساتھ سر انجام حسن کا
آغازِ خط میں ہم سے وہ کرنے لگا سلوک — پہنچا جب آفتاب لب بام حسن کا

ملزم نہیں کسی بھی ہوا اور فن میں یہ
ثابت ہے مصحفی پہ اک الزام حُسن کا

40

گھونٹ[1] لے سکتا ہے اُس کے کوئی کم حقے کا — واں پری کے لیے کھلتا نہیں خم حقے کا
پانو کیوں کر میں رکھوں بزم میں اُس کی جس کے — ہو کفِ دست پہ حوروں کے قدم حقے کا
سامنے آئے ہے اُس غیرتِ گل کے دمِ صبح — بن کے ہر روز نیا باغِ ارم حقے کا
دستکی[2] اس کی بنا لائے ابھی جا کے پری — گر کرے شوق ذرا بھی وہ صنم حقے کا
دانت مٹھنال پہ تم رکھتے ہو میں ڈرتا ہوں — اس ادا ہی میں نکل جائے نہ دم حقے کا
کھینچے ہے صفحۂ رخسار پہ کیا کیا خاکے — کم نہیں خامۂ مانی سے قلم حقے کا

1- گھونٹ (بروزن اونٹ) = کش 2- دستکی = حقے کی نے کے اُوپری حصے میں لگانے کا کپڑا، دستی

منھ سے تیرے ہی رہے ہے وہ لگا ہر ساعت یہ کوئی ناز اُٹھا سکتے ہیں ہم حقے کا

مصحفی آئے ہے یاد اُس کی مجھے ہم نفسی

شغل کرتے ہیں دو ہمدم جو بہم حقے کا

41

رنگِ شگفتگی پہ چمن جلد آ گیا جھونکا نسیمِ صبح کا آتش لگا گیا

کیا تم سے اُس پری کا میں عالم بیاں کروں عالم کو آہ وہ تو دوانا بنا گیا

گر دردِ دل نہ تھا تو بھلا کس لیے وہ شوخ رستے میں مجھ کو دیکھ کے آنکھیں چُرا گیا

دل عاشقوں کے خون ہو آنکھوں سے بہہ گئے پوروں[1] پہ اُس کے کون یہ مہندی لگا گیا

آیا جو وقتِ شام وہ کوٹھے پہ بے نقاب خجلت سے آفتاب زمیں میں سما گیا

قاتل کہیں تھے اُس کو مرا بعضے مدعی قبضے پہ ہاتھ رکھ کے وہ سوگند کھا گیا

جلوے ہزار حسن نے دکھلائے وقتِ غسل گورے بدن سے اُس کے جو بٹنا[2] ملا گیا

اس کے خیال کی میں کہوں کیا حیا کہ ہائے آیا جو خواب میں بھی کبھی منھ چھپا گیا

فرہاد سا کوئی نہ ہوا ہے نہ ہووے گا اس راہِ عاشقی میں تبھی سر کھپا گیا

افشاں سے اُس کے رخ کا ہوا اور ہی سماں یہ چاند تو ستاروں کا عالم دکھا گیا

نرگس کی آنکھ پڑ ہی گئی اُس پہ مصحفی

وہ گل چمن میں کھولے جو بندِ قبا گیا

42

جب سے ہاتھ اپنا ہوا زلفِ پریشاں سے جدا تب سے ہوتا نہیں اک لحظہ گریباں سے جدا

فائدہ کیا ہے جو تم دھوتے ہو اس کو ہر دم یہ نہ وہ خوں ہے کہ ہو آپ کے داماں سے جدا

دل جو اُلجھا ہے کسی زلف میں، آنسو بھی مرے اُس کے اُلجھیڑے میں ہوتے نہیں مژگاں سے جدا

1- پُورے (بروزن بورے) اُنگلیوں کے اوپری حصے 2- بٹنا (اوبٹن) وہ مرکب جو خوشبو اور صفائے بدن کے لیے مَلا جاتا ہے

جی میں آتا ہے بنا کر کے ہم اب بیٹھ رہیں جھونپڑا اپنا کہیں گبر و مسلماں سے جدا
ہیں جو بیمار تری نرگسِ بیمار کے، جان درد سے شکوہ جدا کرتے ہیں درماں سے جدا
زرہِ پائے کبوتر کی طرح دل میرا بندھ گئے پر نہ ہوا تیر کے پیکاں سے جدا
باغباں ان کی بھی کچھ تجھ کو خبر ہے کہ نہیں موسمِ گل میں ہوئے تھے جو گلستاں سے جدا
لاگ جو دل کی ہے ہر وقت چلی جاتی ہے گرچہ ہم رہتے ہیں برسوں دردرباں سے جدا
ہم سے انکار عبث کرتے ہو شب باشی کا رنگِ پاں آج تو کچھ ہے لب ودنداں سے جدا
کیا عدم والوں کے جانے کی میں تقریر کروں یار ہو ہو گئے کس حسرت و حرماں سے جدا
تھی گلے لگنے کی تیرے جسے خواہش دمِ ذبح نہ ہوا اُس کا گلا خنجرِ بڑاں سے جدا
اس کے ساعد کی صفا دیکھے تو پھر یوسف کی آستیں ہو نہ کبھی دیدۂ گریاں سے جدا
تشنہ کامانِ تمنا پہ مجھے آئے ہے رحم جان دیتے ہیں ترے چاہِ زنخداں سے جدا
بسکہ وارفتہ ہے رفتار پہ اُس کی اک دم سایہ ہوتا نہیں اُس سروِ خراماں سے جدا
مجھ کو حیرت ہے بڑی یہ کہ بہ ہنگامِ سفر کیوں کے ہوتے ہیں عزیز، آہ عزیزاں سے جدا

مر گئے پر بھی تو پیارے تری صورت کا خیال
مصحفی کے نہ ہوا دیدۂ حیراں سے جدا

43

دنیا سے نہ کچھ سیم نہ زر ساتھ چلے گا جوں شمع فقط داغِ جگر ساتھ چلے گا
ظاہر ہی کا ناتا ہے یہ سب مان لے کہنا نادان، پدر اور نہ پسر ساتھ چلے گا
سچ یہ ہے کہ وقت آوے گا جب کوچ کا تیرے تن دیوے گا ہمسایہ، نہ گھر ساتھ چلے گا
جس وقت تو ہووے گا سواری[1]، مہِ تاباں خورشید تری لے کے سپر ساتھ چلے گا
جس وقت کر آوے گا ارادہ تو سفر کا عاصی بھی ترا باندھ کمر ساتھ چلے گا
بُھتے[2] نہیں پڑ جانے کے کچھ شان میں تیری تو میرے جنازے کے اگر ساتھ چلے گا

1- سواری بجائے سوار استعمال کیا ہے (روزمرہ) 2- شان میں بُھتے پڑنا = عزت میں فرق آنا

اے مصحفی قرآں کو نہ کر ترک کہ اک دن
یہ توشہ ترے وقتِ سفر ساتھ چلے گا

44

تو، اے قاصد، ذرا گھر دیکھ آ اس لااُبالی کا　کہ تسکیں دہ نہیں اب عشق معشوقِ خیالی کا
مناسب کب ہے، یارو، سامنے اُس کے مرا جانا　کہ میں حرمت طلب ہوں اور وہ خوگر ہے گالی کا
شفق نے آن کر تربت پہ اُس کی سائباں باندھا　چمن میں وہ جو کشتہ تھا تری آنکھوں کی لالی کا
نہ دل خالی ہوا درد و غمِ ہجراں سے یا قسمت　اگر چہ ہم کو روتے ہی گیا یہ چاند خالی[1] کا
صفِ مژگاں پہ میری لختِ دل کیا جلوہ آرا ہیں　تماشا دیکھ یاں آ کر چراغانِ دوالی کا
بسر کر خاکساروں کی طرح سے خاکساری میں　کہ یاں ہے ایک سا عالم تغیری[2] اور بحالی کا
لپٹ کر اوس[3] میں پھولوں کے جب وہ ساتھ سوتا ہے　بدن پر نقش ہو جاتا ہے گل بوٹا نہالی کا
کلائی اس کی جس دم بوجھ سے گجرے کے مڑتی ہے　لچکنا یاد آتا ہے مجھے پھولوں کی ڈالی کا

کہوں ہوں بیشتر اے مصحفی میں حسبِ حال اپنا
مرا ہر شعرِ تر ہے جیسے وہ مطلع جمالی[4] کا

45

کسی کو یاد ہے ایسی بھی مچلائی[5] کا کم چلنا　وہیں پھر بیٹھ جانا ناز سے گر دو قدم چلنا
گلے میں ڈال دینے ہاتھ چلتے چلتے دشمن کے　جو مجھ کو دیکھنا، پھر وہیں گردن کر کے خم چلنا
اگر عزمِ سفر ہے صبح پر تیرا تو مجھ کو ہے　کوئی میں جھوٹ بولوں گا مجھے تیری قسم، چلنا
روا[6] رَو کیا پڑی ہے آخر آخر اس مسافر کو　ترے بیمار کا دیکھے کوئی اس وقت دم چلنا

1- شوال اور ذی الحجہ کی دو عیدوں کے درمیان ذوالقعدہ کے مہینے کو عورتیں خالی کا مہینا کہتی ہیں۔
2- تغیری (بروزن نفیری) کسی کا منصب بدلنا، تبادلہ (عوامی)　3- اوس: بہ معنی شبنم
4- جمالی دہلوی　5- مچلائی= مَچلنا　6- رَوا رَو= بھاگ دوڑ، عجلت (پریشانی میں) (روزمرہ)

کہے ہے شیخ بھڑوا واں میں اک بت دیکھ آیا ہوں
مقرر مصحفی اب کے پئے طوف حرم چلنا

46

پان کھا کر پھر کیا ہے اُس نے ساماں قتل کا
پہنچے مژدہ تم کو، اے گبر و مسلماں، قتل کا

کشتگاں پر اپنے وہ کر کے نظر کہنے لگا
کِھل رہا ہے زور یہ رنگیں گلستاں قتل کا

قتلِ عاشق میں تأمل خوب رویوں کو نہیں
حکم کرتے ہیں مکرر بادشاہاں قتل کا

پھول سب حلقِ بریدہ سے جو آتے ہیں نظر
کھیت یہ لالے کا ہے یارب کہ میداں قتل کا

کیا نگاہوں کی کہوں میں اُس کی، دانائی کہ وہ
مشورہ مژگاں سے بھی رکھتی ہیں پنہاں قتل کا

شانِ استغنا نے اس کی بس دیا وہ بھی مٹا
دغدغہ رکھتے تھے دل میں اہلِ زنداں قتل کا

پہنچے جب دشتِ بلا میں بولے یوں حضرت حسینؑ
باگ لو گھوڑوں کی، صحرا ہے یہ یاراں قتل کا

نت نئے اک کشتے کی لاش اس میں سے نکلا ہی کی
کس قدر تشنہ ہے وہ چاہِ زنخداں قتل کا

خون ہو جاتا ہے جب دل نارسائی سے تو ہم
سادہ ہاتھوں پر بھی کر بیٹھیں ہیں بہتاں قتل کا

کیوں نہ خوں ریزی خوش آوے اس کی آنکھوں کے تئیں
شوق رکھتے ہیں نہایت دل میں ترکاں قتل کا

قتل کر کے مجھ کو گو تیغا دیا قاتل نے پھینک
مصحفی چھپتا ہے کوئی دست و داماں قتل کا

47

جب میں کہتا ہوں مرا حال بھی کچھ یار سنا
تب بگڑ کر وہ وہیں جاوے ہے دو چار سنا

رہ گیا کون سا پردہ مری رسوائی پر
سب نے افسانہ مرا بر سرِ بازار سنا

دوریِ گل کے فسانے سے بھرا آئے ہے جی
داستاں اور کوئی مرغِ گرفتار سنا

بے وفائی کا گلہ اُس کی میں، شب کرتا تھا
کان دھر کر کے سب اُس نے پسِ دیوار سنا

دشمن و دوست سے میں طعن و ملامت یکسو
جو نہ سننا تھا ترے واسطے ناچار سنا

کب تلک مرگِ عزیزاں ہی کا افسانہ کہے　　عمرِ خوش بھی تو اے بختِ زیاں کار سنا
وہ بھی کیا دن تھے کہ تم مارے قلق کے دوڑے　　آئے پرسش کو چلے جب ہمیں بیمار سنا
مصحفی فائدہ کیا، ہو تو گر اب منکرِ عشق
ہم نے یہ حرف ترے منہ سے کئی بار سنا

48

جہاں پریوں کا نت رہے تھا اکھاڑا　　سو اس شہر کو چرخ نے یوں اُجاڑا
بگڑتے رہے سیم تن مجھ سے یوں ہی　　نہ ڈھالا[1] کسی کا نہ کچھ میں بگاڑا
نظر جس نے کی تجھ پہ خواہش کی، پیارے　　نظر کرتے ہی اس کو بس ہم نے تاڑا
مُوا قیس جس دم تو بولے یہ بعضے　　اسے پاس لیلیٰ ہی کے کیوں نہ گاڑا
اگر موج زن ہووے دریائے گریہ　　نہ ثابت رہے آسماں کا تراڑا
مجھے رحم آتا ہے اُن پر جنھوں نے　　تری سرد مہری کا کاٹا ہے جاڑا
جو ہم اُس کی مجلس میں جاتے ہیں گاہے　　تو بس اپنے جاتے ہی ہوتا ہے جھاڑا
کہاں اُن کی داڑھی کو گر پشم میں نے　　بھلا شیخ جی نے مرا کیا اُپاڑا
گلستاں میں بیتابیِ دل نے میری　　ہر اک نخل کو بیخ و بُن سے اُکھاڑا
میاں مصحفی اب ہے وقت خموشی
بہت گا چکے تم بھی اپنا پنواڑا[2]

49

باز نالے سے نہ آیا دلِ نالاں میرا　　شیشہ خانہ ہی رہا کلبۂ احزاں میرا
لطف تو تب ہے کہ کھینچوں میں ترے دامن کو　　اور ترے ہاتھ میں ہو چاک گریباں میرا
یاد میں کس لبِ نوشیں کی میں روتا ہوں جو آج　　چشمۂ نوش ہے ہر دیدۂ گریاں میرا

1۔ ڈھالا = کم کیا　2- پنْواڑا (نون غنہ کے ساتھ) (عوامی)

تیغ کس واسطے کرتا ہے علم، اے قاتل　کام ہوتا ہے بہ یک جنبش مژگاں میرا

دمِ شمشیر پہ لوٹوں ہوں میں مجنوں کی طرح　اور منھ دیکھتے ہیں گبر و مسلماں میرا

خواب میں بوسہ جو اس لب کا لیا تھا اک شب　لبِ افسوس ہے اب تک تہِ دنداں میرا

دے مے لطف بہ اندازہ یہ ساقی سے کہو　ہوں میں کم ظرف نہیں حوصلہ چنداں میرا

کوہ اور دشت میں پھرتا ہوں بھٹکتا یا رب　مجھ سے ملتا نہیں کیوں کبکِ خراماں میرا

مصحفی جب میں کروں ایسی زمیں میں گلزار

منھ تکے کیو نکے نہ ہر ایک غزل خواں میرا

50

جرسِ قافلہ کب تھا دلِ نالاں میرا　شور ہے اب تو بیاباں بہ بیاباں میرا

جوں جوں وہ مجھ سے رُکے ہے میں کھنچا جاتا ہوں　ہے مگر دستِ تغافل میں گریباں میرا

کیوں عبث جان کھپاتا ہے بھلا تجھ سے کبھی　کام نکلا ہے کچھ، اے دیدۂ گریاں میرا

دیکھ لیتا میں کسی ڈھب سے تو، چوری چوری　کاش کے بام پر آتا مہِ تاباں میرا

کس کی چوٹی کے تصور میں میں سویا کہ ہوا　بوریا باف [1] سراسر تنِ عریاں میرا

اُس کی زلفوں کی، صبا مجھ سے تو تقریر نہ کر　دل تری باتوں سے ہوتا ہے پریشاں میرا

قطرۂ خوں مرے دکھلانے سے قاتل کو بہار　دمِ شمشیر سے کھِلتا ہے گلستاں میرا

میں سوا شعر کے کچھ اور سمجھتا ہی نہیں　دم بدم ہے یہی دین و دل و ایماں میرا

مصحفی صُحفِ ساوی [2] سے جدا اُس کو نہ جان

جلد چارم کے مقابل ہے یہ دیواں میرا

51

جوڑا ہے اک تو بر میں ترے آج دھوم کا　پاجامہ تس پر اور ہی غضب بند رومِ [3] کا

1- بوریاباف = بدن پر بوریے کی نشان پڑ جانا　2- صُحف ساوی = آسمانی کتابیں

3- غالباً چوڑی دار، بدن سے لپٹا ہوا

اُس کے لباسِ سرخ کے کشتے کی خاک پر
آ کر شفق چڑھا گئی جوڑا کسوم[1] کا

جو سعد و نحسِ دہر سے آزاد ہیں انھیں
کم سایۂ ہُما سے نہیں سایہ بوم کا

کانوں کے تیرے دیکھ کے آویزۂ گہر
ششدر پھرے ہے سات سہیلی[2] کا جھومکا

یاروں سے یہ کہو کہ گھر اپنے کی راہ لیں
لاشے پہ میرے فائدہ اب کیا ہجوم کا

کنجِ لحد میں اپنی ہوئی جا، و لے ہمیں
اب تک ہے انتظار ہی اُس کے قدوم کا

دیکھیں جو اُس کے روے کتابی کو اک نظر
دل منحرف ہو علم سے اہلِ علوم کا

آنکھوں کو یاں ستارہ شماری سے کام ہے
واں اُس کو جب سے شوق ہوا ہے نجوم کا

ہرگز ہوئی نہ صبح مبدل بہ شام ہجر
بندہ ہوں میں بھی اپنے غرض بختِ شوم کا

سوداے زلف و رخ مجھے کافی ہے مصحفی
خواہاں نہیں میں سلطنتِ شام و روم کا

52

تا بغل سینہ نما وہ مہِ تاباں نکلا
اس زمانے میں نیا چاک گریباں نکلا

یہی تابوت سے کشتے کی ترے نکلے ہے
کہ یہ اُس کُو[3] سے بصد حسرت و حرماں نکلا

جیتے جی میں تو کیا ضبط ولیکن پسِ مرگ
دودِ دل ہو کے مری خاک سے ریحاں نکلا

بر سرِ رحم بھی ٹک لا دلِ سنگیں کے تئیں
تا کہیں سب، کہ یہ کافر بھی مسلماں نکلا

تیرِ بیداد کا تھا کس کے نشانہ تنِ زار
جو پس از مرگ ہر اک عضو سے پیکاں نکلا

جستجو میں تری، اے برتر از افہام عقول
گبر بُت خانے سے، کعبے سے مسلماں نکلا

اُس کا عالم جو بیاں کیجیے تو مر جاے تذرو
جس روش باغ سے وہ سروِ خراماں نکلا

دل کے معمورے سے اُٹھ آئے ہزاروں مجھ سے
ایک میں ہی نہ اُسے چھوڑ کے ویراں نکلا

اُس نے جھٹکا تو بہت مجھ کو سمجھ کر کمزور
پر نہ چٹکی سے مری گوشۂ داماں نکلا

1- کسوم = مشہور پھول ہے، پُرانے زمانے میں اس سے کپڑوں کو رنگا جاتا تھا۔

2- سات سہیلی = بنات النعش، ستاروں کا ہار جنھیں انگریزی میں Constellation of the bear کہتے ہیں 3- کُو بمعنی کوچہ

وادیِ عشق میں چل چل کے ہوا پیر تو یار
مصحفی تو بھی نہ تجھ سے یہ بیاباں نکلا

53

عیسیٰ کے گھر نہیں ترے بیمار کی دوا کیا سود بخشے پھر اُسے عطار کی دوا
داغِ کلف سے رنگ جو اُس کا سیاہ ہے ہر اک سے پوچھتا ہے وہ رخسار کی دوا
آنکھوں کو بند کر کے رہا بیٹھ اک جگہ آخر یہ کی میں حسرتِ دیدار کی دوا
دارو فروش شہر دغل[1] ہو گئے ہیں سب یاں معتبر نہیں کسی عطار کی دوا
آزارِ عشق سے نہیں ہوتی ہے جاں بری جز مرگ اور کیا ہے اس آزار کی دوا
اک روز اس نے دستِ حنائی دکھا دیے یوں کی ہمارے دیدۂ خوں بار کی دوا
مہلک مرض ہے تجھ کو میں کہتا ہوں مصحفی
کھاوے تو کھائیو کسی ہوشیار کی دوا

54

میں ہجر میں کب خونِ جگر پی نہیں رہتا کیا کیجیے کہ تجھ بن تو مرا جی نہیں رہتا
ہر چند قسم کھا کے میں کہتا ہوں، رہ اُس سے ہے رشک جو دل اس کے میں، وہ بھی نہیں رہتا
فریاد کُناں آئے ہے مجنوں پسِ محمل رفتار سے پَر ناقۂ لیلیٰ نہیں رہتا
کس رات تصور سے تری زلف کے کافر سینے پہ مرے لوٹتا افعیٰ نہیں رہتا
کھولے ہے جہاں اپنا وہ منھ چاک گریباں واں دل کوئی بے داغِ تمنّیٰ نہیں رہتا
نظارے کا منکر نہ ہو، کب دو دو پہر تک آئینہ ترے رُخ کے محاذی نہیں رہتا
دن حُسن و جوانی کے سمجھ اپنے غنیمت اے شیخ سدا عالمِ خوبی نہیں رہتا
نت پچھلے پہر اُٹھ کے اذاں دیوے ہے مُلّا فریاد سے یہ مُرغِ مصلّی نہیں رہتا
آہوں کے شراروں سے شبِ ہجر میں تیری کب طورِ جگر وقفِ تجلّی نہیں رہتا

1- دغل = مکار، فریب کرنے والا

اے مصحفی کیوں کر نہ کہوں شعر کہ ہرگز
بے فکرِ سخن صاحبِ معنی نہیں رہتا

55

مناسب کیا ہے تم کو پی کے مے غیروں کے گھر سونا
ندامت باز لاتا ہے میاں یوں بے خبر سونا

مری اِس خفتہ بختی پر نظر کیجو ذرا ظالم
خدا کے واسطے، رستے میں مت اے نامہ بر سونا

کہیں تو شب کو تو تا صبح دم بیدار بیٹھا ہے
نہیں بے وجہ یہ دن کا ترے دو دو پہر سونا

ہمارے دل کے سب ارمان یک باری نکل جاویں
میسّر ہووے تیرے ساتھ اگر اے سیم بر، سونا

سَمور[1] و قاقم[2] و سنجاب[3] کو وے پشم سمجھیں ہیں
رکھے ہے گرم فصلِ دَے[4] میں جن کو بھاڑ پر سونا

مزہ تو راگ کا جب ہے کہ جب محفل میں بیٹھے ہوں
لیے سازِ طرب کف پر اِدھر مکھن[5] اُدھر سونا

فراغت جیتے جی ممکن نہیں اے مصحفی شاید
میسر ہو ہمیں بعد از فنا، بے دردِ سر سونا

56

دل پہ جب صدمہ گرفتاری کا تھا زور عالم شب کی بیداری کا تھا

1- سَمور = (Sable) اُود بلاؤ، ایک جانور کی کھال جس سے گرم کپڑے بناتے ہیں
2- قاقم = Ermine ایک جانور جس کی نرم پشمینہ سے سردی کا لباس بناتے ہیں
3- سنجاب = بڑی گلہری جس کی کھال کا لباس بناتے ہیں۔ 4- دَے = (بروزن ہے) ایرانی فصلی سال کے دوسرے مہینے کا نام 5- مکھن اور سونا دونوں اُس زمانے کے موسیقاروں کے نام ہیں۔

آخرش آئی عناصر پر شکست ہم کو ڈر اِس چار دیواری کا تھا
ہم تھے یاں بیمار، اور واں شیفتہ عالم اُن آنکھوں کی بیماری کا تھا
میرے ہمسایوں کو، جب تک میں جیا شکوہ میری نالہ و زاری کا تھا
پان کھایا تھا جو اُس نے وقتِ جنگ اُس میں اک انداز خوں خواری کا تھا
ہر طرح ہوتا تھا اپنا ہی زیاں اُس پہ جب عالم طرح داری کا تھا
تم جو مجھ سے روٹھ بیٹھے وقتِ نزع کون سا یہ وقت بیزاری کا تھا؟
مر گیا جب میں، تو بولے ہم نشیں ناک میں دم ہی اس آزاری کا تھا
دیدہ و دل کا بُرا ہو، ورنہ یاں کب دماغ اِس ناز برداری کا تھا
پھول گُل کھاتے تھے باہم جن دنوں جامہ اُس کے بَر میں پھلکاری[1] کا تھا
بعدِ مُردن خاکِ مرقد پر مری ق سائباں اِس چرخِ زنگاری کا تھا
وہ نہ لائے ایک چادر بھی کبھی
مصحفی جن سے گماں یاری کا تھا

57

گر کبھی خواب میں ہو جائے ہے نظّارا سا آنکھ کھلتے ہی میں رہ جاؤں ہوں مَن[2] مارا سا
دیکھ اُسے بن گئے ہم صورتِ دیوار کی شکل نظر آیا جو کوئی بام پہ مہ پارا سا
فصل گُلوں کی جو آئی ہے تو ہر نخل کے بیچ جو ثمر ہے وہ نظر آئے ہے انگارا سا
قافلہ اشک کا، ہو لختِ جگر سے پُر بار[3] لادے ٹانڈے کو چلا جائے ہے بنجارا سا
آوے تا مرغِ قفس زاد کو اُس میں سکھ نیند شاخِ گلبن میں قفس جھولے ہے گہوارا سا
دل بے تاب کی شوخی کا کہوں کیا عالم نکلا ہی جائے ہے ہاتھوں سے مرے، پارا سا
مجھ کو دیتا ہے وہی شاخ سے چن کر گل چیں پھول اِس باغ میں ہووے ہے جو ناکارا سا

1- پھلکاری = ایسا کپڑا جس پر پھول بنے ہوں 2- مَن مارا = مُردہ دل کا بہترین ترجمہ
3- پُر بار = سامان سے بھرا ہوا

کہہ دو قاتل سے کہ پھانسی مجھے دے کر مارے
ورنہ خوں ذبح کے دم اُچھلے گا فوآرا سا

گورے سینے پہ ٹکی اربسی اُس کا سپند[1]
چاندنی رات میں جھمکے ہے پڑا پارا سا

یادِ عارض میں تری، شب مَیں نہ دیکھا اُس کو
ماہ ہر چند رہا سامنے، رخسارا سا

جب سے پرہیز کیا چارہ گروں نے مجھ سے
تب سے بستر پہ پڑا رہتا ہوں بے چارا سا

آہنی دل کو ترے کر نہیں سکتا سوہان
گرچہ ہے نالۂ شب گیر مرا خارا سا

ہم نے کل مصحفیِ خستہ کا عالم دیکھا
اُس گلی میں جو وہ بیٹھا تھا نپٹ مارا سا

58

کبھی جو پہنے ہے پھولوں کا وہ گندھا گہنا
لگے ہے اُس بتِ کافر کو خوشنما گہنا

کبھی ہے زر سے مُکلّل[2] وہ اور کبھی گل پوش
غرض وہ دن کا ہے زیور یہ رات کا گہنا

خطِ سیہ میں جو رُخ اُس کا ہوتا جائے نہاں
نہ کیونکے پھر مجھے یاد آئے چاند کا گہنا

گلے میں اُس کے پڑی موتیوں کی مالا ہو
جگر پرو کے ہوئے اپنا موتیا گہنا

فسردہ ہووے ہے، گر نیم شب میں اک سنگار
اُتار اُسے، جو پہن لے وہ دوسرا گہنا

شگفتہ کیونکے نہ ہو دیکھ اُس کو غنچۂ دل
ہمارے حق میں تو ہے باغِ دل کشا گہنا

گلے میں اُس کے جو چمپا کلی ہے کلیوں کی
کہے تو یہ ہے جو پرویں سے ہے بنا گہنا

دماغ کب مرے اَن بیندھے[3] پھولوں کا ہے اُسے
کہ اُس کو آوے ہے باغوں سے نت گُندھا گہنا

سدا چنگیر میں چاندی کے، منھ لگاتا ہے
اُسی کے واسطے پرویں کا خوشنما گہنا

رقیب در پہ ہوا حلقہ زن وُہیں شب وصل
اُتار اُس نے مُقابے[4] میں جب دھرا گہنا

شب عروسیِ گل مصحفی جو یاد آئی
میں یوں عروسِ سخن کو پنھا دیا گہنا

1- سپند = کالا دانہ 2- مُکلّل = جس کے سر پر تاج ہو 3- اَن بیندھے = ناسُفتہ، جنھیں پرویا نہ گیا ہو۔ 4- مُقابہ = زیور رکھنے کا ڈبہ

59

شیشۂ توبہ ہمارا جو کبھو ٹوٹ گیا
وائے حسرت کہ سرِ خُم پہ سبو ٹوٹ گیا

سنگِ رہ ہوتے رہے تیرے، ہزاروں عقدے
حیف، اے پائے طلب تَو بھی[1] نہ تو ٹوٹ گیا

بحرِ ہستی میں طلسمِ تنِ خاکی کا حباب
بن گیا آپھی کبھو، آپھی کبھو ٹوٹ گیا

وہ بھی آخر کو نزاکت سے ہوا چیں بہ جبیں
اُس کی چوٹی کا جو مشاطہ سے مو[2] ٹوٹ گیا

سنگ کیا توڑنے کو چاہیے اس شیشے کے
دلِ نازک جو بہ یک گردشِ رُو ٹوٹ گیا

تھا جو بستے میں ورق نیم رخِ عذرا کا
جوں ہی نکلی تری تصویر، دو رُو ٹوٹ گیا

ابھی نیفے[3] کی بھڑک اُس نے دکھائی کب تھی
ایک خمیازے[4] میں زاہد کا وضو ٹوٹ گیا

مصحفی زور کو آیا وہ مقابل جو مرے
پنجہ[5] ناکردہ، وہیں دستِ عدو ٹوٹ گیا

60

بسکہ دیوانہ ترا شوریدہ زیرِ خاک تھا
بعدِ مُردن بھی گریبانِ کفن صد چاک تھا

تربتوں پر جن کی سایہ نخلِ خرما[6] نے کیا
گنبدِ خضرا ہی اُن کو سائبانِ تاک[7] تھا

کس کے ہونٹوں کی مِسی شب دیکھ آیا تھا میں آہ
صبح تک لب پر مرے اک دودِ حیرت ناک تھا

گرچہ بجلی سی پڑی کوندے تھی شب سینے میں آہ
نالۂ درد آشنا کچھ اس سے بھی چالاک تھا

کیوں لگا رکھا تھا اتنا اُس نے عاشق کے تئیں
ایک تبسم میں تو بس قصہ ہی اُس کا پاک تھا

کاسۂ سر کو مرے ٹھکرا کے کیوں چلتی ہے خلق
ایک دن یہ بھی کسی کا زینتِ فتراک[8] تھا

باغباں پھولوں کے تُودے لا کے کرتا تھا، ولے
اپنی آنکھوں میں تو وہ تجھ بن خس و خاشاک تھا

کیا سعادت کی توقع اُن سے میں رکھتا کہ یاں
جو ستارہ تھا اسیرِ گردشِ افلاک تھا

1- تُو بھی = تب بھی 2- مُو = مُو باف کا مخفف 3- نیفا = ازار (شلوار) کا بالائی حصہ جس میں ازار بند ڈالتے ہیں 4- خمیازہ = انگڑائی 5- پنجہ لڑائے بغیر 6- کھجور کا پیڑ 7- انگور کی بیل
8- فتراک = وہ تھیلا جس میں شکار کو رکھتے ہیں

عرش کی لادی ہمیں اک آن میں اُس نے خبر
بسکہ پیک[1] نالہ اپنا مصحفی چالاک تھا

61

کل جو میں مجلسِ خوباں کا نظارا مارا — شوخ چشموں نے مجھے کر کے اشارا مارا
اُس نے پھینکی جو طرف میرے کلی لالے کی — میں نے شوخی سے اُسے پھول ہزارا مارا
تہ و بالا جو کیا چرخ نے نالوں کو مرے — بے قراری نے ستارے پہ ستارا مارا
ساتھ اُس گل کے کبھی ہم نے جو چوسر کھیلی — دو ہی پانسوں میں گیا رنگ ہمارا مارا
اپنے آغا سے دغا کر کے بچا کون بھلا — کیا نہ سمجھے یہ، خواصوں نے جو دارا[2] مارا
نامہ بر کے تئیں دی زلف نے اُس کی پھانسی — میرے قصے میں گیا مفت بچارا مارا

مصحفی بابِ اجابت جو مُقفل[3] تھے تمام
نالہ پھرتا تھا شبِ ہجرا میں مارا مارا

62

ہر چند اَمردوں میں ہے اک راہ کا مزا — غیر از نساء[4] ولے نہ ملا چاہ کا مزا
خطرے سے اُس کے کرنہیں سکتا میں آہ بھی — لیتا ہوں جی ہی جی میں سدا آہ کا مزا
اپنی تو عمر روزِ سیہ میں گزر گئی — دیکھا کبھی نہ ہم نے شبِ ماہ کا مزا
باللہ کہہ کے اُس نے قسم کھائی تھی کہیں — واللہ بھولتا نہیں باللہ کا مزا
بوسے کے جو سوال پہ اُس نے کہا تھا، واہ — اب تک پھرے ہے دل میں وہی واہ کا مزا
لذت کو اُس کی سمجھیں ہیں کیا صاحبِ ورع[5] — کوئی پوچھے اہلِ فسق سے توباہ[6] کا مزا

کیا وہ بھی دن تھے خوب کہ لوٹیں تھے مصحفی
ہم بھی نظارۂ گہ و بے گاہ[7] کا مزا

1- پیک = وہ تیز رفتار قاصد جو پیغام یا ڈاک لے کر جاتے تھے 2- دارا = ایرانی بادشاہ
3- مقفل (بروزن مکمّل) = قفل یعنی تالے پڑے ہوئے، بند۔ 4- نِساء (عربی) عورتیں
5- صاحبِ ورع = زاہد 6- توباہ = توبہ 7- گہ و بے گاہ = کبھی کبھی

63

قہر ہے اُن کفِ دست حنائی کی ادا — جس کے پاسنگ[1] میں تلتی ہے کلائی کی ادا

شکر صد شکر تو گویائی میں آیا اے بت — ہو چکی بات، ہے اب ساری خدائی کی ادا

سادگی ماہ محرم کی تری، ہائے رے ہائے — اہلِ زیور میں کہاں ہے یہ صفائی کی ادا

دو ہیں گر پڑتے ہیں آنسو مرے جب آئے ہے یاد — اُس دوپٹے کا وہ آنچل وہ دُلائی کی ادا

میں تو سائل نہیں اس شوخ سے بوسے کا مگر — کاسۂ چشم سے نکلے ہے گدائی کی ادا

اُلٹی چتون نے تری مار ہی رکھا مجھ کو — کیا کہوں ہائے رے اُس چشمِ ہوائی کی ادا

مصحفی پھر کے جو اُس شوخ نے دیکھا تھا مجھے
اب تک آنکھوں میں ہے وہ روزِ جدائی کی ادا

64

جس دن ترے کوچے سے سفر اپنا ہوا تھا — اک وادیِ وحشت میں گزر اپنا ہوا تھا

کر ذبح، وہ قاتل، مرے لاشے پہ یہ بولا — دامن ہی ترے خون میں تر اپنا ہوا تھا

دو دن بھی جو ہم، جان مری اور نہ سمجھیں — برباد ہی خاطر تری گھر اپنا ہوا تھا

کیوں پھڑکیں ہیں مژگاں تری کیا جانے حیا سے — تیروں کے مقابل تو جگر اپنا ہوا تھا

ہم تو بھی محبت سے نہ باز آئے اگرچہ — سو بار محبت میں ضرر اپنا ہوا تھا

واں ڈال کے بھاگا تھا سپر ہاتھ سے رستم — جس معرکے میں سینہ سپر اپنا ہوا تھا

بدنام کیا ہم کو عبث وصل سے اُس کے — کب ہاتھ بھلا طوقِ کمر اپنا ہوا تھا

اک دن نہ ہوا زینتِ گوش اُس کا وگرنہ — ہر شعر بہ از سلکِ گہر اپنا ہوا تھا

اے مصحفی کیا تجھ کو بتاویں کہ شب دوش
اک روز ہی مجلس میں گزر اپنا ہوا تھا

1- پاسنگ = وہ چھوٹا سا پتھر یا کوئی اور چیز جو ترازو کے دونوں پلڑے برابر کرنے کے لیے ایک پلڑے میں رکھتے ہیں

65

نت اپنے حُسن کا وہ طالب نظر ہی رہا ہمیشہ آئینہ تکیے میں زیرِ سر ہی رہا

ہوا نہ بابِ اجابت پہ حلقہ زن اک شب تمام عمر مرا نالہ بے اثر ہی رہا

پھرے گا جلد، مجھے اُس سے یہ توقع تھی گلی میں یار کی قاصد تو جا کے مر ہی رہا

شبِ فراق جو کی کوتہی اجل نے تو کیا اک آہِ سرد میں، میں کام اپنا کر ہی رہا

بسانِ طائرِ تصویر تو تو، اے منعم ہزار حیف گرفتارِ بام و در ہی رہا

خیالِ فندق پائے صنم میں ہجر کی شب بہ نوکِ ہر مژہ یاں پارۂ جگر ہی رہا

سحابِ گریہ نے ہرچند آبیاری کی نہالِ عشق مرا تو بھی بے ثمر ہی رہا

لیا فراق نے یہ انتقامِ وصل کہ اب نہ حرفِ شوق، نہ نامہ، نہ نامہ بر ہی رہا

مزہ ملا لبِ شیرینِ یار کا جس کو مرے سے دونوں جہاں کے وہ بے خبر ہی رہا

زبسکہ اُس کے تجسس میں ہم پھرا ہی کیے ہمیں تو ریگِ رواں کی طرح سفر ہی رہا

نہ مصحفی سے گیا عشق آہ خوباں کا
سدا وہ محوِ تماشائے رہ گزر ہی رہا

66

رات مہندی سے جو اُس گل کی رخِ زرد بھرا صبح نے دیکھ کے مجھ کو نفسِ سرد بھرا

دوستوں بہرِ خدا ذکرِ جدائی نہ کرو نہ ستاؤ کوئی مجھ کو میں ہوں دُکھ درد بھرا

ہے ہر اک شیشے میں یاں تو مے وحدت کا ظہور نشۂ رنگِ حقیقت ہے بہر فرد بھرا

کر چکا قتل وہ مجھ کو، تو لگا یوں کہنے خوں سے تیرے تو مرا ہاتھ ہے نامرد بھرا

ذبح کرنے میں تو کی سعی بہت قاتل نے خونِ بسمل سے تو پھر بھی نہ دم کرد[1] بھرا

اس کی گردن سے جھلکتی ہے یہ رنگینیِ حسن جوں کسی شیشے میں ہو تازہ گلِ وَرد[2] بھرا

مصحفی خط سے ہے اُسے سیب زنخداں کا یہ
میوۂ از شجر افتادہ ہو جوں گرد بھرا

1- کرد = کام، عمل 2- گلِ وَرد = گلاب کا پھول

67

کل جو میں کچھ اُس سے اپنا دردِ تنہائی کہا　　اُس نے سن سن کر مجھے یکبار سودائی کہا

بیچ میں آئی پریشاں اختلاطی کی جو وضع　　اُس نے ہرجائی مجھے، میں اُس کو ہرجائی کہا

میں جو ملنے کو گیا، مجنوں نے کھول آغوشِ شوق　　بہرِ تعظیم اُٹھ کے، مجھ کو ''آیئے بھائی'' کہا

جب اکیلا مل گیا وہ پا کے فرصت بیش و کم　　حالِ زار اُس سے کہا میں، پر بہ دانائی کہا

شہرِ لیلیٰ پر جو یوں یکبارگی تنگ آ گیا　　کس نے اُس سے قصۂ مجنونِ صحرائی کہا

جب اشارے کو نہ سمجھا نرگسِ لیلیٰ کے قیس　　زیرِ لب ہنس کر اُسے کافر نے صحرائی کہا

ضد سے اُس کی میں بہ رسوائی قدم رکھتا گیا　　جتنا ناصح نے برائے ترکِ رسوائی کہا

میرے اور اُس کے جو کچھ کل ذکرِ نسبت آ گیا　　حرفِ نسبت جو کہا اُس نے بہ زیبائی کہا

ہیں معاصر گرچہ اپنے مصحفی خوش گو ولے
کم کسی نے ریختہ ایسا بہ رعنائی کہا

68

جی سے نہیں بسر تا اک پل خیال تیرا　　یعنی وہی ہے اب تک شوقِ وصال تیرا

بے پردہ ہو نہ ظالم، ہو جائے گی قیامت　　اک تو یہ شکل، تس پر یہ سن و سال تیرا

کوٹھے پہ جب چڑھا وہ، بولی قضا فلک پر　　اے آفتابِ تاباں، آیا زوال تیرا

بے ہودہ کلکِ مانی صنعت گری کرے ہے　　کاغذ پہ آ سکا کب حسن و جمال تیرا

چینِ جبیں نے تیری ہم کو کھپا دیا ہے　　کیا جانے کیا کرے گا آخر ملال تیرا

اس وقت میں تو اپنے کھنڈال جی کی، اُس سے　　جانِ بہ لب رسیدہ کیا ہے سوال تیرا

میں تجھ سے کیوں کہا تھا، مرتا ہوں جان تجھ پر　　دشمن ہوا ہے جی کا اب انفعال تیرا

پیدا کیا ہے تجھ کو سر تا قدم نزاکت　　باریک تر کمر سے ہے بال بال تیرا

ہوں کیونکے ہاتھ میرے سینے سے تیرے محرم　　حصے میں مدعی کے آیا ہے مال تیرا

مت خواب کا تو ملنا موقوف کر تو، ظالم ظاہر میں گر ہے مجھ تک آنا محال تیرا

اُس در سے مصحفی تو ٹلتا نہیں جو یک پل
یاں ہی گڑا ہوا ہے شاید کہ نال تیرا

69

اے غم زدہ ضبط کر کے چلنا ہر گام ٹھہر ٹھہر کے چلنا
انداز غضب ہے یہ بتوں کا ہاتھوں کو کمر پہ دھر کے چلنا
جاتے ہوئے اُس گلی سے ہم کو ہر گام اک آہ بھر کے چلنا
اے کبک کہاں تو اور وہ رفتار پاوے گا نہ ایسا مر کے چلنا

اے مصحفی کیوں دبوں نہ اُس سے
عاشق کا ہے شیوہ ڈر کے چلنا

70

اُس پری رُو نے لگائی شب جو مردانی حنا ہوگئی دیکھ اپنی رنگت آپ دیوانی حنا
پاشنہ کوب آئے جب وہ فرشِ مخمل پر سوار عرصۂ دل میں کرے کیوں کر نہ جولانی حنا؟
وقتِ قربانی تو آخر ہاتھ رنگیں ہوئیں گے کیوں لگاتے ہو بروزِ عید قربانی حنا؟
ہم کو قربانی کی نوبت ہی نہ آئی، ہے دریغ خود ہوئی ہاتھوں کو اُس کے دیکھ قربانی[1] حنا
وصل کی شب دست و پا اُس کے اجارے لے لیے بن گئی کیسی ہماری دشمنِ جانی حنا
کیوں نہ پیکاں کھائے دل پرشست سے اُس کی کوئی کردے جب فندق کو اس کی لعلِ پیکانی حنا
رشک کی جا ہے کہ کیا بختِ رسا رکھے ہے تو روز خوانِ حسن پر ہے تیری مہمانی حنا
بعد اشکِ نیم رنگ آتے ہیں قطرے خون کے جیسے رچنی ہووے ہے اول سے، کچھ ثانی حنا
پانو کا تب اُس بت کافر کے خاکہ کھینچے ہے فندقوں میں پہلے بھر لیتا ہے جب مانی حنا

1- قربانی = یعنی قربان (یائے زائدہ کے ساتھ)

تو کہاں، اے کٹنی[1] اور وہ دست وے سادے کہاں
رنگی تیری ہے اُن سے جائے حیرانی حنا

جا پڑا تھا ہاتھ سوتے میں مگر سر پر ترا
کل جو کچھ رکھتے تھے تیرے موئے پیشانی حنا

بند کر مٹھی میں تو لاکھوں کی روحیں لے گئی
ہم نے یہ چوری تو تیری رات پہچانی حنا

آبلہ دل کا تھا میرے مصحفی نشتر کا باب
میں لگا دی اس پہ شب ناحق بہ نادانی حنا

71

کوئی محبوب لگاوے تو ہے محبوب حنا
دستِ ناخوب کے تئیں لگتی ہے کب خوب حنا؟

رشک کی جا ہے کہ شب چوری ہی چوری تو نے
اُس کے تلووں کے مزے لوٹ لیے خوب حنا

دل پہ کھاتے ہیں جو نازک بدناں رشک کے زخم
ہے مگر اس کی نَر انگشت سے منسوب حنا

پشت و روٗ اُس بتِ کافر نے کیے ہیں رنگیں
اب کی رت یعنی لگائی ہے پُر آشوب حنا

اشک خونیں نہیں بہتے یہ، سدا کنعاں سے
تحفہ یوسف کے لیے بھیجے ہے یعقوب حنا

کھول کر اُس کو ذرا پڑھ، کہ ترے ہاتھوں میں
یک قلم حال شہیداں کا ہے مکتوب حنا

سینکیاں اُس نے لگا کر کے جو دکھلایا ہاتھ
خانۂ دل کو مرے کر گئی جاروب حنا

تہ سی اک خونِ جگر کی مرے، دے لے کف پر
کیو نکے گاڑھی تو صنم ہوتی ہے معیوب حنا

طشت میں خونِ جگر ہم نے بھرا جب رو رو
تو اُسی رات کنویں میں نہ گئی ڈوب حنا

اُتری پانووں کی ترے گر انھیں ہاتھ آئے، ابھی
اپنے زخموں کو بھریں حضرتِ ایوبؑ حنا

دست و پا باندھ ترے تجھ کو سُلا رکھتی ہے
تجھ سے غالب کے تئیں، کرتی ہے مغلوب حنا

گرچہ ہیں حسن کی دنیا میں کئی رنگ بناؤ
پر مجھے سب پہ نظر آئے ہے سر کوب[2] حنا

دیکھ کر رنگِ کفک اُس کا یہ بولا نقاش
ہم نے دیکھی نہیں ایسی تو خوش اسلوب حنا

مصحفی کشتہ ہوں میں دستِ حنا بنداں کا
چاہیے ہو مری تربت کی، ہری دُوب حنا

1- کٹنی = (بہ ضمِ اوّل) مخبر، جاسوس عورتیں 2- سرکوب = حاوی، غالب

72

گر ہمارے زخم پر ٹک رکھ دیا مرہم تو کیا　　چند روز ے اور بھی، یارو جیے گر ہم تو کیا

لعلِ شیریں ہے علاجِ تلخیِ بیمارِ عشق　　گر مری بالیں پہ بیٹھا عیسیٰ مریم تو کیا

لطف تو تب ہے کہ دیکھوں اُس کا گوش پُر گہر　　باغ میں دیکھا اگر لطفِ گل و شبنم تو کیا

عاقبت اس خاک کی جا گہ بہ زیرِ خاک ہے　　عرش کے اوپر گئی خاکِ بنی آدم تو کیا

زندگی میں تو عیادت کو نہ آئے ایک دم　　بعد مرنے کے مرے، تم نے کیا ماتم تو کیا

میں تو تب خوش ہوں جب آ کر بے تکلف بیٹھویاں　　چلتے چلتے پاس میرے پھر گئے اک دم تو کیا

شور بختی سے نہ نکلا تو بھی حاجی، مصحفی
گر پیا کعبے میں جا آبِ چہِ زمزم تو کیا

73

تھے جو حجاب اُٹھ گئے، روم و فرنگ مل گیا　　دیتے ہی ایک بوسے کے رنگ سے رنگ مل گیا

رو رو کے ہم نے تا سحر خوب نکالے دل کے چاؤ　　رونے کو شب جو اِک ہمیں حجرۂ تنگ مل گیا

ہم نے لگن میں صبح دم اُس کی نہ پائی خاک بھی　　شعلۂ شمع سے جو رات جل کے پتنگ مل گیا

پھینکی جو سوے آسماں یار نے شب نگاہِ ناز　　ناوک آہ سے مرے اُس کا خدنگ مل گیا

میں ہوں اور اب فراق ہے، اور یہ بوریاے فقر　　جاتے ہی اُس کے خاک میں اپنا پلنگ مل گیا

مچھلی سے تم جو ہو گئے اس کے شکار، میری جاں　　اور ہی تم کو راہ میں کوئی نہنگ مل گیا

زلفوں کے بال یار کی، یا ہوے رخ پہ ہم عیاں　　یا یہ سپاہ روم سے لشکرِ زنگ مل گیا

لائے جو تم دوئی کا حرف، پھینک [1] میں مجھ سے درمیاں　　مجھ کو یقیں ہوا تمھیں کوئی اک انگ [2] مل گیا

سبز خطوں کی یاد میں ہم بھی ڈہیں چڑھا گئے　　وقتِ خمار اگر ہمیں ساغرِ بنگ مل گیا

کوٹا میں اُس سے مصحفی سینہ و سر کو خوب سا
کوچۂ یار کا مجھے جب کوئی سنگ مل گیا

1- پھینک = چوسر کی اصطلاح　2- انگ = عدد

74

یوں خاک میں فلک مجھے تو نے ملا دیا　گویا کہ ٹھیک خاک کا پتلا بنا دیا
نے نامہ، نے پیام، نہ قاصد ہے آفریں　تم نے تو یک قلم ہمیں جی سے بھلا دیا
افلاک پھنک رہے ہیں بہ رنگِ شفق، نہ جان　گردوں کو میری آہ نے لوکا[1] لگا دیا
ٹھوکر نے تیرے پانو کی اے سروِ خوش خرام　سوتے ہوؤں کو خوابِ عدم سے جگا دیا
اتنا مزاج اُس کا نہ تھا مجھ سے خشمگیں　پر اُس کو کچھ رقیب نے شاید سنگھا دیا
یاں تک ہے میرا پاس کہ اُس طفلِ شوخ نے　نامے میں میرے نام کو لکھ کر مٹا دیا
گرمی کہاں اب اِس میں کہ مثلِ چراغِ صبح　افسردگی نے دل ہی ہمارا بجھا دیا
میں اُس پری کا عاشقِ در پردہ تھا دریغ　بے طاقتی نے بیچ سے پردہ اُٹھا دیا
اب دل سے بے عصا نہیں اُٹھتی ہے آہ بھی　یاں تک تو ضعفِ قلب نے ہم کو بٹھا دیا
اے وائے بات کہتے جو رسوا میں ہوگیا　تو نے، نسیمِ صبح یہ کیا گل کھلا دیا؟
تھے وہ جو تشنۂ چشمۂ کوثر کے، بخت نے　لا اُن کو آبِ تیغ پہ تیری جھکا دیا
گو تیغِ عشق گر گئی، پر اُس نے چند روز　زخمِ الم کا مجھ کو مزہ تو چکھا دیا

مجھ سے رُکا ہوا تھا وہ گل، میں نے مصحفی
لے لے کے چٹکیاں اُسے آخر ہنسا دیا

75

جب سے ہوئی ہے اُس کو غیروں سے راہ پیدا　بے اختیار جی سے ہوتی ہے آہ پیدا
اس ربط سے تو اُن کے، مجھ کو گماں پڑے ہے　توأم ہوے ہیں شاید حسن و نگاہ پیدا
حیراں ہوں میں اُسی کا عاشق کے دل میں یارب　کیا شے ہے وہ کہ جس سے ہوتی ہے راہ پیدا
زانو پہ سر رہا ہے پہروں مصوّروں کا　تصویر تیری کی ہے تب رشک ماہ پیدا
عشقِ بُتاں سے دل پر پہنچا ہے کچھ تو صدمہ　ہوتا ہے خوں مژہ سے جو گاہ گاہ پیدا
سطحِ زمیں ہے گویا شطرنج کا سا عرصہ　ہوتے رہیں ہیں اُس میں اکثر وہ شاہ پیدا

1- لوکا = آگ کا شعلہ

آنکھوں کے تیرے کشتے مدفوں ہوئے ہیں جس جا		ہوتی ہے واں سے نرگس جاے گیاہ پیدا
محضر ہمارے خوں کا لکھوا کے ہم سے قاتل		کہتا ہے تو ہی کر اب اس کا گواہ پیدا
اِس شرم کا ٹھکانا کچھ بھی ہے، جوں مہِ نو		ہووے تو بعدِ ماہے طرفِ کلاہ پیدا
جلوے میں تھی فصاحت پیش از ظہورِ عالم		ہرگز ہوئی نہ تھی جب یہ جلوہ گاہ پیدا
اعمال نامۂ خلق سب طاق پر رہیں گے		جب روزِ حشر ہوگا روزِ سیاہ پیدا
اب تو چھپے پھرو ہو تب کیا کرو گے، مشفق		جب روزِ حشر ہوں گے سو داد خواہ پیدا

تہ سے زمیں کی تجھ کو کیا مصحفی خبر ہے
ہوتے ہیں روز یوسف یاں زیرِ چاہ پیدا

76

الفت سے تیرے دل میں ہو کیوں نہ راہ پیدا		سچ ہے کہ چاہ ہی سے ہوتی ہے چاہ پیدا
مہر و نشان کب تھا محضر پہ میرے خوں کے		ہوتا تو تب، کہ ہوتا اُس کا گواہ پیدا
گردوں کا توشہ خانہ کھولے کوئی تو اُس میں		ہوں اب بھی سرکشوں کے لاکھوں کلاہ پیدا
یوں آئینہ جو تیری آیا ہے روکشی کو		شاید ہوئی ہے اُس کو تابِ نگاہ پیدا

حیرت نے مصحفی کو لا کر دیا ہے واں چھوڑ
جس بادیہ میں مطلق ہووے نہ راہ پیدا

77

حالِ دلِ شوریدہ میں دامان پہ لکھا		باقی جو رہا تھا سو گریبان پہ لکھا
قرآن تھا رخسار ترا اور ترے خط نے		آتے ہی نیا حاشیہ قرآن پہ لکھا
دلچسپ تھا ازبسکہ ترا مطلعِ ابرو		صانع نے اُسی کو سرِ دیوان پہ لکھا
زخمی نے ترے تیر کے احوالِ دل اپنا		خوں نابِ جگر سے پر و پیکان پہ لکھا
قرصِ مہ و خورشید کے سب دست نگر ہیں		ہے رزقِ دو عالم اِنھیں دو نان پہ لکھا
بلبل نے اُسے جا کے پڑھا سامنے گل کے		جو شعر میں دیوارِ گلستان پہ لکھا

میدانِ وفا سے نہ ٹلے مصحفی عاشق
تھا قتلِ غریباں اِسی میدان پہ لکھا

78

اک دن جو پڑا نرگسِ خوش رنگ میں کیڑا پس ہی گیا مژگاں کی صفِ جنگ میں کیڑا
پردے میں سیہ بختی کے غم چابے ہے دل کو کھا جاوے ہے لوہے کے تئیں زنگ میں کیڑا
انگیا پہ سمندر کی ٹکے سبز ہیں پٹکے پہنچا ہے کہاں دیکھیو اِس رنگ میں کیڑا
عاشق کو غمِ عشق سے کیونکر نہ لگے گھن کرتا ہے سرایت جگرِ سنگ میں کیڑا
اے شوخ، تری زلف و بنا گوش کے آگے ٹلتا نہیں ریشم کا بھی پاسنگ میں کیڑا
جرأت پہ پتنگے کی مجھے آئے ہے حیرت یوں کود پڑا آتشِ نیرنگ میں کیڑا
ساون کے اندھیرے میں نہ نالاں ہیں یہ جھینگر دیجورِ جدائی سے ہے آہنگ میں کیڑا
ہنسنے کے لیے چاہیے کاغذ کا بنا کر دوں چھوڑ ترے جامۂ کم تنگ میں کیڑا
پانوؤں کے تو فندق نے مجھے کاٹ ہی کھایا بیٹھا تھا چھپا کیا گلِ اورنگ میں کیڑا

اے مصحفی تارے نہیں، روزن ہیں یہ ناداں
گردوں کے لگا نسخۂ فرہنگ میں کیڑا

79

یہ لال ہے فندق کا ترے انگ میں کیڑا بچھوؤں کا سدا جس سے ہے آہنگ میں کیڑا
منہ پھیر لیا خط سے تری زلف نے آخر کیا کیڑے مکوڑوں سے رہے جنگ میں کیڑا
یوں بھال ترے تیر کی ہے زخم میں دل کے ہو جیسے اگن[1] کے دہنِ تنگ میں کیڑا
جاں سخت ہو کیونکر غمِ افلاس سے ایمن یاں چوب سے زیادہ لگے ہے سنگ میں کیڑا
تاروں کی یہ مہندی ہے ترے ہاتھوں میں کافر یا یہ کہ لگا کاغذِ گُل رنگ میں کیڑا
لگتی تھی بھنبیری سی، نہ تھی ہم کو وہ پیاری جن روزوں کہ تھی دخترِ رز انگ میں کیڑا
چاندی کے یہ چھلے نہیں گویا کہ لگا ہے پوروں کی ہر اک فندقِ خوش رنگ میں کیڑا

1- اگن = ایک پرندہ

اے مصحفی کیڑے کی غزل اور لکھ ایسی
سن کر جسے پس جاوے دلِ سنگ میں کیڑا

80

ہے غم کا دھنسا یہ جو دلِ تنگ میں کیڑا　دن رات ہے کاوش ہی کی آہنگ میں کیڑا
بھسمنت[1] کیا سب کو مری آتشِ دل نے　پانی میں نہ کیڑا، نہ بچا سنگ میں کیڑا
پشّہ نے چکھایا ہے مزہ نیش زنی کا　نمرود کے جو تھا سرِ بے ہنگ میں کیڑا
نیرنگِ جہاں کچھ ہو، غمِ دل نہیں گھٹتا　کام اپنا کیے جائے ہے ہر رنگ میں کیڑا
اے نالہ نہ فریاد میں جھینگر کی خلل کر　کیا جانیے شاغل ہے کس آہنگ میں کیڑا
ہے قوت[2] ضعیفوں کا سوادِ سخن، اے دل　سطروں ہی کو کھا جائے ہے فرہنگ میں کیڑا
دیمک نے تو خاکا ہی کیا کاغذِ کردہ　ڈر ہے نہ لگے اب کسی نیرنگ میں کیڑا
برسات کے عالم کی تو کر سیر، کہ کیا کیا　ق　نکلے ہے ہر اک عالمِ نیرنگ میں کیڑا
پر بیر بھٹی[3] کے سوا میں تو نہ دیکھا　ہرگز کوئی اِس رنگ میں اس ڈھنگ میں کیڑا

اے مصحفی بچھوا[4] نہیں یہ پانو میں اس کے
پھرتا ہے لیے پنجۂ گل رنگ میں کیڑا

81

جاں اپنی توڑتا ہے کوئی جاں بہ لب، حنا　چلنا ضرور ہے دو قدم وقتِ شب حنا
آثار ہیں یہی تو شہیدانِ عشق کے　اس دستِ نازنیں پہ رچی ہے غضب حنا
باندھے وہ دست و پا تو بھلا تو نے، اب مجھے　مضمون باندھنے کا بتا کوئی ڈھب حنا
اک دن دیا نہ رنگ خوش اُس نے، تو یوں کہا　ہم عید کے بھی دن نہ لگاویں گے اب حنا

1- بھسمنت = بھسم، کشتہ　2- قُوت (بروزن سُوت) غذا　3- بیر بہٹی = ایک گہرے سرخ رنگ کا چھوٹا سا کیڑا　4- بچھوا = پانو میں پہننے کا زیور

آساں نہیں ہے زینتِ خوبانِ پردہ پوش　　دل لاکھ خون ہوتے ہیں لگتی ہے تب حنا
فرصت کہاں ملے تمھیں اپنے بناؤ سے　　ہر روز آئینہ ہے تو ہر ایک شب حنا
شاید کسی کا قتل ہے منظور یار کو　　ہاتھوں پہ روز لگتی نہیں بے سبب حنا
اہلِ عرب کا خون ہو کیوں کر نہ مصحفی
ہر پور کو کرے ہے یہ رنگِ رطب[1] حنا

82

یہ خوب رُو لگاتے نہیں بے سبب حنا　　رکھتی ہے اپنی تہ میں چھپے لاکھ ڈھب حنا
آخر کو سر میں پانو پہ اُس بت کے رکھ دیا　　پھینکا یہ تو نے مجھ پہ تو جادو عجب حنا
کوٹھے پہ چڑھ کے جان، نہ انگڑائی لو کہیں　　ہمسایگاں کے سر پہ نہ لاوے غضب حنا
بوسے کا احتمال نہ ہوتا اُسے تو میں　　پانوؤں کی اُس پری کے چراتا بہ لب حنا
آتا ہے مجھ کو غصہ، تری کیا بری ہے خو　　رہتی ہے چمٹی اس سے تو کیوں روز و شب حنا
آنکھوں کو رکھ کے پانو پہ اس بت کے مصحفی　ق　جوں ہی لگا چھڑانے میں پانوؤں سے شب حنا
اک لات مار اتنی ہی حرکت پہ بولے وہ　　چل دور، یوں چھڑاتے ہیں او بے ادب حنا

83

لگائی پوروں پہ اُس نے گنڈیری دار حنا　　کہ دیوے نیشکرِ سرخ کی بہار حنا
میں مر بھی جاؤں تو اے گل یہی وصیت ہے　　چڑھائیو تو مرے بر سرِ مزار حنا
بجائے شست جب ان انگلیوں کو دیوے تو زیب　　نہ ہووے تیرِ ادا کیو نکے دل سے پار حنا
دکن کی شکل ہر انگشت اس لیے ہے تری　　کہ ان سے کھیلے ہے مچھلی کا یہ شکار حنا
وہ بُندکیاں جو کفِ دست کی دکھاتا ہے　　فلک پہ کرتی ہے تاروں کو بے قرار حنا
ہمارے آبلۂ دل کو تیرے ہاتھوں کی　　ملی، و لیک بصد داغِ انتظار حنا

1- رَطَب = تازہ کھجور

مجھے تو تیرے نصیبوں پہ رشک آتا ہے ۔۔۔ تُو ایسے ہاتھوں سے کیونکر ہوئی دوچار حنا
بجائے مرہم اُسے اپنے زخم پر باندھے ۔۔۔ جو پاوے ہاتھوں کی تیرے یہ دل فگار حنا
کہاں نصیب ہیں ایسے کہ اپنے ہاتھوں سے ۔۔۔ اُن انگلیوں پہ لگاوے یہ خاکسار حنا

بہ وصف بے گنہی مصحفی سمجھتے ہیں
ہمارے خون کو یہ اہلِ روزگار حنا

84

باطن میں اُس کو مجھ سے سروکار ہی رہا ۔۔۔ موذی رقیب درپئے آزار ہی رہا
واں اک ذرا زبان نہ ہلی نامہ بر کی، اور ۔۔۔ یاں کلکِ شوق بر سرِ گفتار ہی رہا
مثلِ گلوے شیشۂ کم مے، بہ دورِ حسن ۔۔۔ گردن پہ اپنی رشتۂ زنار ہی رہا
دستِ شکستہ اپنا نہ پہنچا کبھی دریغ ۔۔۔ واں طرفِ دوش بر سرِ دستار ہی رہا
اُس کی پڑی نہ آنکھ خط و خال پر ترے ۔۔۔ کبکِ دری تو رفتۂ رفتار ہی رہا
آنے کہا تھا ایک شب اُس پُر فریب نے ۔۔۔ وعدے پہ ساری رات میں بیدار ہی رہا
اک دم ہوئی نہ مرغِ چمن کی زباں خموش ۔۔۔ مضمونِ خوں چکاں سرِ منقار ہی رہا
دل کی شکن درست نہ کی، تم کو منعمو ۔۔۔ فکرِ شکست بندیِ دیوار ہی رہا
یوسف کہاں، کہاں وہ زلیخا، کہاں وہ مصر ۔۔۔ سودا نہ وہ ، نہ اُس کا خریدار ہی رہا
بقراط سے بھی کچھ نہ دوا اُس کی ہو سکی ۔۔۔ بیمارِ چشمِ یار تو بیمار ہی رہا
اپنی تو بوسۂ کفِ پا پر پڑی نہ آنکھ ۔۔۔ ہم کو تلاشِ بوسۂ رخسار ہی رہا
آمرزشِ گناہِ محبت نہ ہو سکی ۔۔۔ دن حشر کے بھی میں تو گنہگار ہی رہا
گرتے رہے مژہ سے جو نت پارۂ جگر ۔۔۔ پھولوں کا اپنے سامنے انبار ہی رہا
ہرگز نہ اُس کے حسن میں آئی ذرا کمی ۔۔۔ خط آئے پر بھی وہ تو طرح دار ہی رہا

اب تک نہ شوقِ حسن گیا مجھ سے مصحفی
میں عمر بھر بتوں کا پرستار ہی رہا

85

وہ کافر جس گھڑی پہنے گلے میں ہار پھولوں کا
ڈسے کیونکر نہ میرے دل کو پھر یہ مار پھولوں کا

گر اُس گل بن کبھی پہنا ہے ہم نے ہار پھولوں کا
تخیل میں ہمیں ڈسنے لگا وہ مار پھولوں کا

ہمیں اک پنکھڑی بھی باغباں گل کی نہیں دیتا
بہ حسرت منہ تکا کرتے ہیں ہم ناچار پھولوں کا

متاعِ صبرِ بلبل کیوں نہ ہاتھوں ہاتھ اُٹھ جاوے
خریدار اُس کے گل ہیں اور ہے یاں تار پھولوں کا

مجھے تو باغ میں آنے کی رخصت ہی نہیں گل چیں
لگایا تو نے گو تودہ پسِ دیوار پھولوں کا

کوئی افسوں نہ پڑھ کر ان پہ کچھ اُس کو سنگھا دیوے
فراست کے سبب ہے خود اُسے انکار پھولوں کا

مجھے حیرت یہی ہے آہ، جب فصلِ بہار آئے
یکا یک سرخ ہو جاتا ہے کیا رخسار پھولوں کا

کوئی بلبل منش دیکھے اُسے گر چشمِ موسیٰ سے
کم از طورِ تجلّی بھی نہیں انبار پھولوں کا

مری بالیں پہ یہ ہو یا نہ ہو گل چاہیے لیکن
کہ یہ بیمار دل ہے مصحفی بیمار پھولوں کا

86

سلوک دیکھ کے حیراں ہوں تیغِ قاتل کا　　کہ بند بند جدا کر دیا ہے بسمل کا

جو کوئی جاوے ہے خوں میں نہا کے آوے ہے　　کچھ ان دنوں میں یہ ہے رنگ اُس کی محفل کا
ہماری خاک پہ بو دیجیو کوئی وہ نخل　　کہ اُس پہ نکلے اک انداز سرو مائل کا
خدا کے واسطے رکھ اب تو ہاتھ سے تلوار　　بدن تو چور ہے زخموں سے تیرے گھایل کا
گئے جو یار عدم کو سو وہ گئے ہی گئے　　سراغ کچھ نہ ملا ہم کو اُن کی منزل کا
ہزار حیف کہ دنیا سے جانے والوں کو　　ہے بعدِ مرگ بھی کھٹکا مقام و منزل کا
یہ گرد باد ہے کیا خاکِ قیس سے جس کو　　لیے پھرے ہے بیاباں میں شوق محمل کا
وہ موج اُٹھتی نہیں بحرِ اشک سے اپنی　　کہ موتیوں سے نہ دامن بھرے وہ ساحل کا
قفائے ناقہ ترے کون ہے یہ اے لیلیٰ　　ذرا تو جھانک تو پردہ اُٹھا کے محمل کا
سراغِ گوہرِ مقصود بھی نہ اس کو ملا　　اسی سبب تو گریباں ہے چاک ساحل کا
اگرچہ سیکڑوں مجروح نے شفا پائی　　بھرا نہ گھاؤ تری انکھڑیوں کے گھایل کا
نظر پڑے ہے بہ شکل سپند میگوں ہائے　　یہ رنگ ہے ترے عارض پہ اب ترے تل کا

چڑھے ہے مصحفی منہ اُس کی تیغِ ابرو کے
کچھ ان دنوں میں مگر سر پھرا ہے جاہل کا

87

وہ قد ہے کہ یا رب قیامت کا ٹکڑا　　یہ دل ہے کہ صحرائے وحشت کا ٹکڑا
گدا پیشہ قانع ہے اک برگ پر ہی　　چپے ہے اُسی کو ریاضت کا ٹکڑا
فلک یہ روا ہے پھرے مارا مارا　　زمیں پر مرے سنگ تربت کا ٹکڑا
کفِ دوست سے ربع ناں بھی بہت ہے　　ہے قرصِ مثلّث محبت کا ٹکڑا
مجھے کعبے والوں سے مطلب نہیں کچھ　　پھریں وہ لیے گو زیارت کا ٹکڑا
یہ آئینۂ دل مرا جب سے ٹوٹا　　ہر اک لختِ دل ہے سو حیرت کا ٹکڑا
فلک اک مہینے میں دوڑا کے دے ہے　　مہِ آسماں کو بھی ذلّت کا ٹکڑا

نہ اے دل، عبث سگ دَوی[1] کی ہوس کر   جو ہاتھ آوے تیرے قناعت کا ٹکڑا

زباں مصحفی کے نہیں منھ میں، گویا
رکھا ہے خدا نے فصاحت کا ٹکڑا

88

عاشق ترا صنم شبِ فرقت میں مر گیا   اچھا ہوا کہ تیری ہی چاہت میں مر گیا
جانا نہ تو نے ترک کیا گھر کا غیر کے   اور میں شکستہ پا اسی غیرت میں مر گیا
بونا روا ہے بید کا نخل اُس کی خاک پر   جو خاک بوس کی تری حسرت میں مر گیا
شیریں سے کہیو جا کے صبا، آج کوہ کن   اک تیشہ مار کے تری الفت میں مر گیا
کچھ ہو سکی نہ مجھ سے تواضع جو یار کی   آیا تو وہ، پہ میں اسی خجلت میں مر گیا
کل اُس نے جوں ہی ناک چڑھائی رقیب سے   کم حوصلہ تھا، اتنی ہی نفرت میں مر گیا
بیٹھا جو آ کے بزم میں وہ بادشاہِ حسن   غصے میں کوئی، کوئی عنایت میں مر گیا
آوارہ دشت دشت پھری اُس کی خاک بھی   مجنوں ترا جو عالمِ وحشت میں مر گیا

جب تک جیا ترے ہی تصور میں مصحفی
جب مر گیا تری ہی محبت میں مر گیا

89

آہ ہمراز کون ہے اپنا؟   بختِ ناساز کون ہے اپنا؟
کس کے کہلائیں ہم، کہ تیرے سوا   بتِ طنّاز، کون ہے اپنا؟
بات کہہ دے ہے وہ تہِ دل کی   ایسا غمّاز کون ہے اپنا؟
لے اُڑے تو ہی گر نہ ہم کو تو پھر   شوقِ پرواز، کون ہے اپنا؟
وصل ہوتا نہیں، نہیں معلوم   خلل انداز کون ہے اپنا؟
بولا دیکھ آئینہ وہ حیرت سے   چہرہ پرداز کون ہے اپنا؟

1- سگ دَوی = کتے کی طرح دوڑنا

گو کہ آنکھیں لڑائیں ہم اُس سے یاں نظر باز کون ہے اپنا؟
شبِ فرقت میں جز دمِ قلیاں[1] یار دم ساز کون ہے اپنا؟
بے نیازی کرے جو تو ہی تو پھر اے ہمہ ناز کون ہے اپنا؟
مصحفی ہم ہیں اور تنہائی
سچ ہے انباز کون ہے اپنا؟

90

ہر چند کہ تھا قابلِ دیدن بدن اُس کا پر آنکھ نہ ٹھہری جو کھلا پیرہن اُس کا
تیکھا ہو اکڑتا ہے بہت افعیِ پیچاں زلفوں نے تری دیکھ لیا بانکپن اس کا
فریاد کرے کیونکے نہ کوئی کہ کنویں میں دل کھینچے لیے جائے ہے خالِ ذقن اس کا
ہر چند کہ بوسے کا ہوا یار کے مائل کھنچتا ہی رہا میرے دہن سے دہن اس کا
جس وقت رخِ یار سے اُٹھ جائے ہے پردہ منہ تکتے ہیں حیرت سے کھڑے مرد و زن اس کا
لاشے سے ترے کشتے کے جاری ہے جواب تک کس طرح نہ ہو جائے شہیدی کفن اس کا
کس دستِ حنائی نے جلایا ہے مرا دل اُٹھتا ہے دھواں سرخ، دمِ سوختن اس کا
جوں جوں میں وفا کی، وہ ہوا ظلم کا مائل عالم سے نرالا نظر آیا چلن اس کا
ہے اور ہی لوگوں کا بہ جاں مصحفی بندہ
کیا دخل ہے دل لے تو سکے ہر بچن اس کا

91

ہے دل پہ نمک پاش لبِ خندہ زن اس کا چڑ ائے نہ کس طرح سے زخمِ کہن اُس کا
دل لے جو گیا ہے بہ دَغا ان کے وہ پُرفن گھر پوچھتے پھرتے ہیں سبھی مرد و زن اُس کا
رکھ دو تہِ گلبن قفسِ مرغِ گرفتار گر نالہ سنا چاہے ہے مرغِ چمن اُس کا

1- قلیان = حقّہ

خونخواری و خنجر زنی و عربدہ جوئی ناخن میں رکھے ہے کفِ شمشیر زن اُس کا
وصل اُس کا نہ ہوگا، یہ نجومی نے کہا تھا اب تک مجھے یاد آئے ہے سچا بچن اُس کا
لے چلتے تھے ہم کفش کو اس گل کی بغل میں ہم ساتھ تھے اک راہ پہ جب تھا چلن اُس کا
بیماریِ رشتہ کی یہ عیسیٰ نے دوا کی بازو سے مرے باندھ دیا نورتن اُس کا
ہیں صاحبِ اقبال وہی لوگ جہاں میں راتوں کو میسر ہے جنھیں چٹ لگن اُس کا
مت مصحفیِ زار کا ذکر اُس سے کرو کچھ
ہے دشمن جاں وہ بتِ پیماں شکن اُس کا

92

چاہے ہے جس جگہ ہو دیدارِ چشم پیدا رخنوں سے واں کرے ہے دیوارِ چشم پیدا
لالے ہی کی کلی کو جھک جھک کے دیکھا کیجے معشوق ہو نہ جس جا بیمارِ چشم پیدا
کر کے بناؤ آوے گر باغ میں وہ گل رُو نرگس صفت کرے واں ہر خار چشم پیدا
دیدار کی تمنا کافر کو ہو جو ساقی شیشے کی بھی کرے ہے زنّار چشم پیدا
ہر ذرّے میں عیاں ہے وہ آفتابِ تاباں گر سوچ ہے تجھے کر، اے یار چشم پیدا
سو بار گر جلا کر سو بار مجھ کو ماریں تربت سے میری ہووے ہر بار چشم پیدا
چھپ چھپ کے کس کی خاطر رویا ہے مصحفی تو
پنہاں کرے ہے تیری خوں بار چشم پیدا

93

جس طرح دل میں مرے ہے یہ محبت پیدا یارب اُس کو بھی تو ہووے مری الفت پیدا
تیرے عاشق کو جہاں قتل کیا تھا لاکر اب تلک ہوتی ہے اُس خاک سے وحشت پیدا
مجھ پہ ایام بہاراں کا ہے احسان بڑا کہ نہیں، سبزہ و گل میں مری تربت پیدا
تھا تصور ترے سینے کا مقابل کہ ہوئی ناگہاں سامنے سے صبحِ قیامت پیدا

پھر لگا نالہ مرا سوے ثریّا جانے	آہ پھر کی دلِ مجروح نے طاقت پیدا
چشم سے لختِ جگر نکلے تو کیا اس کا عجب	سنگ سے لعل کرے ہے تری قدرت پیدا
ہوں تو مدفوں ترے کوچے، میں پہ تربت سے مری	اب تلک بھی ہے وہی سبزۂ حیرت پیدا
جنس اچھی نہیں اے مصحفی جاتی ضائع
اک نہ اک وقت وہ کر رہتی ہے قیمت پیدا

94

آنکھیں وہیں بھر آئیں جس دم خیال گزرا	جانے سے تیرے بے حد جی پر ملال گزرا
گو چلتے چلتے مجھ کو تسکیں تو دے گیا لیک	اِس بے قرار دل پر صدمہ کمال گزرا
تعویذِ سینہ بھیجا اُس ماہ نے جو مجھ کو	چھاتی پہ دشمنوں کی اس کا بھی سال گزرا
گل پھاڑیں ہیں گریباں نوچے ہے بال سنبل	شاید چمن میں کوئی آشفتہ حال گزرا
بادِ صبا تو آئی کوچے سے اُس کے روتی	تو تو بتا کہ تجھ پر کیا اے شمال[1] گزرا
مجلس میں اُس کی اب تو دربار سا لگے ہے	اِس کا سوال گزرا اُس کا سوال گزرا
مجھ کشتۂ حنا پر روتا گیا وہ خوں ہی	تربت پہ میری کوئی بادل جو لال گزرا
ابرو کے کشتگاں کا ستھراؤ تھا جہاں واں	ہر استخواں نظر میں شکلِ ہلال گزرا
کتنے کمند بر کف واں زیرِ بام دیکھے	کوچے سے اُس کے جس شب ہو کوتوال گزرا
جس دن تو بام پر تھا، خورشید آسماں پر	وہ روز بھی قیامت روزِ زوال گزرا
آنکھیں اُٹھا کے اس نے میری طرف نہ دیکھا	اس آرزو میں مجھ کو روزِ وصال گزرا
چتون سے اس کی اس نے ہرگز نہ آنکھ پھیری	جی جان سے ہی اپنی آخر غزال گزرا
اس رات مصحفی کو ٹوکا کسی نے شاید
سر ڈالے اُس گلی سے جو یہ نڈھال گزرا

1- شمال = بادِ شمال

95

وہ آرزو نہ رہی اور وہ مدعا نہ رہا ہمارے آپ کے ہرگز وہ ماجرا نہ رہا
سرِ نیاز رہا زیرِ پاے یار مدام حنا کی طرح میں قدموں سے کب لگا نہ رہا
دل آشنائی کو چاہے کسی کی خاک مرا کہ آشنا جو ہوا تھا وہ آشنا نہ رہا
ہمیشہ جس سے پہنچتا رہے تھا دل کو الم ہزار شکر کہ وہ دردِ بے دوا نہ رہا
جب آپ ہم نے بتاں ترک آشنائی کی کسی بھی طرح کا تم سے ہمیں گلا نہ رہا
گلوں کے چہروں پہ زردی سی پھر رہی ہے تمام گئی بہار وہ موسم کا ابتدا نہ رہا
صفاے سینہ سے پھسلا نہ کب دلِ عاشق کہ چاہِ ناف میں وہ خوں گرفتہ جا نہ رہا
ہزار حرفِ زباں سوز درمیاں آئے ہے سچ تو یہ کہ محبت میں وہ مزا نہ رہا
چمن کو چھوڑ ہم ایسے چلے گئے سوے دشت کہ نام کو بھی پھر اندیشۂ صبا نہ رہا
یہ کس کے چاہ زنخداں کی فکر میں ڈوبا تمام رات جو زانو سے سر جدا نہ رہا
عجب نہ جان گر آجائے سلطنت کو زوال کسی کے سر پہ سدا سایۂ ہُما نہ رہا

نشانِ مصحفیِ خستہ پوچھتے کیا ہو
وہ خاکِ راہ تو اب مثلِ نقشِ پا نہ رہا

96

میں خیال زلفِ نگار سے شب ہجر میں جو دوچار تھا
وہ خیال آنکھوں کے سامنے کبھی عقرب اور کبھی مار تھا

وہ جو برق ہو کے چمک گیا، وہ جو ابر ہو کے برس گیا
وہ مرا ہی شعلۂ آہ تھا، وہ مرے ہی دل کا بخار تھا

تو رہا تھا مجلسِ غیر میں جو شبِ گزشتہ تو صبح دم
مجھے آہ سینہ سے کوفت تھی، تجھے رنج شب سے بخار تھا

نہ ملی فراغتِ زندگی کبھی آہ و نالے سے اک گھڑی
مجھے ساری عمر دہا[1] رہا، کہ میں غم میں تعزیہ دار تھا

میں گیا تھا خاک میں گو کہ مل، مرے بر میں تڑپے تھا مرغِ دل
مری قبر سے جو اُٹھائی سل تو تمام سینہ فگار تھا

گیا نیچے وہ لیے اُدھر کہ میں اُس کو دیکھوں تو، ہے کدھر
کہیں نیم کشتۂ ناز کا جو قریب اُس کے مزار تھا

غزل ایک اور بھی مصحفی، میں لکھی ہے میر کی بحر میں
میں کہے تھا آگے بھی شعر پر، نہ یہ گرچہ میرا اشعار تھا

97

پسِ قافلہ جو غبار تھا کوئی اُس میں ناقہ سوار تھا
ابھی گرد باد ہو اُڑ گیا وہ عجب طرح کا غبار تھا

میں نگاہِ پاک سے دیکھے تھا، ترے حسن پاک کو اس پہ بھی
مرے جی میں خواہش وصل تھی، مرے دل میں بوس و کنار تھا

دلِ خستہ پہلو میں رہ گیا مرے سرد ہو کے، تو کیا عجب
کہ کسی کی صافیِ شَست کا یہ خدنگ خوردہ شکار تھا

مری بے کسی پہ تری نظر نہ پڑی جب اے بُتِ عشوہ گر
وہ جو تیرا عہدِ شباب تھا سو وہ عین جوشِ بہار تھا

میں مزار کو بھی مٹا دیا، میں غبار کو بھی اُڑا دیا
کہ تری صفائے مزاج پر مری خاک سے بھی غبار تھا

اس ادا سے تیر لگاوے تھا، تو بہ روے تودۂ مُشتِ گل
کہ فلک بہ تیغ و کمان بھی، ترا محوِ کند و کدار تھا

1- دَہا = دس دن یعنی عشرۂ محرم

یہ جنوں کی عقدہ کشائیاں کوئی بھولتا ہوں میں مصحفی
کہ بہ روے ہر سرِ آبلہ وہی ناخنِ سرِ خار تھا

98

ذقن، رخسار، لب، بینی ہے زیبا حال چاروں کا
رکھے ہے داغِ حسرت قرعۂ رمّال چاروں کا

لٹیں دو دو جو ان زلفوں میں مشاطہ نے رکھی ہیں
کمند اندازِ صیدِ دل ہے ہر اک بال چاروں کا

نہ دل سمجھے، نہ جاں سمجھے، نہ آنکھیں گریے سے باز آئیں
جدائی میں ہوا ہے تھامنا اشکال چاروں کا

ہیں اس پر گرمِ جولاں عشق و رشک و حسرت و حرماں
غبار اپنا ہے تیری راہ میں پامال چاروں کا

نہ ہاتھ اُٹھے گریباں سے، نہ پانو اُٹھیں بیاباں سے
جنون و عشق میں یہ کچھ ہے اب احوال چاروں کا

جبیں، رخسار، غبغب اور ذقن جب خوانِ نعمت ہوں
بہ حسرت منھ تکے کیوں کر نہ ہر کنگال چاروں کا

نریماں بچ گیا اس سے نہ سام و زال، نے رستم
کیا تیغِ نگاہِ یار نے منھ لال چاروں کا

دو ابرو تو نے بالاے دو ابرو جو بنائے ہیں
ہے اپنے سر پہ احساں اے پری تمثال چاروں کا

رقیب و وارث و مشاّطہ و ہمسایہ دشمن ہیں
لگا رہتا ہے اپنے جی کو نت جنجال چاروں کا

کہاں تک خاک و باد و آب و آتش میں پھنسے رہیے
شتابی آ اجل تا جائے مٹ جنجال چاروں کا

صفِ مژگاں سے تیری ہم نے کیا کیا زخم اُٹھائے ہیں
غرض اب تک جگر پر ہے ہمارے سال چاروں کا

جگر میں داغ جو ہیں مصحفی لالے کے چَو پہلو[1]
بہارِ عشق کی دولت ہے چہرہ لال چاروں کا

99

اس کے کوچے کی طرف تھا شب جو دنگا آگ کا — آہ سے کس کی پڑا تھا واں پتنگا آگ کا
جنگ ہے کس آتشیں خو سے جو رہتا ہے مدام — تیغِ عریاں کی طرح ہر شعلہ ننگا آگ کا
توشے دانوں میں بھرے رہتے ہیں ان کے کارتوس — اس لیے خطرہ رکھے ہے ہر تلنگا[2] آگ کا
تہ سے اُس کی سرخ ہو کر کب نہ نکلی موجِ برق — کب شفق نے خوں میں پیراہن نہ رنگا آگ کا

شمع کے شعلے پہ موقوف اس کا جل جانا نہیں
مصحفی جس جا ہو عاشق، ہے پتنگا آگ کا

100

کب بوسہ چیں ہوئی وہ رخِ گل سے اے صبا — کاوش عبث کرے ہے تو بلبل سے اے صبا
قطرہ اگر گرا قدحِ مُل سے اے صبا — ملنے نہ دیں گے ہم تجھے پھر گل سے اے صبا
درہم نہ ہوں میں رشک سے کیونکے کہ روز و شب — لے کامِ دل تو یار کی کاکل سے اے صبا
جا، سنبل و بنفشہ کی گلشن میں لے خبر — کیا کام تجھ کو طرّہ و کاکل سے اے صبا
جب کیاریوں پہ باغ کی تو اس روش پھرے — موتی جھڑیں نہ طرۂ سنبل سے اے صبا
مشتاقِ پائے بوسیِ گل تھی ہماری خاک — پہنچی چمن میں تیرے توسل سے اے صبا

1- چَو پہلو = چاروں پہلو 2- تلنگا = سپاہی

چٹکے ہے گو گلاب چمن میں تو کیا کریں　ہم آپھی غش ہیں شیشۂ قلقل سے اے صبا
کیا کیجے آہ شکوۂ گل، سب بگڑ گیا　اپنا تو کام صبر و تحمل سے اے صبا
کیا کیا اسیر سر کو پٹک اپنے مر گئے　کنجِ قفس میں تیرے تغافل سے اے صبا
نازک دماغِ عشق کے آتی ہے دل پہ کوفت　گلشن میں آبشار کے غلغل سے اے صبا

یہ مصحفی کی خاک ہے جاے ادب، یہاں
رکھیو ذرا قدم تو تامل سے اے صبا

101

کر تو ہی رفتگی مرے قاتل سے اے صبا　حد بے خبر ہے اپنے تو بسمل سے اے صبا
تو نے یہ کیا کیا کہ بہت دور جا پڑی　کشتی ہماری قربتِ ساحل سے اے صبا
غنچہ نہیں کہ دم میں تو آنکھوں کو کھول دے　عاشق کے عقدے کھلتے ہیں مشکل سے اے صبا
مجنوں کی مشت خاک کو لے کر کے آفریں　جا ہی لگی تو صاحبِ محمل سے اے صبا
ایسا نہ ہو کہ تجھ پہ پڑے اس کی برقِ حسن　بچیو ٹک اُس کے پردۂ حائل سے اے صبا
آنے میں رات دیر ہوئی تجھ سے کیا مگر　الجھی تھی تو کسی کی حمائل سے اے صبا
تا سیرِ باغ ہم تو ترے ساتھ تھے دریغ　پر تو نے کی نہ ہم نفسی دل سے اے صبا
سنبل سمجھ کے اس کے نہ نزدیک آئیو　اک دود سا اُٹھے ہے مرے دل سے اے صبا
وا کر دے اب تو روزنِ دیوار یار کو　پَر تیری جا کے ساتھ، نہ کہگل سے اے صبا
کلیاں تو مارے شرم کے لب کھولتی نہیں　کچھ تو ہی کہہ دے باغ کے سائل سے اے صبا

ٹک منع کر دے ان کو کہ گلشن میں مصحفی
ہے بے دماغ شورِ عنادل سے اے صبا

102

دریا پہ وہ رخ جوں شبِ مہتاب میں چمکا　اک کوند ہو بجلی کی سی، جا آب میں چمکا

آبِ چہ سیماب ہوا معدنِ اکسیر — کندن سا ترا حسن جو سیماب میں چمکا
عاشق کا ترے لختِ جگر سجدے کے دم بھی — ہو لعلِ کنگرہ خم محراب میں چمکا
تھا بند ازار اُس کے کا، جو قرصِ مرصع — مہتاب ہو پاجامۂ کم خواب میں چمکا
جوں روے سپید اپنے پہ شب اشک رواں تھے — اس طرح نہ جگنو کبھی مہتاب میں چمکا
کیوں جاگتی جوت اُس کو نہ کہیے کہ ترا نور — پیشِ نظرِ خفتہ اگر خواب میں چمکا
مرقد سے اُٹھا جب وہ تو اُس شخص کا چہرہ — خورشیدِ قیامت کی تب و تاب میں چمکا

اے مصحفی اس بحر کو کر کر کے بنہٹی
اک شب تو ذرا محفلِ احباب میں چمکا

103

جوں اشک کا موتی شبِ مہتاب میں چمکا — یوں دیدۂ ماہی نہ کبھی آب میں چمکا
کس عاشقِ مضطر کا یہ خوں دست و بغل تھا — جو برق ہو خنجر کی ترے تاب میں چمکا
جو شمع ہے کعبے کی وہی نور کا شعلہ — قندیلِ صنم خانہ کی محراب میں چمکا
مانندِ شبیہِ تہِ آئینہ، ترا حسن — اے رشک پری، اور بھی سیماب میں چمکا
پھر پار کلیجے کے لگی ہوک سی جانے — پھر دردِ شبینہ دلِ بیتاب میں چمکا
کشتے کا تری برچھی کے جس خاک میں خوں تھا — آخر ہو علم لالۂ سیراب میں چمکا
گرد آئینے میں جلوہ ترے حسن کا کافر — جوں عکسِ مہِ چاردہ گرداب میں چمکا

اے مصحفی پھر کرنے لگا شعلہ زبانی
پھر شعر ترا مجلسِ احباب میں چمکا

104

زینتِ گوشِ یار ہے سبزا — آفتِ روزگار ہے سبزا
خواہشِ بوسۂ عذار کے بیچ — رات دن بے قرار ہے سبزا

چشم کی جُو پہ میری مژگاں کا شیشۂ آب دار ہے سبزا
دلِ بلبل فگار کرنے کو غنچۂ خاردار ہے سبزا
گل کی پتّی ہے، یا یہ زمرۂ گوش جس سے باغ و بہار ہے سبزا
چل چمن کو کہ مینھ گیا ہے برس ق مصحفی بے غبار ہے سبزا
صبح دم سیرِ گلشن اُس پر کر
کیا مرصّع نگار ہے سبزا

105

تمھاری میٹھی چاہت نے تو اپنا جی جلا ڈالا نہ جیتوں میں رکھا ہم کو نہ مُردوں میں ملا ڈالا
نہ تھا یہ دفن کے قابل تو چیلوں کو دیا ہوتا فلک، لاشہ مرا کیوں تو نے نہروں میں بہا ڈالا
رکھی ہے اب خبر، ساقی کہاں ہے اور کدھر مینا ہمیں تو ایک ہی پیالے کی گردش میں چھکا ڈالا[1]
شفاعت یوں ہی بارے ہوگئی جرمِ محبت کی تصور نے جو مجھ کو شب ترے قدموں پہ لا ڈالا
جراحت عشق کی گو خلق کے طعنوں سے تازہ تھی نمک پاشی نے تیری اور بھی ان میں مزا ڈالا
خدا کے واسطے، اے دل، نہ اتنی بے قراری کر ترے نالوں نے تو عرشِ معلیٰ کو ہلا ڈالا
خزانہ چاہیے قاروں کا اپنے خرچ کرنے کو دیا جو کچھ کسی نے ہم کو بس ووں ہی اُٹھا ڈالا
جدائی سے تمھاری دل پر اپنے یہ قلق گزرا کہ گویا دیدۂ یعقوب سے یوسف چھپا ڈالا
کیا دل کو ہمارے اور ڈور اپنی کلائی پر صنم پہنچے میں اپنے تم نے جو ڈورا نیا ڈالا
کفِ افسوس ملنے کی جگہ ہے یہ کہ کاجل دے تری آنکھوں نے جادو مجھ پہ کافر برملا ڈالا
رہی ہے زندگی تھوڑی سی شمعِ آخرِ شب میں ہمیں تو سوزِ غم نے آہ سر تا پا جلا ڈالا
ہماری نعش پر ابرِ بہاری رو گیا آکر نہ تم نے تو صنم اک آدھ آنسو بھی بہا ڈالا
سیہ بختی کا اپنی میں بیاں شب اُس سے کرتا تھا وہیں پر لا کے آنسو کا جل آنکھوں کا مٹا ڈالا

1- چھکانا (بروزن بھگانا) سیراب کرنا

جو نقشا وصل کا کھینچا میں شب کلکِ تصور سے اسے بھی بے خودی نے آ کے ہاتھوں سے مٹا ڈالا
خدا کے واسطے موقوف کر اس قصہ خوانی کو تری بک بک نے تو ناصح، ہمارا سر پھرا ڈالا
وہ سرکھپ[1] ہیں کہ ہم نے مصحفی کوے محبت میں
قدم جوں ہی رکھا بس آپ کو وو ہیں کھپا ڈالا

106

لعلِ جاں بخش نے جب رنگِ سخن دکھلایا ایک ہی بات میں عیسیٰ کو یمن دکھلایا
داورِ حشر کو صد چاک کفن دکھلایا تیرے کشتے نے جو مجروح بدن دکھلایا
واشدِ دل کو جو دریا پہ گئے ہم تو ہمیں آب نے بھی رخِ پُر چیں و شکن دکھلایا
گہ ملے خاک میں، گہ خاک سے برباد ہوئے تیری رفتار نے کیا کیا نہ چلن دکھلایا
چہرہ مہتابی[2] سے اُس کا جو ہوا زرد و سپید اک جگہ عالمِ صد برگ و سمن دکھلایا
گریۂ شمع نے طوفاں یہ کیا رات کہ بس چرخ میں صورتِ گرداب و لگن دکھلایا
کام کیا تھا مجھے یاں آنے سے اے مرغِ چمن تیری فریاد نے پھر روے چمن دکھلایا
صید حسرت میں رہا کھا کے تری شست کا تیر تو نے منھ اُس کو نہ اے صید فگن، دکھلایا
جب رکھا اُس کو لحد میں تو ترے سوختہ نے ایک شعلہ سا ہمیں زیرِ کفن دکھلایا
یہ بھی احساں ہے فلک کا جو مجھے خواب کے بیچ دیا یاروں سے ملا، اپنا وطن دکھلایا
مصحفی بر سرِ تقریر جو آیا وہ شوخ
ہر سخن میں مجھے اندازِ سخن دکھلایا

107

نہانے میں بھی ہے اُس کو حجاب درتۂ آب رکھے ہے بالوں سے منھ پر نقاب درتۂ آب

1- سرکھپ = سرکھپانے والے، جاں باز 2- مہتابی = چاندنی

قدم رکھا جو میں دریاے آشنائی میں ہر ایک جا نظر آیا سراب در تہِ آب
یہ تیرے حسن نے دریا کے بیچ آتش دی کہ ماہیوں کے ہوئے دل کباب در تہِ آب
ہر ایک موج جو ساحل سے سر پٹکتی ہے کسی کے دل کو تو ہے پیچ و تاب در تہِ آب
جھلک بدن کی ہے تیرے یہ رختِ آبی[1] میں کہ جیسے جلوہ کرے آفتاب در تہِ آب
کیا جولاہی کی انگیا کو اُس نے زیبِ بدن تو صاف آئے نظر دو حباب در تہِ آب
نکل چلا تھا ترے بے قرار کا لاشہ رکھا بھنور نے اُسے داب داب در تہِ آب
جب اُس نے آلبِ ساحل پہ، وا کیا سینہ رہی نہ پنجۂ مرجاں کو تاب در تہِ آب
نہ غوطہ مارے ہے چھپ چھپ نہانے والوں سے وہ آپ دیکھے ہے اپنا شباب در تہِ آب
خبر ہے کیا تجھے قہرِ خدا کی، یوناں میں ہزار خانہ ہیں اب تک خراب در تہِ آب
شگفتہ روئیِ انجم جہاں ہے بحر پہ واں کِھلا رہے ہے سحر تک گلاب در تہِ آب
پڑی ہے دھاک جو تیغے کی تیرے، دریا میں نہنگ کو نہیں آتا ہے خواب در تہِ آب
نہ پھیرے تیغ گلے پر وہ میرے گر سمجھے کہ ہو ہے اُس کا گلا کامیاب در تہِ آب
کمر کو اُس نے نہانے میں بل دیا تھا کہیں سو ہے ہنوز وہی پیچ و تاب در تہِ آب
یہ کس کے کشتوں کی لاشوں سے بھر گیا دریا کہ دم کی جا نہیں پاتے حباب در تہِ آب
نہا نہ ساتھ تو دشمن کے، جی دھڑکتا ہے نہ دوستی کا کرے کچھ حساب در تہِ آب
کبھی ہے سُوس[2] پہ ماہی تو سُوس ماہی پر سدا رہے ہے یہی انقلاب در تہِ آب
وہ جوہری[3] کا، جب آنکھوں پہ رکھے ہے عینک نظر پڑیں ہیں دو جامِ شراب در تہِ آب
دھواں یہ بحر سے اُٹھتا ہے ہر سحر کیسا؟ کسی پہ گر نہیں ہوتا عذاب در تہِ آب
چڑھا ہے چرخ پہ میرے جو اشک کا طوفاں کہ جوں نہنگ پھریں ہیں سحاب در تہِ آب

جہاں میں جن کی کہ اوقات ہے ملمّع کی
رکھیں ہیں مصحفی وہ نت سراب در تہِ آب

1- رختِ آبی = ہلکا شفاف لباس 2- سُوس = آبی کیڑا 3- جوہری کا = جوہری کا لڑکا

108

عاشق نہ ہم، نہ ہم کو تمنائے نقشِ حب　عامل سے، بوالہوس ہو سو لکھوائے نقشِ حب
ہر چند اس تلاش میں ہم پیر ہو گئے　تو بھی گیا نہ سر سے یہ سودائے نقشِ حب
پھر کیا عجب ہے سوختگیِ عشق کی اگر　راتوں کو مجھ سے آگ میں جلوائے نقشِ حب
ہو دل میں میرے کیونکے جگہ نقشِ بغض کی　روزِ ازل سے تھی یہ بنا، جائے نقشِ حب
واللہ بھول جائے تو آئینہ دیکھنا　دکھلایئے جو تجھ کو تماشائے نقشِ حب
پوچھا میں مصحفی سے تری آرزو ہے کیا
بولا وہ وقت نزع یہی، ہائے نقشِ حب

109

دوکانِ مے فروش پہ گر آئے محتسب　دن عید کے تو خوب گھڑا[1] جائے محتسب
اے چرخِ فتنہ گر، یہ روا ہے کہ ہر برس　صہبا کشوں پہ باج کی ٹھہرائے محتسب؟
مستوں نے سنگسار کیا اس کو بارہا　لیکن گیا نہ اس پہ بھی سودائے محتسب
ہاتھوں سے اُس کے شیشۂ دل چور ہے مرا　یا رب کیے کی اپنے سزا پائے محتسب
یہ کوے مے فروش میں رَولا[2] ہوا کہ رات　دہشت سے واں ٹھہر نہ سکا پائے محتسب
مستِ شرابِ عشق کو بازارِ دہر میں　زنہار بیم شحنہ، نہ پروائے محتسب
کچھ دے کے رشوت اس کو تو پی مصحفی شراب
سب زر کے واسطے ہے یہ غوغائے محتسب

110

خوش طالعوں کو ہووے مبارک پلنگ و خواب　ہے یاں تو ساری رات نصیبوں سے جنگ و خواب
اس سونے سے عیاں ہے کہ عاشق کے قتل کے　ہے مشورے میں وہ نگہِ سرمہ رنگ و خواب

1- گھڑنا = پٹائی کرنا (روزمرہ)　2- رَولا = شور و غل

تو اس شکارگہ میں نہ راحت کی کر ہوس اے بے شعور بیشۂ شیر و پلنگ و خواب
اوقات پوچھتے ہو خراباتیوں کی کیا؟ دن رات دم کشی ہے، کہ ہے جامِ بنگ وخواب
سوتا ہے اُس کے در پہ تو کہتا ہے مصحفی
سودا یہ کچھ شعور ہے کامِ نہنگ و خواب

111

وہ صحبتیں ہیں اب نہ وہ راتیں نہ جنگ وخواب ساتھ اپنے لے گئے وہ ہمارا پلنگ وخواب
چہرہ ہے زرد، آنکھیں اَنیدی، گزشتہ شب آخر کیا کسی نے تو تاراجِ رنگ و خواب
کچھ اس قدر تو دور نہیں منزلِ عدم یعنی بہ رنگ اشک ہے یاں یک شلنگ[1] وخواب
تڑپا نہ صید اس کا کبھی خاک پر ذرا کرتا رہا ہمیشہ میں سیرِ خدنگ و خواب
پینک[2] کا کیا ہے ڈر جو ہو بزم طرب کے بیچ بے لطف بھی نہیں ہے کچھ آواز چنگ وخواب
یہ کیا سلوک مجھ سے کیا، اے شبِ فراق پائے خیالِ غیر کو دینا تھا لنگ و خواب
سونا وہ دن چڑھے کا نہ کافر کا کم ہوا ہم مر چلے، وہاں وہی اب تک درنگ[3] وخواب
باہر نکل نہ خانۂ دہلی سے مصحفی
ایسا نہ پائے گا تو کہیں فرشِ سنگ وخواب

112

بوند آنسو کی سر مژگاں پہ کم آتی ہے اب حسرتِ دل آب ہو دل ہی میں رہ جاتی ہے اب
سُد[4] سنبھالی ہے ذرا اُس نے کہ آئے ہے شباب بیش وکم عاشق سے اس کی آنکھ شرماتی ہے اب
قیس سے جس وقت وہ اپنی لڑا بیٹھی تھی آنکھ کیا کرے اُس وقت کو لیلیٰ نہیں پاتی ہے اب
ابروؤں کا اس کے ہے یارو یہی گر بانکپن مجھ کو سوجھے ہے بہم تلوار چل جاتی ہے اب
بھاگتا ہوں میں بہت پر مجھ کو اپنے دام میں اُس کے دامن کی کناری گھیر کر لاتی ہے اب

1-شلنگ = چھلانگ، زقند 2- پینک (بروزن زینت) = نشے کی جھونک 3- درنگ = تاخیر، ٹال مٹول
4- سُد (سُدھ) = ہوش، شعور (عوامی)

خاک پر رکھتے نہ تھے جو فرشِ زرّیں سے قدم　بے زری گلیوں کی اُن سے خاک چھنواتی ہے اب
گھر میں آ خسرو کے رکھتی ہے جدائی کا خیال　اپنی معشوقی کو شیریں کام فرماتی ہے اب
ہو گئے وے دن کہ رہتے تھے زنخراں یار کے　روز و شب اے ہم نشیں، پتھر ہے اور چھاتی ہے اب
مصحفی درویش ہو بیٹھا کہاں ملبوسِ شاہ
بس بساط اُس کی میں کمبل کی یہی گاتی ہے اب

113

نے نسیم اس کو سے، نے بادِ شمال آتی ہے اب　صبر کیجے تا کجا، بس جان گھبراتی ہے اب
عرش کے بھی پار آہِ عاشقاں جاتی ہے اب　عالم بالا کی اک دم میں خبر لاتی ہے اب
آہ وہ صورت کیا جس کی جدائی نے تباہ　خواب میں آ کر مرے سر کی قسم کھاتی ہے اب
وصل کی شب ہے نہ کر موے جبیں کو بر طرف　بات کہتے ورنہ، ظالم صبح ہو جاتی ہے اب
کیونکے ضبطِ نالہ و فریاد کیجے اُس کو دیکھ　شانِ معشوقی بھی کیا کیا شان دکھلاتی ہے اب
اے اسیرانِ قفس، میں تم سے اس کو کیا کہوں　کان میں میرے صبا جو بات کہہ جاتی ہے اب
یہ تو اندازِ سخن زیں پیش کافر کا نہ تھا　بات کہتے میں زباں کچھ اس کی اٹھلاتی ہے اب
آخرِ عمر آ گیا دل نونہالوں کی طرف　کیا کروں گل کی کلی مجھ کو بہت بھاتی ہے اب
دخترِ رز کے ہیں گر پر، ہم بھی پھندے باز ہیں　دام میں آئی ہوئی اپنے کوئی جاتی ہے اب
خے[1] کے قطرے زلف سے ٹپکا کریں تھے پیش ازیں　کون جانے ہے یہ بدلی خون برساتی ہے اب
کھائے ہے ٹھوکر جو اندازِ خرامِ ناز سے　دیکھ کر رستے میں اس کو کبک گھبراتی ہے اب
وصل کی شب مصحفی کہتے ہیں جس کو تیرہ روز
ہو نہ نومید اتنا تو، وہ رات بھی آتی ہے اب

1- خے = پسینہ

114

ہوئی اشکوں سے تر یکسر ہماری آستیں صاحب
تغافل اس قدر ہم سے، اجی آؤ کہیں صاحب

پری سی اپنی صورت دیکھو، تم کو کچھ بھی غیرت ہے
رقیبِ دیو صورت ہو تمھارا ہم نشیں صاحب

ضرر پہنچے گا تم کو ساتھ پھولوں کے نہ مل بیٹھو
کہ گل کانٹے بھرے ہیں اور ہو تم نازنیں صاحب

ہمارا محضرِ خوں ہم سے لکھوا سب کو دکھلایا
اِنھیں باتوں پہ پھر تم چاہو ہو مہرِ نگیں صاحب

لگی تم کو نہ کچھ لم [1] اور گنہگار آپ کے ٹھہرے
ہمیں صاحب، ہمیں صاحب ہمیں صاحب ہمیں صاحب

جو مرتا ہے سو کوچے میں تمھارے دفن ہوتا ہے
ہمارے ہی لیے کیا واں نہیں دو گز زمیں صاحب

میں در گذرا تمھاری اس مکدّر مہربانی سے
تم اپنے پاس رہنے دو مزاجِ خشمگیں صاحب

وہ دن ہیں یاد جو ہم منتظر تھے اور تم چھپ چھپ
دکھاتے تھے کنارِ بام سے آدھی جبیں صاحب

رہے شب باش کس کے، کیوں سپیدی آگئی منھ پر
میں یہ پوچھوں، گیا کیدھر وہ روئے آتشیں صاحب

قلق میں ہو ابھی میاں مصحفی، آرام ہو جاوے
نکل جاوے تمھاری گر کہیں جانِ حزیں صاحب

1- لِم (بہ کسر لام) = تہمت، الزام

115

اب مجھ کو گلے لگاؤ صاحب یک شب کہیں تم بھی آؤ صاحب

روٹھا ہوں جو تم سے میں، تو مجھ کو آ کر کے تمھیں مناؤ صاحب

بیٹھے رہو میرے سامنے تم از بہرِ خدا نہ جاؤ صاحب

کچھ خوب نہیں یہ کج ادائی ہر لحظہ نہ بھوں چڑھاؤ صاحب

رکھتے نہیں پردہ غیر سے تم جھوٹی قسمیں نہ کھاؤ صاحب

در گزرے ہم ایسی زندگی سے اتنا بھی نہ جی جلاؤ صاحب

یا غیر کی چاہ بھول جاؤ یا دل سے ہمیں بھلاؤ صاحب

تم وقت کے اپنے ہو مسیحا مُردے کے تئیں جِلاؤ صاحب

میاں مصحفی یار آ ملے گا
اتنا بھی نہ تلملاؤ صاحب

116

جس تس کو نہ منھ دکھاؤ صاحب مکھڑا ہے غضب، چھپاؤ صاحب

کیا پردے میں منھ چھپا کے بیٹھے آواز تو ٹک سناؤ صاحب

ویران تو کر چلے ہمیں تم چاہو جسے اب بساؤ صاحب

بس دیکھ لیا تمھیں بھی ہم نے باتیں نہ عبث بناؤ صاحب

ہم مر گئے تم جیو ہمیشہ شکوہ پھر کیا ہے، جاؤ صاحب

سگ مصحفی یار اگر کہے ہے
تو تم بھی وہاں نہ جاؤ صاحب

117

جب سے صانع نے بنایا ہے جہاں کا بہروپ
اپنی نظروں میں ہے سب کون و مکاں کا بہروپ

میں گیا بھیس بدل کر تو لگا یوں کہنے
"چل بے لایا ہے مرے آگے کہاں کا بہروپ"

چاند تارے ہیں یہ کیسے، یہ شب و روز ہے کیا؟
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے یہاں کا بہروپ

چشمِ بینا ہوں تو داڑھی کی دو رنگی سمجھیں
ایک چہرے پہ ہے یہ پیر و جواں کا بہروپ

پہنے جاتے ہیں کئی رنگ کے کپڑے دن میں
کیا کہوں ہائے غضب ہے یہ بتاں کا بہروپ

باغ میں طرۂ سنبل کی پریشانی سے
صاف نکلا ترے شوریدہ سراں کا بہروپ

مصحفی سانگ سے کیا اکھڑے ہے پشم اس کی بھلا
سو طرح سے ہو جسے یاد زباں کا بہروپ

118

دریائے عاشقی میں جو تھے گھاٹ گھاٹ سانپ
لے گئے سپیرے واں سے بہت بھر کے باٹ سانپ

از بسکہ اس کے زہر پہ غالب ہے زہرِ عشق
مر جاوے ہے وہیں ترے عاشق کو کاٹ سانپ

دریا میں سر کے بال کوئی دھو گیا مگر
لہروں کے ہو رہے ہیں جو یوں بارہ باٹ[1] سانپ

نامرد سے بھلا جٹئی[2] خاک پھر ہوئی
سمجھا جب اپنی بھینس کی رسّی کو جاٹ سانپ

1- بارہ باٹ ہونا = آوارہ، بے ٹھکانا 2- جٹئی = جاٹ پن، بہادری

تحریکِ زلف سے تری بادِ سموم نے
کہتے ہیں دشت و در میں دیے باٹ باٹ[1] سانپ

تھے جس زمیں پہ صندلِ پا کے ترے نشاں
جیتے ہیں اب وہیں کی ذرا خاک چاٹ سانپ

ساحل پہ اُس کی جعدِ مسلسل کے عکس سے
دریا میں دھوبیوں کو نظر آئے پاٹ سانپ

بنگلے میں جا کے خاک رہے کوئی مصحفی
کر دیں ہیں آدمی کا یہاں جی اُچاٹ سانپ

ت

119

لائی ہمیں یہ پیام حسرت	یعنی کہ تو بن تمام حسرت
ہے ہے وہی عاشقوں کی ہے موت	کہتے ہیں جسے بنام حسرت
لے جائیں نہ کیونکے سرو و طاؤس	بر این قد و این خرام حسرت
وہ غیر کے ساتھ مے پیے حیف	دے زہر کا ہم کو جام حسرت
دل کب تئیں صدمہ ہی اُٹھاوے	کر چک کہیں اس کا کام حسرت
جو وصل سے ہیں خنک وہ عاشق	لے جاتے ہیں ہم سے وام حسرت
میں عشق میں روزِ خوش نہ دیکھا	قسمت میں رہی مدام حسرت
جو سنتے ہیں ریختے کو تیرے	ہو جاتے ہیں وہ تمام حسرت
ہے شعر میں دستِ غیب تجھ کو	لے جاوے نہ کیوں نظام حسرت

1- باٹ = راستہ

اے مصحفی تجھ پہ کیوں نہ کھاویں
اس رشک سے خاص و عام حسرت

120

تھی اس نسبت سے ہم کو ساتھ اُس کے روز و شب نسبت
ہمارے ساتھ بھی بولے تھا جب وہ غنچہ لب نسبت

وہ ناحق دردِ سر کرتی ہے اتنا سرخ رنگی میں
ترے تلووں سے ہے رنگِ حنا کو، جان کب نسبت؟

معاش اپنی یہ ٹھہرائی ہے بعضے لچّوں شُہدوں[1] نے
کہ اکثر مفلسی میں ڈھونڈتے ہیں جب نہ تب نسبت

بہر صورت اسی کا ذکر یہ دن رات کرتا ہے
ہمارے دل کو بھی حسنِ بتاں سے ہے عجب نسبت

غرور شاعری اے مصحفی اچھا نہیں اتنا
تجھے کیا میر و مرزا سے ہے جب، اے بے ادب نسبت

121

مت تارِ زلف جان دلا، تارِ عنکبوت
بہرِ مگس ہے دامِ بلا تارِ عنکبوت

لاوے نہ تابِ دستِ جفا تارِ عنکبوت
ہو کر دوتا نہ جائے بٹا تارِ عنکبوت

سر رشتۂ سخن کو میں از بس دیا ہے طول
تارِ نفس بنا ہے مرا تارِ عنکبوت

دامِ فریب ہستیِ پوچ اپنی پر نہ جا
کیا عنکبوتِ لاغر و کیا تارِ عنکبوت

موے میانِ یار کی دشمن ہے نازکی
ہے آپ در مقامِ فنا تارِ عنکبوت

پاے مگس نہ صید کیا اور مفت میں
جامہ بدن کا گل کے ہوا تارِ عنکبوت

1- لچّے شُہدے = بدمعاش

کیا پوچ باف[1] سے ہو شکارِ کلاں کا قصد کب صید کر سکے ہے ہُما تارِ عنکبوت

بے اُنس ہیں جو، اُن کے کہاں آہ در جگر مضراب سے نہ دیوے صدا تارِ عنکبوت

نازک ہیں اس قدر کہ کہے تو سپید باف جامے میں اُس کے صرف ہوا تارِ عنکبوت

گورے بدن نے اس مہ تاباں کے مصحفی

پیراہنِ کتاں کو کیا تارِ عنکبوت

122

زخمِ دل کو نہ کیا تم نے رفو ایک بھی رات نہ رہے تم تو مرے پاس کبھو ایک بھی رات

بازوے غیر پہ سر اُس کا رہا یا قسمت ہاتھ میرا نہ ہوا طوقِ گلو ایک بھی رات

گلِ حرماں ہی رہے نت مری بالیں پہ پڑے اُن سے آئی نہ کبھی وصل کی بو ایک بھی رات

تجھ کو لایا نہ کبھی گھر میں مرے بے کھٹکے نہ ہوا چرخ نصیبوں سے عدو ایک بھی رات

یار کی خواب میں ہر شب جو میں جاؤں تو کہے ایسا قادر نہیں کیا صبر پہ تو ایک بھی رات

غسل کے بعد کی اوروں نے بہاریں لوٹیں ہم نے دیکھے نہ وہ بکھرے ہوے مُو ایک بھی رات

باغِ دنیا میں رہے پر ہوئی ہم کو نہ نصیب سیرِ گلزارِ نشاطِ لبِ جو ایک بھی رات

مصحفی پھر تو عجب جا ہے یہی گوشۂ فقر

نظر آجائے اگر عالمِ ھُو ایک بھی رات

123

چشم آفت و طرزِ نگہ سرمئی آفت آفت پہ چلی آتی ہے یاں اک نئی آفت

گل دیکھ کے اس چھب کو نہ ہو کیونکے دوانا چکّن[2] ہے غضب، تس پہ تری مرزئی[3] آفت

خالِ سیہ و زلفِ کج و خطِ شلائیں[4] دیکھیں ہیں ترے حسن کی دولت کئی آفت

ہر چند پٹھانوں کی سبھی قوم بلا ہیں اس قوم میں پر ہوتے ہیں یوسف زئی آفت

1- پوچ باف = بے حیثیت، کمزور 2- چکّن = لباس کی چست، زیبائش

3- مرزئی = لباس کا نام، (میر + زی) کا مرکب یعنی رئیسوں کا لباس 3- شلائین = شوخ و شنگ، دلفریب

ہے ایک تو صورت میں وہ بت قہر خدا کا — پھر اس پہ ہے چترائی غضب، سگھڑئی آفت
وہ کوند تھی بجلی کی کہ آنکھ اس کی پڑی تھی — جو آنکھ کے پڑتے ہی یہاں آگئی آفت
اے مصحفی مت روے نقیبوں کی طرف دیکھ
ہوتا ہے میاں رنگِ رخِ چمپئی آفت

124

بونا سا وہ قد تس پہ وہ رفتار قیامت — برپا نہ ہو کیونکر سرِ بازار قیامت
ہم ہجر کی شب مر گئے ہیں اور جیے ہیں — یاں ہو گئی ہیں ایسی کئی بار قیامت
کہتے ہیں قیامت کو ہے دیدار خدا کا — ہے ہم کو یہیں وعدۂ دیدار قیامت
جیدھر کو نظر کیجیے ستھراؤ پڑے ہیں — کل کر گئی ہے یاں تری تلوار قیامت
ہو ایک، تو مذکور کروں اس کی پھبن کا — چیکن[1] ہے غضب، بندشِ دستار قیامت
نامے کو مرے پھاڑ کے کافر نے اُڑایا — رکھتا ہے زبس مجھ سے وہ انکار قیامت
تارے سے پڑے ٹوٹے ہیں آنسو مرے منھ پر — لائی ہے مری چشمِ گہربار قیامت
پھندے میں نہ آجائیو تو زلفِ سیہ کے — پھبتی ہے ترے رخ پہ یہ گفتار قیامت
یا رب تو قیامت کو اسے بخشے تو بخشے — نومید ہے ورنہ یہ گنہ گار قیامت
جو خواب میں لوٹیں ہیں مزے وصل کی شب کے — یارب نہ کرے اُن کو تو بیدار قیامت
اے مصحفی بجلی بھی اُسے دیکھ جلے ہے
ہے گرم مری آہِ شرر بار قیامت

125

مژگاں پہ جب رکھے ہے وہ مخمور پشتِ دست — ڈرتا ہوں ہو نہ خانۂ زنبور پشتِ دست
فندق پہ غش کروں ہوں تو چاکِ قنات سے — دکھلائے ہے وہ شاہدِ مستور پشتِ دست
شاہوں کی بارگاہِ توکل میں جا نہیں — یاں کھا چکے ہیں قیصر و فغفور پشتِ دست
دیکھا ہے کس کے ہاتھ کو دستِ طبیب میں — کاٹے ہے اپنا جو دلِ رنجور پشتِ دست

1- چیکن = بناؤ سنگھار

چھاتی پہ میری، تپ میں جو رکھ دی تو ہوگئی سوزش کے حق میں صندل وکافور پشتِ دست
لیتا ہے جب وہ دانے زمرد کے ہاتھ میں جھلکے ہے مثلِ خوشۂ انگور پشتِ دست
حسنِ سیاہِ زلف کا عالم ہی اور ہے شانے سے مارے ہے بہ رخِ حور پشتِ دست
موسیٰ نہ تابِ جلوۂ دیدار لا سکا رکھ دی نہ عاقبت بہ سرِ طور پشتِ دست
تیروں کا کس کے ہاتھ نشانہ ہوا کہ ہے عاشق کی رشکِ خانۂ زنبور پشتِ دست
اے آسماں، نہ زور دکھا اپنا تو اسے رکھ دے زمیں پہ ہو کے جو مجبور پشتِ دست
بے وجہ اس کی جنبشِ مژگاں نہیں کہ چشم مارے ہے روئے مہر پہ از دور پشتِ دست
کشتوں کے پشتے تا بہ کمر کیوں نکے پڑ نہ جائیں رکھے کمر پہ جب کہ وہ مغرور پشتِ دست
نقشِ نگیں کی داد لگا مانگنے کہ تھی دکھلانی اس کو یوں ہمیں منظور پشتِ دست

مارے ہے سلطنت پہ سلیماں کی مصحفی
بر نیم دانہ حوصلۂ مور پشتِ دست

126

یاں بھی جو بعد سال کبھی آئے ہے بسنت جلوے ہزار رنگ کے دکھلائے ہے بسنت
دیوانہ پن میں کس کو خبر ہے بسنت کی معلوم ہی ہمیں نہیں کیا گائے ہے بسنت
چہرہ نقیہ[1] کس کا یہ اس کو نظر پڑا جو اپنے رنگِ زرد سے شرمائے ہے بسنت
بے برگ ہیں ہم اتنے کہ ایسی بہار میں سرسوں کے پھول تک ہمیں ترسائے ہے بسنت
تربت ہرے بھرے کی ہر اک کشتے کی ہے قبر مینا سی سطحِ خاک سے لپوائے ہے بسنت
سرسبز کیوں نہ ہووے کہ گیہوں کی بال رکھ گڑوا ہزار گل کا بنا لائے ہے بسنت

اے مصحفی بہار کا کیا یاں کی اعتبار
بس آنکھ ملتے خاک میں مل جائے ہے بسنت

1- نقیہ = پاکیزہ، صاف ستھرا

127

جب نبی صاحب[1] میں کوہ دشت سے آئی بسنت — کر کے مجرا شاہِ مرداں[2] کی طرف دھائی بسنت

خواجہ قطب الدینؒ میں پھر گڑوا بنا کر لے گئی — یعنی ان کی نذر کو سو پھول گل لائی بسنت

واں سے پھر حضرت نظام الدینؒ کی خدمت میں چلے — تربتِ خسروؒ پہ پھر ہو کے کھڑے گائی بسنت

سوے حضرت ترکماںؒ[3] آئی جو، کر اس کا طواف — ہوگئی وو ہیں بیابانی و صحرائی بسنت

وو ہیں پھر دربارِ شاہِ ہند میں رکھ کر قدم — ناچنے گانے لگی ہنس ہنس بہ زیبائی بسنت

پھر جنابِ آصف دوراں میں باصد عیش و ناز — ہوگئی آ کر کے مصروفِ جبیں سائی بسنت

مصحفی اب اک غزل لکھ تو غزل کی طرح سے
تا کرے عالم کا تاراجِ شکیبائی بسنت

128

مژدۂ فصل جنوں مستوں کو پھر لائی بسنت — دن گئے پھر، اور رُت پلٹی کہ پھر آئی بسنت

اک طرف گندم کی سبزی اک طرف سرسوں کا کھیت — کیوں نہ ان روزوں کرے دعوائے رعنائی بسنت

انبہ مورے[4]، ٹیسو[5] پھولی بن میں، پھر پھولی کھجور — یعنی ہر اک نخل پر اک تازہ گل لائی بسنت

اپنے اپنے گھر سے سب نکلے پئے گلگشتِ دشت — کر گئی یک بارگی عالم کو سودائی بسنت

دیکھ کر لالے کو وحشت ہوگئی اس کو ولیک — باندھ کر زنجیر، نافرماں[6] نے لہرائی بسنت

کیسری جوڑا پہن کر کیوں نہ نکلے ان دنوں — یعنی ہے دربار کی آصف کے مجرائی بسنت

مصحفی کیوں دیکھنے جاؤں میں نرگس کی بہار
مجھ کو رنگِ زرد نے گھر بیٹھے دکھلائی بسنت

1- نبی صاحب = دہلی کا علاقہ نبی کریم جہاں قدم شریف کا نشان بھی رکھا ہوا ہے۔
2- شاہ مرداں = دہلی میں شیعوں کا متبرک مقام 3- ترکمان دروازہ دہلی کے قریب حضرت شاہ ترکمانؒ بیابانی کا مزار 4- انبہ مورے = آموں کا بور نکلا 5- ٹیسو = ایک پھول 6- نافرماں = ایک پھول کا نام

129

آہ دیکھی تھی میں جس گھر میں پری کی صورت
اب نظر آئے ہے واں نوحہ گری کی صورت

نہ وہ انداز، نہ آواز، نہ عشوہ، نہ ادا
یک بہ یک مٹ گئی یوں جلوہ گری کی صورت

اب خیال اس کا وہاں آنکھوں میں پھرتا ہے مری
کوئی پھرتا تھا جہاں کبکِ دری کی صورت

اس کے جانے سے مرا دل ہے، مرے سینے میں
دم کا مہمان، چراغِ سحری کی صورت

نے خبر اُس کو مری پہنچے ہے، نے اس کی مجھے
بندھ گئی ہے عجب اک بے خبری کی صورت

نام لوں کس کا کہ اک گل کے لیے جاتے ہیں
اشک آنکھوں سے عقیقِ جگری کی صورت

مصحفی ہے یہی اب سوچ کہ دیکھیں تو فلک
پھر بھی دکھلائے گا یارِ سفری کی صورت

130

یا تھی ہوسِ وصال دن رات
یا رہنے لگا ملال دن رات

بے چین رکھے ہے میرے دل کو
کافر، یہ ترا خیال دن رات

رہتا ہے مری زباں پہ تجھ بن
افسانۂ زلف و خال دن رات

دیکھوں ہوں بہ نقطۂ تصور
ملنے کی ترے ہی فال دن رات

آنکھوں میں پھرے ہے جوں مہِ عید
ابرو کا ترے ہلال دن رات

وہ صید ہوں میں رہے ہے جس کے
اندیشے کا سر پہ جال دن رات

آنکھوں کے تلے مری پھرے ہے
اب تک وہی بول چال دن رات

جس سبزۂ مرغزار میں تھا
رقصندہ مرا غزال دن رات

جولانیِ درد و غم سے اب یاں
وہ سبزہ ہے پایمال دن رات

گر تو ہی نہیں تو کیوں جیوں میں
ہے زیست مجھے وبال دن رات

فرقت میں تری ہے مصحفی کو
لکھنا یہی حسبِ حال دن رات

131

دل آتشِ غم سے داغ تھا رات بالیں پہ مری چراغ تھا رات

تھے محوِ خیالِ یار تا صبح زانو پہ سرِ فراغ تھا رات

یک گونہ شگفتگی تھی دل کو ہر غنچہ طلسمِ باغ تھا رات

جو اشک کہ چشم سے گرے تھا وہ گوہرِ شب چراغ تھا رات

پیتا تھا میں جامِ وصل ہر دم ہونٹوں پہ مرے ایاغ تھا رات

تھے مصحفی مستِ جامِ دیدار ق ساز اپنا دل و دماغ تھا رات

یعنی کہ بہ دولتِ تصور

عالم سے ہمیں فراغ تھا رات

132

بسکہ ہیں اس شاہدِ پنہاں کے جلوے بھانت بھانت

دیکھتی ہیں آنکھیں اور دل مضطرب ہے اس پرانت

خونِ بلبل سے ہوئی خاکِ چمن جب تربتر

سرو نے یکسو کیا جھاڑو سے اُس کو سونت سانت

تنقیہ[1] انسان کو ہے باعثِ تلینِ جسم[2]

بعدِ مسہل مثلِ ریشم نرم ہو جاتی ہے آنت

دستِ خیاطِ قضا نے ٹھیک آخر کر دیا

جامۂ نازک تنی کو تن پر اس کے بیونت بانت

شہوت اُن سے کون سی صادر ہوئی جو مصحفی

بندھ رہی ہے آج تک انگور کے خایوں[3] سے تانت[4]

1- تنقیہ = صفائی 2- تلین (تلیین) = نرم کرنا، دست آور دوا دینا

3- خایوں سے = گچھوں سے 4- انگور کے خوشوں کا وزن تھامنے کے لیے انھیں تانت سے باندھا جاتا ہے

ٹ

133

آنکھیں ہیں جوشِ اشک سے پنگھٹ　　اشک پھرتے ہیں ان میں جیسے رہٹ
میں نہ سمجھا تھا خوب تیرے تئیں　　ہے تو مطرب پسر، بڑا نٹ کھٹ
پی گئے ہم صراحیِ مے کو　　دستِ ساقی سے لیتے ہی غٹ غٹ
تیرا تیرِ نگہ ہے وہ کافر　　منھ سے اک دم جدا تو کر، گھونگٹ
سمجھے تھے مار آپ دیکھی تھی　　آئینے میں کسی کی زلف کی لٹ
جس کو کہتے ہیں عرصۂ ہستی　　توسنِ عمر کی ہے اک سرپٹ
مصحفی اس کے رخ پہ خط آیا　　گئے وے دن، گئی وہ رُت ہی پلٹ

جم کے بیٹھے نہ تھا جہاں کوئی
رات دن اب رہے ہے واں جمگھٹ

134

لبِ شیریں کی اس نے دے کر چاٹ　　لا اُتارا ہے ہم کو تیغ کے گھاٹ
صدقے ہیں اس ادا کے، عاشق کو　　گالی دے بیٹھنا وہیں مکھ پھاٹ[1]
زندگی کر کے کیا کریں تجھ بن　　ہو گیا زندگی سے جی ہی اُچاٹ
کچھ سنا تو نے بھی کہ ان روزوں　　کاٹ دی ہے ترے مریض کی کھاٹ[2]
پیش آئے ہیں جب سے بارہ بُرج　　ہے مہندس کی عقل بارہ باٹ[3]

فرش کچھ چاہیے فقیروں کو
مصحفی، اِس میں بوریا ہو کہ ٹاٹ

1- مکھ پھاٹ = دریدہ دہنی کا عوامی ترجمہ 2- جب شدت مرض میں مریض معذور ہو جاتا ہے تو اُس کی ضروری حاجتوں کے لیے پلنگ کا ایک حصّہ کاٹ دیا جاتا تھا۔ 3- بارہ باٹ = آوارہ، سرگرداں (عوامی)

ث

135

ہو گئی برباد دم میں محنتِ مانی عبث
لکھ کر اُس کی زلف کو کھینچی پریشانی عبث

چیستانِ دلبراں میں بولنا ہم کو نہ تھا
ہم نے دانا بَن، کیا اظہارِ نادانی عبث

یہ کوئی میری طرف سے اُس کو سمجھا کر کہے
دشمنی مجھ ساتھ ہے، اے دشمنِ جانی عبث

کیا تمھاری فارسی گوئی نہیں کرتی ہے قتل
کھینچتے ہو ہم پہ ہر دم جو صفاہانی[1] عبث

ایک شب زنداں کا غوغا سن کے وہ کہنے لگا
"نالہ و فریاد کرتے ہیں یہ زندانی عبث"

دردِ سر کا مجھ کو تعویذ اک مجرب یاد تھا
تم نے یوں صندل سے لیپی اپنی پیشانی عبث

واں اُدھر بے پردگی ہے اور سیر بام ہے
کر رہا ہے یاں اِدھر دربان دربانی عبث

اک دن اُس آئینہ رو کے ملنے کا کر خود تو قصد
مصحفی اِس کام میں ہے اتنی حیرانی عبث

1- صفاہانی = تلوار

136

چاند سے مکھڑے کو رکھا ہے چھپا ہم سے عبث
ہو گیا ہے وہ بُت شوخ خفا ہم سے عبث

رات شبنم نے لیے بوسۂ گل خاطر خواہ
اور آزردہ ہوئی باد صبا ہم سے عبث

دھن کے سر یار یہ بولا مری ناکامی پر
''سارے عالم میں تو بدنام ہوا ہم سے عبث''

تہمت دُزدیِ شب سر پہ ہمارے ٹھہری
تم نے لگوائی تھی پانْووں کی حنا ہم سے عبث

ہم بھی کچھ آدمی ہیں، تم ہی یہ انصاف کرو
ہر گھڑی کرتے ہو تم اتنی حیا ہم سے عبث

بے اجل مرتے ہیں ہم آپ، عزیزاں شب ہجر
خنجر و تیغ کو رکھتے ہو جدا ہم سے عبث

یہ نہیں جانتے ہم کوٹھے بھی پھاندے[1] ہیں کئی
وارثوں نے تمھیں رکھا ہے چھپا ہم سے عبث

نیچی نظروں میں تو ہم اُن کی موئے جاتے ہیں
خرچ کرتی ہیں[2] وہ آنکھیں یہ ادا ہم سے عبث

کی سفارش جو کسی شخص نے میری تو کہا
''ایسے دیوانے کا مذکور کیا ہم سے عبث''

مصحفی بھاتی ہے عزلت ہی ہمیں اِن روزوں
لوگ کرتے ہیں نہ ملنے کا گِلا ہم سے عبث

1- پھاندنا= چھتوں سے گزر کر کسی کے گھر میں کودنا (عوامی)

2- خرچ کانا= صَرفہ کروں کا اردو ترجمہ بمعنی کفایت، کنجوسی

ج

137

تاریکی میں کرتی نہیں کچھ کام نظر آج
ہوتی نظر آتی نہیں یہ شب تو سحر آج

شاید شبِ ہجراں ہے جو گردوں پہ ستارے
ٹرکا نہ مرے خون پہ باندھے ہیں کمر آج

حیراں ہوں میں اس میں، کہ نہ شادی ہے نہ غم ہے
بے پیچ[1] بھرے آتے ہیں کیوں دیدۂ تر آج

میں ضبط نہ کرتا تو قیامت ہی ہوئی تھی
مژگاں تلک آئے تھے مری، لختِ جگر آج

ہو جا نہ، پری جلوہ، ثریّا کے مقابل
آویزہ ہے کانوں کا ترے سلکِ گہر آج

ہرگز میں نہ چھوڑوں گا، اِسے تیری قسم ہے
ہاتھ آیا ہے مدت میں ترا موُے کمر آج

ہر روز سحر ہووے ہے، ہر روز کہوں ہوں
''شاید کہ مرے منھ پہ کھُلے وصل کا در آج''

کل گرتے تھے مژگاں سے مری قطرے لہو کے
قطروں کے عوض جھڑتے ہیں دامن سے شرر آج

اے مصحفی رخصت ہو چلا کس کا تصور
ویراں نظر آتا ہے مجھے اپنا جو گھر آج

138

واں شورِ حسن برسرِ جولاں گری ہے آج
یاں آہ و نالہ و فلک و مشتری ہے آج

آیا ہے قشقہ دے کے وہ بت میرے سامنے
جاتا ہے دم چلا، کہ تری کافری ہے آج

ہر روز دیکھتا تھا میں، یہ کیا غضب ہوا
دل پس گیا ہے زور ہی جادوگری ہے آج

کیا اور لطفِ حسن پہ کوئی[2] جلوہ بڑھ گیا
کیا کہیے اس پری کا تو عالم پری ہے آج

دل لے چکے ہیں کب کا وہ، حیراں ہوں بسکہ میں
اس بات میں یہ کیسی نئی کافری ہے آج

بھر بھر کے ہم کو دے ہے جو یوں جامِ بے خودی
غمزے کو تیرے خدمتِ ساقی گری ہے آج

1- بے پیچ = بے سبب 2- کوئی (بروزن فَع)

رہتی تھیں یوں تو یہ بُنِ مژگاں ہمیشہ تر کیا قہر ہے کہ تا سرِ مژگاں تَری ہے آج
پامال ہوتے جاتے ہیں دل ٹھوکروں کے بیچ بے طرح گرم جلوۂ کبکِ دری ہے آج

ہوں ایسا بے حواس میں گویا کہ مصحفی
میری متاعِ صبر کی غارت گری ہے آج

139

اینڈنا اپنا کبھی مجھ کو جو دکھلائے ہے موج
اُس کی چوٹی کی طرح ناز سے بل کھائے ہے موج

رشتۂ طولِ امل [1] کا یہی آخر ہے مآل
جس طرح پھیل کے دریا میں سمٹ جائے ہے موج

بوریا باف [2] وہ چوٹی ہے کہ اک قہرِ خدا
ہم فقیروں کے تئیں جس کی ہر اک بھائے ہے موج

دل اِدھر مارے ہے سینے میں مرے بحر کا جوش
اور اُدھر گریہ کی آنکھوں سے چلی آئے ہے موج

کس کے گیسو کا پڑا اس پہ الٰہی سایہ
آج جو اور ہی انداز سے ٹکرائے ہے موج

رہ گیا ہے یہ جو اک تختہ تباہی زدوں کا
تا بہ ساحل اِسے کب دیکھیں تو پہنچائے ہے موج

نقش پر ہستیِ وہمی کے تو مت بھول کہ یاں
نقش بننے نہیں پاتے ہیں کہ مٹ جائے ہے موج

مصحفی گوش ادھر رکھ کہ اس بحر کے بیچ
مجھ سے ایک تازہ غزل اور بھی لکھوائے ہے موج

1- طولِ امل = امیدوں آرزوؤں کا پھیلاؤ 2- بوریا باف = بوریے کی طرح بٹی ہوئی

140

اپنے جوبن کی جو وہ بحر کو دکھلائے ہے موج
کیسی بیتاب ہو کافر سے لپٹ جائے ہے موج

کود پڑتا ہوں میں دیوانہ جو دریا میں کبھی
سنتے ہی شورِ سلاسل مرا، گھبرائے ہے موج

کس کے دامن کی کناری اسے آئی ہے نظر
لبِ ساحل پہ جو آتے ہوئے شرمائے ہے موج

یاد آتا ہے جو آویزۂ دُر اُس کا کبھی
اشک کی خوشۂ پرویں سے گزر جائے ہے موج

ہے ادھر زورقِ[1] دل کے ہمیں بہنے کا خیال
اور ادھر اشک کی مژگاں سے چلی آئے ہے موج

ہے جو مارِ سیہِ زلف کا اُس کو خطرہ
بال دھونے میں ترے، بید سی تھرّائے ہے موج

اپنے جی میں وہ خدا جانے کہ کیا سمجھے ہے
تشنہ کاموں کو جو اُس تیغ کے ترسائے ہے موج

رہ نہ دل بستۂ ملبوسِ شہاں، اے ناداں
یاں سدا آبِ رواں[2] دھوکے کی دکھلائے ہے موج

زورِ عالم ہے تری جعد کے بل کھانے کا
سچ تو یہ ہے کہ یہ انداز کہاں پائے ہے موج

مصحفی تیغِ فنا یوں ہے سرِ عاشق پر
جیسے پانی کے ببولے سے لگی جائے ہے موج

چ

141

تم نے کچھ فرق کیا جس سے ملاقات کے بیچ
ہو گیا اور سے کچھ اور وہ اک رات کے بیچ

کتنے انصاف سے تم دور ہو سبحان اللہ
چھاؤنی غیر کے گھر چھائی تھی برسات کے بیچ

جی میں آتا ہے کہ گر آب کے رواں ہو کوئی شخص
لکھ کے اک پرزہ بھی رکھ دیجیے سوغات کے بیچ

گوشۂ چشم میں پیارے نگہِ شرم تری
کچھ تو دیکھا ہے جو نت رہتی ہے سم گھات کے بیچ

ان سے لوں مجھ کو نہیں اتنا بھی صحبت کا دماغ
لوگ یوں آکے خلل کرتے ہیں اوقات کے بیچ

1- زَورق = کشتی 2- آبِ رواں = نفیس کپڑے کی ایک قسم

اُس کے اثنائے سخن میں جو میں بولا تو کہا
آپ کرتے ہیں عبث دخل ہراک بات کے بیچ

اہلِ دانش کے تئیں کام ہے کیا بارُخِ خوب
عشق کا فن نہیں قانونِ اشارات کے بیچ

رہزنِ عقل ہوئے زلف و خط و خالِ سیاہ
پھنس گیا جاکے یہ دل زور طلسمات کے بیچ

اب ہے وہ اک صدفِ سادہ کہ سب صرف کیا
رنگِ گل صانعِ عالم نے تری گات کے بیچ

گاہ بوتات تو بس اس شہِ خوباں کا لکھے
خیر بوسے کی بھی خیرات ہے خیرات کے بیچ

ایک عیّار ہیں محبوب زمینداری کے
دن دیے ڈاکے یہاں پڑتے ہیں میوات کے بیچ

مصحفی کے تئیں مسجد میں نہ ڈھونڈو کہ وہ مست
کہیں ہووے گا پڑا کنجِ خرابات کے بیچ

142

ہوتی ہے وا زبان جب اُس کی سخن کے بیچ
اَحسنت کہنے لگتے ہیں مُردے کفن کے بیچ

کم بخت کا یہ نالہ ہے یا تیغِ آبدار
بلبل نے ہم کو کھیت رکھا ہے چمن کے بیچ

آیا ہے کس کے حسن کا مذکور درمیاں
ہنستے ہیں سر جھکائے بتاں انجمن کے بیچ

نالوں سے تیرے اے دلِ بے صبر پڑ گئے
روزن ہزار گنبدِ چرخِ کہن کے بیچ

ہرچند رنگ اُس کا بہ شدت بدل ہوا
اب تک ہے بو وہی، ترے سیبِ ذقن کے بیچ

روشن ہوئی ہے شعلۂ فانوس سے یہ بات
چھپتے ہیں اہلِ حسن کوئی پیرہن کے بیچ

کیا وہ بھی دن تھے آہ کہ اس پائے شوق نے
برسوں ہمیں رکھا تھا مسافر وطن کے بیچ

تو سو جفا کرے، نہ کریں گے ترا گلہ
شکوے کی یاں زبان نہیں ہے دہن کے بیچ

کیا اس کے گورے پنڈے کا عالم بیاں کروں
بھردی ہے کوٹ کوٹ صباحت بدن کے بیچ

اے مصحفی سنے ہیں میں اشعار دکھنیاں
یہ لہجہ، یہ زبان کہاں ہے دکن کے بیچ

143

تھا مقدر میں نہ مرنا قدمِ یار کے بیچ
جان جاتی تھی مری حسرتِ دیدار کے بیچ

موتیوں کے تجھے درکار ہیں کیا آویزے　جانیں لٹکی ہیں تری زلف کے ہر تار کے بیچ
سایۂ تیغ میں گردوں نے بٹھایا مجھ کو　بیٹھتے کاش نہ ہم سایۂ دیوار کے بیچ
جوہری دیکھ اسے کیونکے نہ غش کر جاتا　آب گوہر کی صفا تھی ترے رخسار کے بیچ
شور نالوں کا مرے تا بہ فلک جاتا ہے　آگ جس طرح کبھی لگتی ہے نَے زار[1] کے بیچ
اِس کی تیزابی نے تیز آب بنایا ہے اسے　بیٹھ جاتا ہے مرا خوں تری تلوار کے بیچ
کبکِ کوہی نے یہ انداز کہاں پایا تھا　لاکھ شوخی کی روش ہیں تری رفتار کے بیچ
پیچ سا پیچ ہے کچھ آہ ہزاروں جانیں　لپٹی جاتی ہیں تری بندشِ دستار کے پیچ
گل میں آتا ہے جو بلبل کو نظر، فصلِ بہار　ہم خزاں میں بھی وہی دیکھیں ہیں ہر خار کے بیچ
مصرِ خوبی کا یہ عالم ہے کہ بکنے کو جہاں　یوسف اک روز نیا آوے ہے بازار کے بیچ
بیتِ ابرو کے تری سیکڑوں پہلو تھے ولے　بات آخر کو بگڑ ہی گئی تکرار کے بیچ
اب بھی آنا ہے عیادت کو تو آ او ظالم　یوں ہی اک سدِ رمق ہے ترے بیمار کے بیچ
کجیِ طبع سے ہے شیخ و برہمن کا نزاع　ورنہ رشتہ ہے وہی سبحہ و زنّار کے بیچ

مصحفی اور بھی لکھ اک غزل اس بحر میں یار
لطفِ شیرینیِ جاں ہے تری گفتار کے بیچ

144

طاقت اُٹھنے کی ہے کب اپنے تنِ زار کے بیچ　ہم تو جاتے ہیں دبے سایۂ دیوار کے بیچ
وہ بھی کیا دن تھے تم اودھر کو جو ہوتے تھے کھڑے　پھینک دیتا تھا میں گل، رخنۂ دیوار کے بیچ
شیخ صنعاں کی بھی تسبیح کی واں قدر نہیں　دل پروتے ہیں جہاں رشتۂ زنّار کے بیچ
دانت مسّی لگے اُس کافرِ خوں خوار کے ہائے　عقدِ پرویں سے چمکتے ہیں شبِ تار کے بیچ
وقت ہنسنے کے یہ پڑتا نہیں عارض میں گڑھا　یہ زنخدانِ دگر ہے ترے رخسار کے بیچ
تجھ پہ کیا جرم ہے خود صانعِ عالم نے رکھے　جوہرِ قتلِ غریباں تری تلوار کے بیچ

1- نَے زار = سرکنڈوں کا جنگل

زیرِ گردوں ہے بھلا کون سی صورت کی خوشی — سب کا گھبرائے ہے جی خانۂ بیمار کے بیچ
کہہ دو جا کر کے زلیخا سے کہ تو بھی آنا — آج یوسف کے تئیں لائیں گے بازار کے بیچ
آہ کس بات پہ وہ نامِ تمنا لیوے — کچھ بھی باقی ہے ترے طالبِ دیدار کے بیچ؟
دل جدا چاہے ہے خوبی کو تری، دیدہ جدا — ہو نہ یک جنس پہ قضیہ دو خریدار کے بیچ
لالہ و گل جو نظر آتے ہیں انگارے سے — پھونک دی آگ سی کس نے یہ چمن زار کے بیچ
تیغِ ابرو پہ تری کیونکے نہ عاشق جی دے — آبداری ہی یہاں بکتی ہے بازار کے بیچ
میں کہوں سانپ وہ زلفیں ہیں، تو کہتا ہے 'نہیں' — بات اسی طرح سے بڑھ جاتی ہے تکرار کے بیچ
گرچہ آنکھیں تو تصور میں ترے بند ہیں لیک — سیر کرتی ہے نظر رخنۂ دیوار کے بیچ
برگِ گل موجِ ہوا سے نہیں جنبش میں رہے — برق دایر قفسِ مرغِ گرفتار کے بیچ

کبھی حاتم سے بھی اس نے نہ کیا قصدِ سوال
مر گیا مصحفیِ خستہ اسی عار کے بیچ

145

مطلب زبون و خواہشِ زلفِ دوتا کپیچ — کیا کہیے آہ بات کڈھب، مدعا کپیچ[1]
الجھے نہ کیونکہ سیرِ گلستاں سے دل مرا — جعدِ بنفشہ درہم و موجِ ہوا کپیچ
دل چھوٹ کر جو طرۂ پُرخم میں رہ گیا — کیا جانیے پھر اس پہ یہ کیا پڑ گیا کپیچ
آیا جو اس کے پیچ میں جیتا نہ وہ بچا — پگڑی کا تیری پیچ ہے، اے بے وفا کپیچ
کشتی ہماری یار کی آخر بگڑ گئی — یہ پیچ بسکہ داوِ محبت میں تھا کپیچ
لپٹا تو ہوں میں شانہ صفت اُس کی زلف سے — قسمت سے ڈال دے نہ اگر کچھ قضا کپیچ
جب کٹ گیا پتنگ مرے شمع رو کا تب — بولا رقیب آپ کا کِتّا[2] لڑا کپیچ
رومال سے لپیٹے ہیں ہاتھ اپنے اُس نے پھر — لائی ہے دل کو دام میں اُس کی حنا کپیچ

1- کپیچ (کُ + پیچ) بُری طرح اُلجھا ہوا 2- کِتّا = کتنا (عوامی)

نقصانِ مال و جان سے ڈرتا ہوں میں کوئی
جھیلے ہیں ایسے مصحفی میں بارہا کیچ

146

کھائے جاتا ہے ہمیں مصحفی دن رات کا سوچ
سچ ہے، اے یار برا ہوتا ہے اوقات کا سوچ

سر بہ زانوے تفکر جو کبھی رکھتا ہوں
پہروں رہتا ہے مجھے اُس کی ملاقات کا سوچ

بیٹھنا دور کا یا پاس کا آنا کہیے
جی ہی کھپ جائے تری کیجیے جس بات کا سوچ

طرفِ رخنۂ دیوار تکوں ہوں پہروں
کر کے نظروں میں ان آنکھوں کی اشارات کا سوچ

نت شبِ ہجر میں بے چین رکھے ہے مجھ کو
کبھی سینے کا تصور، تو کبھی گات کا سوچ

ایک گل ہو تو کروں اُس کی میں رنگت کا بیاں
داغ رکھتا ہے مجھے باغِ طلسمات کا سوچ

اشک مصحف پہ جو پڑھنے میں گرے میرے تو کیا
مردِ عاشق کو کہاں مصحف و آیات کا سوچ

خاکساروں کی بھی کیا چین سے گزرے ہے، جہاں
نہ تو سرما کا، نہ گرما کا، نہ برسات کا سوچ

مصحفی کس کی بلا کسب کرے فنِ عروض
جس میں دن رات رہے وزن و زحافات کا سوچ

ح

147

کریں تھے ہم بھی جگر چاک سے نظارۂ صبح
کبھی ہمارے بھی زنداں میں تھا گزارۂ صبح

اسیرِ ظلمتِ تاریک شب ہوں میں کہ نہیں
بغیر روزنِ دیوار یاں ستارۂ صبح

ہزار سوزنِ زرّینہ تھیں بہ کیسۂ مہر
پر اس سے ہو نہ سکا وصلِ جیب پارۂ صبح

اگر نہ عالمِ دیوانگی میں ہے وسعت
برائے چاکِ گریباں ہے کیوں اشارۂ صبح

بہ زیرِ چرخ سمجھ ناک گر کوئی ہوتا
بغیر رمزِ تبسم نہ تھا اشارۂ صبح

عشا کو پڑھ کے شبِ ہجر میں جو سوؤں تو پھر تمام رات رہے فکر استخارۂ صبح
رکھے جو پاے حنائی وہ خاکِ عاشق پر ہر ایک ذرّہ کرے جلوۂ شرارۂ صبح
پھبے جو کان میں اُس گل کے مصحفی لالہ
خجل ہو کیوں نہ بھلا اُس سے گوشوارۂ صبح

148

میں ہوں، شبِ فراق ہے اور انتظارِ صبح یا رب کہ جلد چہرہ کشا ہو بہارِ صبح
آنکھوں میں اُس کی دیکھ بہارِ خمارِ صبح لوٹے ہے موجِ خونِ شفق میں شکارِ صبح
احیاے شب بتوں سے میں برسوں کیا و لے بھولی نہ دل سے لذّتِ بوس و کنارِ صبح
شوریدگی کا اپنی میں کس سے بیاں کروں آتا ہے یاد نعرۂ بے اختیارِ صبح
کیا کھولے آنکھ وہ، دلِ نازک مزاج کو کرتا ہے اِس صفا پہ مکدّر غبارِ صبح
ظالم، کبھی تو صید گہِ عاشقاں میں آ تڑپے ہے زور خونِ شفق میں شکارِ صبح
فوجِ شبِ فراق پہ آوے نہ کیوں شکست وقتے کہ ہو علَم علمِ زر نگارِ صبح
شب ہاے ہجرِ خوبیِ طالع نے مصحفی
رکھا ہمیشہ ہم کو تو امیدوارِ صبح

149

شب میں واں جاؤں تو جاؤں کس طرح بختِ خفتہ کو جگاؤں کس طرح
قصہ خواں بیٹھے ہیں گھیرے اُس کے تئیں داستاں اپنی سناؤں کس طرح
گو میں عاشق ہوں پہ طاقت ہے مری ہاتھ پانو کو لگاؤں کس طرح
رکھ دیا ہے سر پہ اک کوہِ خیال سر کو زانو سے اُٹھاؤں کس طرح
نالہ گریہ کی مدد کرتا نہیں اشک کے نالے بہاؤں کس طرح
چاہ وہ شے ہے کہ چھپتی ہی نہیں اس کو یا رب میں چھپاؤں کس طرح

آ بنی ہے مصحفی کی جان پر
یا رب اپنا جی بچاؤں کس طرح

150

ہوتی ہی نہیں اُس سے ملاقات کسی طرح — کیا کیجیے بنتی ہی نہیں بات کسی طرح
پھر دن کو ہم اور کوچۂ دلچسپ فلانے — کٹ جائے شتابی سے کہیں رات کسی طرح
یوں دام میں آتا ہے کہاں وہ مگر اس کو — سکھلایئے کچھ سحر و طلسمات کسی طرح
رکھیں ابھی گریے کی بنا ہم نئے سر سے — اس سال کی آخر ہو جو برسات کسی طرح
اے مصحفی اتنا نہیں ہستی کا بکھیڑا
یک چند بسر کیجیے اوقات کسی طرح

151

کوٹھے پہ تو آ، میں ترے قربان کسی طرح — گو قید ہے، اتنا تو کہا مان کسی طرح
لڑکا ہے تو چاہت تری کیا تجھ کو جتاؤں — چھپنے کی نہیں تجھ سے یہ، نادان کسی طرح
کیا عاشقِ دلدادہ کو سمجھائے کوئی ہائے — الفت میں سمجھتا نہیں انسان کسی طرح
یا پھیر دو لے کر کے چھری کوئی گلے پر — یا دل سے نکالو مرے پیکان کسی طرح
کیانت کے یہ وعدے ہیں، میاں، میرے بھی گھر میں — اک شب تو رہا چاہیے مہمان کسی طرح
تاگا کوئی باندھے ہے، دیا رکھے ہے کوئی[1] — تا ٹھہرے شبِ گریہ کا باران کسی طرح
پھر اگلے برس ہم نہیں کرنے کے یہ شورش — ہو جائے رفو اب کے گریبان کسی طرح
کیا چاؤ سے میں بھی انھیں آنکھوں کو لگاتا — ہاتھ آتے جو وہ موے پریشان کسی طرح
پھر دیکھیو رنگینیِ صحبت کا مزہ تم — اک شب تو مرے ہاتھ سے کھا پان کسی طرح
اے مصحفی اتنا نہیں ہستی کا بکھیڑا
ہو جائے جو طے تم سے یہ میدان کسی طرح

1- شدید بارش کو روکنے کے عوامی ٹوٹکے

152

دیر کے بعد فلک تو نے دکھایا رخِ صبح
شکر ہے جو کہیں اب بھی نظر آیا رخِ صبح

پشتِ پا کی ترے سرخی کے مقابل نہ ہوا
قلمِ صنع نے ہر چند جگایا رخِ صبح

چاکِ پیراہنِ ساقی پہ پڑھوں کیوں نہ درود
جس کے سینے کے لیے کچھ نظر آیا رخِ صبح

ہم نے شب فرضِ تصور کے ادا کرنے کو
خم کیا سر، تو گریبان میں پایا رخِ صبح

تیرے پنڈے کی صباحت کی صفا کے آگے
باغِ فردوس میں رضواں کو نہ بھایا رخِ صبح

خاک ہم چین سے بیٹھیں کہ شبِ وصل میں تو
ہر نفس روزنِ دیوار پہ پایا رخِ صبح

مصحفی تا کہ ہو تصویرِ دو چشمی یہ غزل
اور بھی اس کے میں پہلو میں لگایا رخِ صبح

153

سودۂ گوہرِ شبنم سے بنایا رخِ صبح
جب لطافت پہ تری گات کی آیا رخِ صبح

جا لڑیں آنکھیں وہیں اپنی تصور سے ترے
بامِ گردوں سے جوں ہی ٹک نظر آیا رخِ صبح

پشتِ پا میں جو ملاحت ہے کسی کے افسوس
تجھ میں اتنا بھی نمک ہم نے نہ پایا رخِ صبح

مہر کو دیجیے رخسار سے اُس کے تشبیہ
جس کے تلووں سے صفا مانگ کے لایا رخِ صبح

گر شبِ وصل کبھی ہم کو میسر آئی
دل کے دھڑکوں نے دو صد بار دکھایا رخِ صبح

تیرے سینے کے بنانے کے لیے صانع نے
بوتۂ مہر میں سو بار گلایا رُخِ صبح

فندقِ ناخنِ پا سے جو گیا کھا کر مات
کبھی اس دن سے نہ پھر عرصے[1] میں آیا رخِ صبح

یار کے چاکِ گریباں سے تجھے کام ہے کیا
تو نے پیراہنِ نسریں نہ سلایا رخِ صبح

مصحفی حیف کہ ظلماتِ شبِ ہجر نے یار
آبِ حیواں کی طرح ہم سے چھپایا رخِ صبح

1- عرصہ = میدان

154

اُس کی رعنائی کے کب سامنے آیا رخِ صبح
جس نے نت چاک سے کہنی کے دکھایا رخِ صبح

خال ایسا نہ رکھا جو ترے رخسار پہ ہے
جب سے مشاطۂ قدرت نے دکھایا رخِ صبح

کس کے سینے کی صفا سامنے ہے آنکھوں کے
جن سے اک بار مرے دل سے بھلایا رخِ صبح

میری طاقت تو نہ تھی آگے ترے نامِ خدا
نور کس رخ کا ترے رخ میں سمایا رخِ صبح

نام ہے جس کا شفق کچھ نہ خبر ہے تجھ کو
سیلِ خوں کس نے یہ آنکھوں سے بہایا رخِ صبح

مجھ کو سنوا کے یہ مرغِ سحری کی فریاد
اور تو دل کو مرے کوفت میں لایا رخِ صبح

اُڑ گیا رنگ ترا ہمرہِ بادِ سحری
تجھ کو کس گل نے یہ نظروں سے گرایا رخِ صبح

جاں بلب تھا میں شبِ ہجر میں، احساں ہے ترا
پانی منھ میں مرے لا تو نے چوایا رخِ صبح

جی میں تھا مہر کے، مذکور ترے رخ کا کرے
پر کرے کیا کہ ادھر اُس نے نہ پایا رخِ صبح

یار جس شب مری بالیں پہ نہ ہووے بیٹھا
نہ دکھانا مجھے اُس شب تو خدایا رخِ صبح

تجھ کو کس منھ سے ہے پھر دعوائے عیسیٰ نفسی
اُس کا کشتہ بھی کوئی تو نے جلایا رخِ صبح؟

مل گیا رہ میں جو وہ چاند کا ٹکڑا اک رات
مجھ کو تاریکیِ شب میں نظر آیا رخِ صبح

قہر ہے چاک گریبان کے رکھنے کی ادا
تو نے نقشا یہ کسی کا تو اُڑایا رخِ صبح

مصحفی کے تئیں دکھلا کے رخِ روزِ وداع
تو نے شبنم کی طرح خوب رُلایا رخِ صبح

155

ہوا نہ ہاتھ مرا تجھ بن آشنائے قدح
لگی لبوں کو نہ ہرگز کبھی ہوائے قدح

دیا شراب سے پیرِ مغاں نے مجھ کو جو غسل
بہ وقتِ غسل بھی پڑھتا گیا دعائے قدح

قدح کشی سے نہ فرصت ملی مجھے اک دم
بنے تھے ہاتھ مرے کیا مگر برائے قدح

گر اس کے چاند سے مکھڑے کا عکس مے میں نہ ہو
کرے نہ سجدہ صراحی کبھی بہ پائے قدح

کدھر ہے ساقیِ گل رخ کہ تا بہ موسمِ گل　شرابِ سرخ سے بھر بھر ہمیں پلائے قدح
حباب بادہ بھلا پائے پھر کہاں سے گہر　گر اس کو اپنی نہ دریا دلی دکھائے قدح
صفائے جام بلوریں کو تیری کب پہنچا　رکھے ہے گو کہ مہِ چار دہ صفائے قدح
وہ کم نصیب ہیں ہم، جن کو دور آخر میں　ملا نہ ہاتھ سے ساقی کے غیر لائے[1] قدح
ترے لبوں کی نزاکت کو کب لگے ہے حباب　ہوا نے سیکڑوں دریا میں گو بنائے قدح

گر اس بغیر کروں مصحفی میں مے نوشی
تو مثلِ لالہ مجھے خونِ دل پلائے قدح

خ

156

لڑانے وہ گیا تھا کیا کہیں سرخ[2]　کہ ہے آج اُس کا دست و آستیں سرخ
ترے کوچے کی قاتل ہر قدم پر　نظر آئی مجھے خاکِ زمیں سرخ
گلوں کا رنگ میں یکساں نہ دیکھا　نظر آئی کہیں زرد اور کہیں سرخ
نہ کر انکارِ قتلِ بے گناہاں　ہے اب تک تو دمِ شمشیرِ کیں سرخ
یہ سر فتراک سے باندھا تھا کس کا　کہ ہے اب تک ترا دامان وزیں سرخ
معاذ اللہ کہ وقت طیش ہووے　مرے قاتل کا روئے آتشیں سرخ

مگر اے مصحفی دیکھے ہے وہ تو
خجالت سے ہے رنگِ یاسمیں سرخ

157

دیکھتے ہی بہار سبز و شخ[3]　ٹوٹ پڑتی ہے خلق جیسے ملخ[4]

1- لائے = تلچھٹ　2- سرخ = پرندہ　3- شخ = واضح　4- ملخ = ٹڈی

بال اس کے ہیں نرم جوں ریشم — اور کمر نازکی میں جیسے نخ[1]
دست پروردِ ناز ہیں تیرے — جرہ و باز و بحری و چرخ[2]
آئینہ آفتاب رخ سے ترے — رفتہ رفتہ پگھل گیا جوں یخ[3]
ہو گئی ساری بزم کھنڈ بکھنڈ[4] — بت گاذر[5] نے یہ مچائی چخ[6]
وصل کی شب جو پاس بیٹھا یار — ہو گئی صبح جلوہ گر، آوخ[7]

مصحفی ہے دعا یہ توریتی[8]
کون سمجھے معانیِ شخ[9]

158

چھینٹیں دامن پر ہیں کچھ، کچھ ہاتھ، کچھ رخسار سرخ — ہے یہ کس بیتاب کے خوں سے تری تلوار سرخ؟
سر پہ جب بجتا ہے اک پیچا مرا خوں خوار سرخ — دم میں کر دیتا ہے روے کوچہ و بازار سرخ
اُس کے رنگِ سرخ کی جب سے جھلک جا کر پڑی — تب سے آتا ہے نظر وہ سایۂ دیوار سرخ
گرچہ گریے سے جگر میں خوں نہیں باقی رہا — گاہے گاہے اب بھی آتا ہے نکل دو چار سرخ
اب کے ہولی میں اُڑا ہے گھڑیوں ہی جو گلال — شہر کے سب ہو رہے ہیں کوچۂ و بازار سرخ
خون کے نالے بہیں گے ہر گلی کوچے کے بیچ — گر اسی صورت رہا چندے لباسِ یار سرخ
مجھ کو یہ ڈر ہے نہ لگ جاوے کسی کے گھر کو آگ — آپ اکثر باندھتے ہیں ان دنوں دستار سرخ
جوش مارا ہے یہ خونِ کشتگانِ عشق نے — جوش سے لالے کے ہے یا دامنِ کہسار سرخ

تازہ داغِ دل کا اپنے ہے یہ عالم مصحفی
جس طرح ہوتی ہے چشمِ کیفیِ سرشار سرخ

1- نخ = ریشم کا تار 2- (یہ چاروں نام پرندوں کے ہیں) 3- یخ = برف
4- کھنڈ بہ کھنڈ = تتر بتر 5- گاذر = دھوبی 6- چخ = شور 7- آوخ = آخ تھو (اظہار بیزاری)
8- توریتی = تورات کی 9- شخ = غالباً عبرانی زبان کا لفظ ہے

د

159

پھرا کرے تری زلفوں میں جب کہ شانہ ٔ باد
تو کیونکے دل نہ ہو آوارہ مثلِ دانہ ٔ باد

ہمارا تیر گر انگشتری کے پار ہوا
تو سمجھے اہلِ حسد اس کو بھی نشانہ ٔ باد[1]

بھرے ہے نعرہ ٔ آبِ رواں کیا ہی شلنگ
لگے ہے اس پہ جو شدت سے تازیانہ ٔ باد

حباب بنتے بگڑتے ہیں لاکھوں دریا میں
تک آنکھ کھول کے کر سیر شیشہ خانہ ٔ باد

نت آہِ گرم سے ہے حشر ونشر دل میں ترے
یہ ہے خزانہ ٔ آتش، ہے یاں خزانہ ٔ باد

نہ نامِ نوح رہا اور نہ طور کا قصہ
نہ ذکر عاد رہا اور نہ وہ فسانہ ٔ باد

مثالِ کوزہ ٔ حدّاد ہے دلِ عاشق
دمے سے آہ کے ہے جس میں کارخانہ ٔ باد

مجھے ترانہ ٔ مطرب سے کام کیا کہ میں مست
سنوں ہوں برگِ درختاں سے نت ترانہ ٔ باد

ہوا زمانے کی اے مصحفی رہی نہیں ایک
کدھر وہ تختِ سلیماں، کدھر زمانہ ٔ باد

160

کرتا ہے بعدِ مرگ کوئی کب کسی کو یاد
جب جیتے جی نہ تم نے کیا مصحفی کو یاد

کرتے نہیں ہیں یاد مجھے جی سے وہ کبھو
یوں یار و دوست، شعر ہیں میرے سبھی کو یاد

کیا تیرے حسن و ناز کا عالم بیاں کروں
نامِ خدا نہیں یہ ادائیں پری کو یاد

ناقہ جو تیز گام ہوا، ووہیں رو دیا
محمل نشیں نے، قیس کی کر بے بسی کو یاد

کھاتا ہے ہر قدم پہ وہ گر گر کے ٹھوکریں
کاہے کو ایسی چال ہے کبکِ دری کو یاد

1- نشانہ ٔ باد = ہوائی نشانہ، اتفاقیہ

عالم میں محو سہو کے رہتے ہیں جو فقیر　رکھتے نہیں کسی کی وہ نیکی بدی کو یاد
ملکِ عدم میں پہنچ کے روتے رہے مدام　یارانِ رفتہ کرکے مری ہمرہی کو یاد
بندے کو اپنے جی سے نہ صاحب بھلایئے　کیجے کبھی تو اُس کے حقِ بندگی کو یاد
گو وقت تنگ ہے نہ رُک اتنا بھی مصحفی
اس وقت میں کر اپنے تو مولا علیؑ کو یاد

161

لے کے کاغذ جو واں گیا قاصد　نقشِ دیوار ہو رہا قاصد
مجھ سے تُو بن ملے گیا قاصد　یہ ستم تو نے کیا کیا قاصد
جوں بنے اُس کے پاس جا قاصد　میرے دل کی خبر تو لا قاصد
مجھ سے ناحق بگڑ گیا ہے وہ شوخ　بات اب تو ہی کچھ بنا قاصد
بختِ واژوں تو دیکھ تو، اس کا　چل کے رستے سے پھر گیا قاصد
جی دھڑکتا ہے ہو نہ رسوائی　اُس کو بھجواؤں کیا حنا قاصد
دلِ صد چاک شانہ ہے مجھ پاس　تحفہ لے جا یہی مرا قاصد
مصحفی وہ تو سخت بد خو ہے　بھیجے اُس پاس کوئی کیا قاصد
ایک تو نامے کے ہوئے پرزے
دوسرے جان سے گیا قاصد

162

اب تلک جو نہیں پھرا قاصد　کیا وہیں مر کے رہ گیا قاصد
خط مرا لے کے جب چلا قاصد　دیر تک مجھ کو تک رہا قاصد
خبرِ مرگ غیر و مژدۂ وصل　دو سے اک بات تو سنا قاصد
مر گئے ہم تو انتظار کے بیچ　خوب آیا تو، مرحبا قاصد

کیا پیام اس کو دوں کہ نزع میں ہوں ق میں اِدھر، تو اُدھر چلا قاصد
خط تو لکھنے کی ہے کسے فرصت اس سے کہیو مری دعا قاصد
رقعۂ گل ہمیں بھجانا تھا ق جن دنوں اپنی تھی صبا قاصد
مصحفی اب تو دم ہے ناک کے بیچ
آہ کو نامہ، و کجا قاصد

163

طالع نے کیا لا کے ہمیں جب سے قفس بند ہے زمزمہ سنجانِ گلستاں کا نفس بند
کہتے ہیں مجھے لختِ جگر آسرِ مژگاں بے شغل نہ رہ اتنا بھی، بے شعلہ بہ خس بند
کوچہ ہے ترا یا یہ کوئی دشتِ بلا ہے ہیں برق سواروں کے جہاں پائے فرس[1] بند
شاید کہ ہوا وادیِ مجنوں کا ارادہ کرتے ہیں جو پھر ناقۂ لیلیٰ کو جرس بند
اے طالعِ بیدار، چڑھاؤں میں چراغی[2] گر وصل کی شب ہو رہِ فریادِ عسس[3] بند
ہے بس یہی احوالِ گرفتارِ تعلق جوں شہد میں ہو جائیں پر و پائے مگس بند
کیا ظلم ہوا تجھ سے اگر باغ چھڑایا اک دم تو زباں اپنی کر، اے مرغِ قفس بند
اک دم جو میں کھولا درِ زندانِ جدائی
اے مصحفی تھے اُس میں کئی اہلِ ہوس بند

164

دکھا نہ اے فلک بے مدار پست و بلند کہاں تلک کوئی دیکھے ہزار پست و بلند
جیے گا ایک نہ عاشق بہ وقتِ تیغ زنی بہ ایں ادا جو ہوا دستِ یار پست و بلند
ملا جو خاک میں کوئی تو اُڑ گیا کوئی گلوں کو کر گئی بادِ بہار پست و بلند
دِلا، نہ رُکیو نشیب و فرازِ ہستی سے یہ راہ گو کہ رکھے ہے ہزار پست و بلند

1۔ فرس= گھوڑا 2- چراغی= بزرگ کے مزار پر نذرانہ 3- عسس= کوتوال، چوکیدار

یہ گرد باد نہیں آہ کوہ و صحرا میں　　فلک زدوں کا رہے ہے غبار پست و بلند
لگا یہ ناوکِ کاری کہ اک ذرا نہ ہوا　　خدنگِ ناز کا اُس کے غبار پست و بلند
کبھی پیادہ، کبھی ہیں سوار اہلِ جہاں　　دکھائے ہے نت اُنھیں روزگار پست و بلند
تڑپ کے جان نہ دی بسکہ تیرے کشتے نے　　یہ لاشہ اُس کا ہوا پایدار پست و بلند
زمیں کا ہوگیا پیوند، جب زمانے کا　　اُٹھا سکا نہ ترا خاکسار پست و بلند
سمجھ کے جائیو شیریں، بہ جانبِ فرہاد　　رکھے ہے لاکھ رہ کوہسار پست و بلند
ہوا سے ہے وہ سر زلف یوں تحرک[1] میں　　کرے ہے کفچہ[2] کبھی جیسے مار پست و بلند
غزل اک اور بھی لکھ مصحفی کہ اب تو ہوئے
ہزار طاہر معنی شکار پست و بلند

165

ہوا یہ رقص میں شب دستِ یار پست و بلند　　کہ اپنا بھول گیا روزگار پست و بلند
یہ جوش پر ہے مرے موجِ اشک کا دریا　　کہ موج ہوتی ہے بے اختیار پست و بلند
نگاہِ خشم نے کیا کیا نہ لطف دکھلائے　　ہوا جو ٹک کفِ آئینہ دار پست و بلند
گلی میں اُس کی جو مارے گئے ہیں خُرد و بزرگ　　نظر پڑیں ہیں ہزاروں مزار پست و بلند
کیا ہے بادیۂ دل کی رہ کو میں ہموار　　قدم پڑے نہ ترا تا کہ یار پست و بلند
نہالِ قد کی لچک تیرے یاد آتی ہے　　ہوا سے ہوتی ہے جب شاخسار پست و بلند
رہا نہ سر، سرِ بالیں پہ دو گھڑی میرا　　ہوا کیا بہ شبِ انتظار پست و بلند
نہ کیونکے خاک میں مل جائے قیس جب دیکھے　　بہ گرد ناقۂ لیلیٰ غبار پست و بلند
لچک سے اس کے قدِ سرخ پوش کا ہے یہ رنگ　　ہوا سے شعلہ ہو جوں بار بار پست و بلند
دریغ میں نے نہ دیکھا کنارِ بام سے صبح　　ہزار بار ہوا روے یار پست و بلند
کلام کس کا شتر گربگی سے خالی ہے　　ہر ایک شعر میں ہیں یاں ہزار پست و بلند

1۔ تحرک = (بروزن تبرک) = حرکت　2- کفچہ = سانپ کا پھن

خدا کے واسطے کر مصحفی اب آنکھیں بند
بہت زمانے کا دیکھا میں یار پست و بلند

ڈ

166

شب کو آ نکلے گر وہ گاتے کھنڈ[1] مجلس گاذراں ہو کھنڈ بہ کھنڈ
سایۂ سدرہ میں جو ہم بیٹھے اپنی قسمت سے ہو گیا وہ اَرنڈ[2]
جب سے عاشق ہے عشق پر مغرور خوب رویوں کو حسن کا ہے گھمنڈ
ہاتھ میں کچھ ہنر ہو جس کے وہ شخص شوق سے گھر میں بیٹھا پیلے ڈنڈ
قرصِ مہ اُس کے پیچھے چھپ جاوے اُس پہ رکھ دوں جو داغِ دل کا کھرنڈ
دلِ عاشق کی کیا گرہ کھلتی کہ طبیعت میں تھا یہ بارہ سٹنڈ
بہرِ صیقل گریِ تیغِ نگاہ مردمِ دیدۂ بتاں ہے کرنڈ
جاہِ دنیا کے واسطے کب تک ق مصحفی تو کرے گا نت پاکھنڈ[3]
خاک میں مل گئے یہاں ناداں
سیکڑوں مثلِ راجہ بلی بنڈ

167

ہے مری آہ کو اُس قامتِ آزاد پہ لاڈ جیسے کرتی ہے صبا باغ میں شمشاد پہ لاڈ
مرغِ دل کیوں نہ ہو اُس زلف میں پھنس کر مغرور دام نو کردہ کو ہوتا ہی ہے صیاد پہ لاڈ
اب تو کہتا نہیں کچھ منھ سے یہ داور کے حضور روزِ محشر میں کروں گا تری بیداد پہ لاڈ
حسن وہ شے ہے کہ عاشق سے بھی ہے مستغنی کیا خسرو نے نہ شیریں پہ، نہ فرہاد پہ لاڈ

1۔ کھنڈ = دھوبیوں کا گیت 2- ارنڈ = ایک درخت جس کا تیل دوا میں کام آتا ہے
3- پاکھنڈ = فریب، جعلسازی

ایسی ہی شکل بنائی ہے تری صانع نے　نہ کرے کیونکے تو اس حسنِ خداداد پہ لاڈ
یعنی کیا مجھ سے بن آیا ہے پری کا نقشا　کلکِ بہزاد کو ہے صنعتِ بہزاد پہ لاڈ
مصحفی جس کا خدا تجھ کو بناوے استاد
نہ کرے کیونکہ وہ شاگرد پھر استاد پہ لاڈ

ذ

168

جوں ہووے منقّش خطِ گلزار سے کاغذ　گلزار ہوا یوں مرے اشعار سے کاغذ
اُودھر سے جواب ایک کا پایا نہ اگرچہ　پھینکے میں بہت رخنۂ دیوار سے کاغذ
عاشق کی ترے اس سے تسلی نہیں ہوتی　جب تک وہ پڑھاتا نہیں دو چار سے کاغذ
باہم مرے اور اُس کے یہ مضمون گُتھا ہے　واقف ہی نہیں جس کے کچھ اسرار سے کاغذ
سنتا ہے جو دو چار غزل بھی مری مجھ سے　لینے وہیں جاوے ہے وہ بازار سے کاغذ
قاصد مرا خط دیوے تو اُس کو تو یہ کہیو　بچوائیو یہ مردمِ ہشیار سے کاغذ
جھڑ جھڑ کے جو پر اُڑتے رہے مرغِ چمن کے　لاکھوں میں گئے مرغِ گرفتار سے کاغذ
آخر وہی افسانۂ بازار ہوا ہے　رکھا تھا چھپا ہم نے جو اغیار سے کاغذ
بٹنے کے لگانے سے بدن اُس کا یہ چمکا　جوں پائے صفا مہرۂ آبار سے کاغذ
شیرازے میں پاتا ہوں میں تا صحفِ سماوی　مربوط ہے کیا رشتہ و زنار سے کاغذ
جز برگِ گلِ ریختہ از حسن و لطافت　لائی نہ صبا ہم کو چمن زار سے کاغذ
ہیں سینے کے صفحے پہ خطِ تیغِ بتاں یوں　مسطر کا بنے جیسے کہ پرکار سے کاغذ
اے مصحفی آتا ہے یہ اب جی میں کہ پھر بھی
ہو قندِ مکرر تری گفتار سے کاغذ

169

جب آیا ہے ہم کو کسی سرکار سے کاغذ — لپٹا ہے دو رویہ گلۂ یار سے کاغذ
ہم تاؤ کے یاں تاؤ سیہ کرتے ہیں اور وہ — لکھتے ہی نہیں ہم کو کبھی عار سے کاغذ
لفظوں کی جگہ دی ہیں لگا مردمِ دیدہ[1] — معمور ہے یہ حسرتِ دیدار سے کاغذ
لکھنے کو مرا محضرِ خوں وہ بتِ کافر — رنگین ہی منگوائے ہے بازار سے کاغذ
ہے شک جو غلامی میں مری تم کو تو صاحب — لیجے نہ لکھا اپنے گنہگار سے کاغذ
اے زاغ تو نامے کو مرے لے تو چلا ہے — رستے میں گرا دیجو نہ منقار سے کاغذ
عاشق کو ترے ضعفِ بصر ہے، ترے خط کو — پڑھتا ہے لگا تب تو وہ رخسار سے کاغذ
میں شعر جو بوسے کے کئی اُس کو لکھے ہیں — پڑھنے میں لگا لے ہے وہ رخسار سے کاغذ
کوچے کی ترے طرفہ حقیقت ہے کہ ہر صبح — دیکھوں ہوں لگے میں در و دیوار سے کاغذ
ایجاد ہے کس کا یہ ستم، آہ میں دیکھا — لپٹا قفسِ مرغِ گرفتار سے کاغذ
گردوں کا سدا کام ہے اک نقشہ نویسی — ہوتا ہے جُدا کب کفِ معمار سے کاغذ
مشکل ہے دو چسپیدہ کا آپس سے چھڑانا — وصلی کا جدا ہووے نہ تلوار سے کاغذ
قاصد تو یہ کہیو کہ دیا سادہ خط اُس نے — لکھا نہ گیا جب ترے بیمار سے کاغذ
پھاہا اُسے مرہم کا سمجھ لے گئے بعضے — مقراض[2] ہوا تھا جو خطِ یار سے کاغذ
کچھ واقعہ لکھ لکھ کے بیابانِ جنوں میں — میں باندھ گیا ہوں سرِ ہر خار سے کاغذ
مضمونِ گراں جانیِ عاشق جو لکھا تھا — تھا تول میں بھاری کئی دینار سے کاغذ
ہر چند کہ صاحب سخناں سب ہی بلا ہیں ق محشر کدہ ہے اُن کے ہر اشعار سے کاغذ

کیا جانے میاں مصحفی کیا قہر کریں گے
جس وقت نکالیں گے یہ دستار سے کاغذ

1- مردم دیدہ = آنکھ کی پتلیاں 2- مقراض ہوا تھا = تراشا گیا تھا

ر

170

اے دل سراغِ دلبرِ طنّاز پھر بھی کر
اک بار اُس سے بہرِ خدا ساز پھر بھی کر

وہ اک پکارنے میں نہ بولے تو دل کہے
آیا ہے تو، تو در پہ اک آواز پھر بھی کر

گر چھوٹ کر قفس سے، قفس میں میں پھر پھنسوں
شوقِ چمن کہے مجھے، پرواز پھر بھی کر

اتنے میں بے وفائی، یہ کیا تجھ کو ہو گیا
ملنے کا عہد خانہ بر انداز پھر بھی کر

اخلاص و ربط کی ترے باتیں کدھر گئیں
خواہش بہ سوے عاشقِ جانباز پھر بھی کر

یک بار مل کے پھر نہ ملا تُو، یہ کیا ہوا
عاشق کے منھ پہ وصل کا در باز پھر بھی کر

خوش ہو جو تیری چشم کی گردش سے آسماں
تو تجھ سے یہ کہے کہ وہی ناز پھر بھی کر

میں جی سے دوستدار ہوں تیرا تری قسم
تو مجھ کو اپنا محرم و ہمراز پھر بھی کر

خالی پڑا ہے عرصہ تری صید گاہ کا
پہلی طرح سے اس میں تگ و تاز پھر بھی کر

ظالم ترے فراق میں مرتا ہے مصحفی
یُمنِ قدم سے اِس کو سرافراز پھر بھی کر

171

میں جھیلوں ہوں اس میگ[1] ڈمبر کی ٹکر
مری چرخ کی ہے برابر کی ٹکر

میں دشمن سے کچھ زور میں کم نہ نکلا
اُٹھاتا ہے ہمسر ہی ہمسر کی ٹکر

مزہ ہے جو آتے ہوئے تیرہ شب میں
مرے سر کو لگ جائے دلبر کی ٹکر

نہ ہو روکشِ چرخ اے دل کہ تجھ سے
نہ سنبھلے گی اس فوج پیکر کی ٹکر

بہت دیر و کعبہ میں سر میں نے مارا
نہ بھولی و لیکن ترے در کی ٹکر

1- میگ = بادل

مرا دل وہ رستم تھا میری بغل میں ق سمجھتا تھا میں جس کو لشکر کی ٹکر
سو میدان میں آج بسمل پڑا ہے کہیں یار کے لی تھی خنجر کی ٹکر
ہوا مصحفی سے فرو سر عدو کا
سنبھالی نہ فربہ نے لاغر کی ٹکر

172

بنایا ایک کافر کے تئیں اُس دم مَیں دو کافر مرے منھ سے جو نکلا ناگہاں او کافر او کافر
مسلماں دیکھ کر اُس بت کی صورت کو یہ کہتا ہے مسلمانی کہاں کی؟ باندھ لے زنار، ہو کافر
تجھے پروا نہیں ہرگز کسی کی، تو ہے بے پروا ترے اس حسنِ کافر پر پری ہو جائے گو کافر
شب ہجراں میں جو دل دم بہ دم فریاد کرتا ہے خفا ہو کر کہوں میں کوئی ساعت، تُو تو سو کافر
کہاں تک اے دلِ شوریدہ تو آنسو بہاوے گا شب آئی صبح ہونے پر، بس اتنا بھی نہ رو کافر
ہم اپنا دین و ایماں پہلے اُس کو نذر کرتے ہیں ہمارے سامنے اس شکل سے آتا ہے جو کافر
تری باتوں سے تو اے مصحفی جی اپنا تنگ آیا
خدا کے واسطے چپ رہ، نہ میری جان کھو کافر

173

باندھ صیاد نہ یوں بلبلِ دل گیر کے پر اس کے بازو سے تو کر پہلے جدا، تیر کے پر
تیر پر تیر کئی لگتے ہیں دائیں بائیں کیا نکل آئے ہیں ظالم ترے نخچیر کے پر
بال[1] بلبل پہ ترا ناوک دل دوز ایسا جم کے بیٹھا کہ نکالا میں اُسے چیر کے پر
بام تک اُس کے بھلا کیونکے کبوتر پہنچے واں تو جلتے ہیں مرے نالۂ شب گیر کے پر
بال بکھرے ہوئے کاندھے پہ لکھے مانی نے اے پری زور بنائے تری تصویر کے پر
طائرِ نالہ مرا عرض کی دھن رکھتا ہے بار[2] الٰہا تو اِسے دیجیو تاثیر کے پر

1- بال= بازو، پَر 2- بار الٰہا = یا اللہ (روزمرہ)

اُڑ کے آتی وہ ترے ملنے کو مانندِ پری　رانجھا، آتے جو نکل ہیر کی زنجیر کے پر
بحرِ خوں سے جو یہ ساحل پہ تڑپ کر آئے　کس نے باندھے تھے تری، ماہیِ شمشیر کے پر
جب کترنی سی زباں چلتی ہو تب باؤ بندھے[1]　مرغِ معنی کے تئیں چاہئیں تقریر کے پر
مصحفی باج سلیماں اُسے دیوے جو اُڑے
ہُدہُدِ خامہ ترا باندھ کے تسخیر کے پر

174

چین آتا ہی نہیں مجھ کو ذرا بستر پر　بے قراری سے میں تڑپوں ہوں پڑا بستر پر
مجھ کو خطرہ ہے کہیں صبح میں بدنام نہ ہوں　کھنڈ گئی ہے ترے پانووں کی حنا بستر پر
دیکھ آیا جو تری نرگسِ بیمار کا ضعف　گھر میں آتے ہی وہ بے سدھ ہو گرا بستر پر
بیکلی تھی تجھے شب یاد میں کس گل کی دلا　تو نے تا صبح جو پہلو نہ رکھا بستر پر
عشق بازوں کے ترے، برگِ سمن کی جاگہ　پرِ پروانہ بکھیرے ہے صبا بستر پر
جس کی خاطر میں کیا فرشِ شہی کا ساماں　پانو بھی ناز سے اس نے نہ دھرا بستر پر
اس میں کیا باغ کا نقصان تھا، میرے بھی کبھو　پھینک جاتی جو کوئی پھول صبا بستر پر
ہم تو سونے کے اُس آزاد کے دیوانے ہیں　جس نے جز ہاتھ کے بالیں نہ دھرا بستر پر
وصل کا لطف تو تب ہے کہ شبِ ماہ کے بیچ　ہو کسی صاف اَدرسے[2] کی ردا بستر پر
مصحفی عاشقِ مجروح کی خاطر شب ہجر
دیوے ہے ریزۂ الماس بچھا بستر پر

175

خراشیدن کے ساتھ آیا دلِ بیتاب ناخن پر　نچایا عشق کی صنعت نے یاں سیماب ناخن پر
یہ اُلفت ہو گئی ہے اُس سے ہر تارِ گریباں کو　کہ رہتا ہے سدا پیچیدہ جوں مضراب ناخن پر
سرِ ناخن پہ دیکھ اُس کی حنا کا رنگ، دل بولا　غروب اس جا ہوا خورشیدِ عالم تاب ناخن پر

1- باؤ بندھنا = ہَوا بندھنا، اُڑنا　2- ادرسہ = کپڑے کی ایک قسم

صبا گر دیکھتی گلدستۂ دستِ حنا بستہ — تو ہر پھر وارتی برگِ گلِ سیراب ناخن پر
جو تھا ساجد خم ابرو کا اُس کے، بعد مردن بھی — بسانِ فلس ماہی تھی بنی محراب ناخن پر
حنائی روے پشت اس کے کا ہے یہ مصحفی عالم
کہ ہے چسپیدہ گویا پارۂ عناب ناخن پر

176

موقوف اور باتیں سب رکھیں یار ہی پر — بس ہم نے کی قناعت، بوس و کنار ہی پر
رنجور جان مجھ کو کرتے ہو قصد میرا — زور آپ کا چلے ہے زخمی شکار ہی پر
کوچے تلک رسائی پائی نہیں کسی نے — مر مر گئے ہیں کتنے اس رہ گزار ہی پر
مدفن میں کشتگاں کے جا کر ہوا وہ نادم — پانو اس کا آپڑا جب میرے مزار ہی پر
جوے چمن بھی گرچہ چلنے میں بہبی[1] ہے — لوٹے ہے دل پر اپنا کچھ آبشار ہی پر
اُس گل کی خوبیِ تن دیکھی نہیں ابھی میں — جی ہاتھ سے گیا ہے نقش و نگار ہی پر
آواز خندۂ گل کب کان میں پڑے ہے — ہم نے تو غش کیا ہے صوتِ ہزار[2] ہی پر
کیا روزگار سے ہے پھر کام مصحفی کو
اُس نے کیا تبرّا جب روزگار ہی پر

177

جانے کا پتا اپنے بتاتے ہو کہیں اور — یہ طرفہ تماشا ہے کہ جاتے ہو کہیں اور
یہ بات کچھ اچھی نہیں سمجھو تو، جو ناحق — دل مجھ سے جدا کر کے لگاتے ہو کہیں اور
ہنگامِ سحر آؤ ہو، کر میرا بہانا — جا آخرِ شب فتنے جگاتے ہو کہیں اور
اے وائے کہ تیرِ نگہ ناز کو اپنے — پھینکو ہو کہیں اور، دکھاتے ہو کہیں اور
ویران کرو ہو مرے کاشانۂ دل کو — جا جا کے گھر الفت کا بساتے ہو کہیں اور
کیا کو تہی دیکھی ہے مرے دامِ قفس سے — جو مرغِ دل اپنے کو پھنساتے ہو کہیں اور

1- بہبی = اچھی رفتار والی 2- ہزار = ایک چھوٹا پرندہ، ممولا

یہ مصحفی سے آپ کی چوری نہ چھپے گی
غیبت ہی سے ظاہر ہے کہ جاتے ہو کہیں اور

178

جانا نہ تھا میں تم کو جفا کار اس قدر ۔۔۔ دلدار ہو کے، ہو گے دل آزار اس قدر
بھولے سے بھی کبھی نہ کیا پھیر ہم کو یاد ۔۔۔ تم یار ہو کے ہو گئے اغیار اس قدر
بے اعتنائی اتنی گرفتارِ عشق سے ۔۔۔ کہہ کس طریق میں ہے روا، یار اس قدر
تقصیر تو مری مرے صاحب بتایئے ۔۔۔ کیوں ہو گئے ہو بندے سے بیزار اس قدر
یوسف کی شانِ حسن کی مطلق خبر نہیں ۔۔۔ سودے میں محو ہیں یہ خریدار اس قدر
پہلو میں اب تو تیر سا گڑنے لگا یہ ہائے ۔۔۔ دیتا نہ تھا دل آگے تو آزار اس قدر
جب تک کہ اُس کے حسن سے پردہ اُٹھا نہ تھا ۔۔۔ ہم کو بھی تھی نہ خواہشِ دیدار اس قدر
جوں نقشِ پا نہ خاک سے ہم کو اُٹھا سکیں ۔۔۔ پامال کر گئی تری رفتار اس قدر
ہر تارِ زلف مجھ کو رگ جاں سے ہے عزیز ۔۔۔ ہے دل میں میرے الفتِ زُنّار اس قدر
آخر مَیں شہر چھوڑ کے صحرا کی راہ لی ۔۔۔ وحشت فزا ہوئے در و دیوار اس قدر
بالیں سے سر اُٹھا نہ سکے ہم، ہزار حیف ۔۔۔ فرقت میں تیری ہو گئے بیمار اس قدر

آئی نہیں چمن میں گر اے مصحفی بہار
پھڑکیں ہیں کیوں قفس کے گرفتار اس قدر؟

179

یا نہ نکلے تھا کبھی چشم سے قطرا باہر ۔۔۔ یا یہ حالت ہے کہ اب نکلیں ہیں دریا باہر
بدگماں ہوں میں مرے دل کا تو کر پاس ذرا ۔۔۔ تیرہ شب میں نہ نکل گھر سے تو تنہا باہر
خوبی رنجش کی ذرا دیکھو وہ گھر میں میرے ۔۔۔ بے دماغانہ گر آیا بھی تو بیٹھا باہر
اُس پری پر ہوں میں عاشق کہ تصور جس کا ۔۔۔ پانْو دروازے سے اپنے نہیں رکھتا باہر

بسکہ تھا سوختۂ داغِ جدائی تنِ زار — فصد لی میں نے، تو نکلا یہی سودا باہر
شب ترے گھر میں ہوا کچھ تو، جو سرگوشی میں — لوگ کرتے ہیں سب اس بات کا چرچا باہر
اپنے کوچے سے کھلے بال، یہ کیا خو ہے تری — نکل آتا ہے تو، کیوں شب کو اکیلا باہر؟
مرغِ دل مائلِ پروازِ چمن تھا لیکن — حلقۂ زلف سے پانو اس کا نہ نکلا باہر
خون کشتے کا ترے جس پہ گرا تھا وہ خاک — نت نکالے ہے گُل لالۂ حمرا[1] باہر

مصحفی سر کو جھکا دیتے ہیں مجھ سے لاکھوں
میان سے نکلے ہے جب شوخ کا تیغا باہر

180

گزرا قیس کا جس دم ہوا لیلیٰ کی تربت پر — تخیل میں نظر اُس دم پڑی اپنی ہی میت[2] پر
ترا منھ دیکھتا ہے اور مطلق کچھ نہیں کہتا — مجھے حیرت نہ آوے کیونکے آئینے کی حیرت پر
وہ ماہِ چاردہ گر پشت بام اوپر نہیں آتا — ستارے ٹکٹکی باندھے ہوئے ہیں کس کی صورت پر
اگرچہ نقشِ شیریں کوہ کن سے خوب بن آیا — پر اے کلکِ تصور آفریں تیری بھی صنعت پر
خط آئے پر رخِ گلگوں نے تیرے اور سج بدلی — یہ لالہ ہو گیا مغرور نافرماں کی صحبت پر
جو گل ہے لالہ ساں جھلسا نظر آتا ہے گلشن میں — یہ کس کے حسن کی بجلی پڑی پھولوں کی رنگت پر
اُٹھا سکتے نہیں اک آن بھی صدمہ جدائی کا — تحمل کا ہمیں دعویٰ ہے پھر کس تاب وطاقت پر
کہیں نوکِ زباں کی اس کے مسی دیکھ آئی تھی — صبا ہنستی ہے اب تک برگِ لالہ کی نزاکت پر
مگر کرنے لگے تم چوری چوری پھر سے اوباشی — کہ ہے کچھ ان دنوں میں رنگ چہرے کا شرارت پر
خدا نے موسمِ گل میں یہ کیا تاثیر رکھی ہے — جوان روزوں مزاجِ عشق آجاتا ہے وحشت پر
کیا سیراب جب اُس نے مری تربت کے سبزے کو — ہزاروں رحمتیں نازل ہوئیں بارانِ رحمت پر
نہ کہہ بھیجا زبانی کچھ، نہ لکھ کر نامہ بھجوایا — تم ایسے ہوگئے بے دید ہم سے، اتنی چاہت پر

1- حمرا = سُرخ 2- صحیح تلفظ یائے مشدّد مکسور سے ہے مصحفی نے مفتوح باندھا ہے اور یہی اردو ہے (روزمرہ)

کوئی کیسا ہی ہو، دل میں مرے ممکن نہیں پیارے محبت غیر کی پاوے جگہ تیری محبت پر

جیے کیا وہ مریضِ عشق جس کی جان پر ہر دم مصیبت ہو مصیبت پر اذیت ہو اذیت پر

نہ ہو گر جلوۂ نورِ تجلی درمیاں اُس کے برہمن اتنا وا رفتہ نہ ہو پتھر کی مورت پر

کہیں ہیں جس کو ہستی، وقفہ ہے آمد شدِ دم کا
بھلا اے مصحفی کیا کیا کریں ہم اتنی فرصت پر؟

181

پڑھ نہ، اے ہم نشیں، وصال کا شعر جس سے رنگیں ہو خط و خال کا شعر

یوں تلاشی[1] جو چاہے لکھ جاوے لیک مشکل ہے بول چال کا شعر

طول کھینچا بیانِ نک سِک[2] نے میں لکھا اُس کے بال بال کا شعر

اس کے عشقِ کمر میں، اے یارو ق ہم تو کہنے لگے خیال کا شعر

سو خیالی بھی ایسا جس کے حضور گرد ہے میرزا جلال[3] کا شعر

مصحفی تیرے شعر دل کش کو
اب تو لگتا نہیں کمال کا شعر

182

کیا آج دل ڈُھلا[4] ہے ان تاک مذہبوں[5] پر مدت سے آ رہا ہے سیسر[6] کے یہ لبوں پر

تیرے مریضِ غم کی رخصت میں دیر کیا ہے؟ موقوف رہ گئی ہے اب ایک دو شبوں پر

جو شاہِ عشق کے ہیں ہم سے قدیم نوکر دیتے ہیں جان اپنی خواری کے منصبوں پر

گو اختلاف ان میں لاکھوں طرح کے ہوویں ہے اتفاق سب کا خوباں کے مذہبوں پر

زیرِ ذقن ہے اُس کے جو اک صفا مجسم وہ لطف میں نہ دیکھا حوروں کے غبغبوں پر

آیا تھا بام پر تو جس رات چن کے افشاں کچھ اور ہی سماں تھا اُس رات کوکبوں پر

1- تلاشی = تلاش کیا ہوا مضمونِ شعر 2- نک سِک = ناک نقشہ، خط و خال 3- میرزا جلال اسیر فارسی کا مشہور شاعر۔ 4- ڈھلنا (بروزن گھلنا) = مائل ہونا 5- تاک مذھب = انگور کی بیل سے تعلق رکھنے والے۔ 6- سیسر = سُرسُلی (چھوٹا کیڑا)

اے مصحفی نہیں ہم اس کی (گلی) میں تا صبح
پیسیں ہیں دانت ناحق ہم رند مشربوں پر

183

لُٹ گیا جاتے ہی اُس کے تاب اور طاقت کا گھر
ٹوٹے جوڑے رہ گئے گھر میں، سو ہے تہمت کا گھر

جس میں اک دن بیٹھتے ہم تم بہم اے میری جاں
آج تک ایسا نہ ہاتھ آیا کوئی فرصت کا گھر

گر گلستاں میں کبھی جاتا ہوں میں سودائی تو
وہ بھی بن جاتا ہے وحشت سے مری، وحشت کا گھر

عشق میں یوسف کے اُس نے وو ہیں ویراں کر دیا
تھا زلیخا کا جُوا چپڑا [1] جو اک مدت کا گھر

عہدِ یاری غیر سے مت باندھ اے رشکِ بہار
مان لے کہنا مرا ویراں نہ کر الفت کا گھر

سارے عالم کی سمائی اُس میں ہوہی جاوے گی
ہے وسیع، اے صانعِ عالم تری رحمت کا گھر

اس کی دُوری میں ہمیں مرنا پڑا ہے رات دن
عشق کیا ہے دوستو، ہے یہ تو اک زحمت کا گھر

وہ بھی کیا دن تھے کہ بہر یک نگہ اے مصحفی
سال ہا ڈھونڈا کیے دلّی میں ہم عصمت [2] کا گھر

184

آئے تھے ہم یاں تو سامانِ خدائی دیکھ کر پھر چلے آخر بتوں کی بے وفائی دیکھ کر

1- جُوا چپڑا = بنایا سنوارا ہوا 2- مصحفی کی محبوبہ

آشنائی کرتے ہی آخر کو تم نے ترک کی
ان بتوں کی راہ و رسم آشنائی دیکھ کر

رات بدلی سے ذرا سا سر نکالا تھا، ولے
چھپ گیا مہ اُس کے پنڈے کی صفائی دیکھ کر

دل کی ہم سوداگری کرنے چلے سوئے عدم
دمبدم ان دلبروں کی دل رُبائی دیکھ کر

اور ہی مجھ کو زمیں اور آسماں آیا نظر
سر پہ اُس کافر کے وَسمے کی رضائی[1] دیکھ کر

سرکشانِ بزمِ حسنِ خوب روئی نے وہیں
سر جھکایا اُس کی شانِ کبریائی دیکھ کر

اُس کی تربت پر چڑھانا نخلِ مرجاں[2] کا عَلَم
مر گیا ہووے جو وہ دستِ حنائی دیکھ کر

ہو گئے آخر مطیع سبزۂ سبزانِ ہند
آئے تھے جو خطِ خوبانِ خطائی[3] دیکھ کر

اپنا کر رکھا میں اس کو اپنے صدقِ عشق سے
ہو گیا عاشق وہ میری پارسائی دیکھ کر

ہاتھوں میں پھولوں کے گجرے، شوق سے پہنو میاں
پر ذرا اتنا کہ وہ نازک کلائی دیکھ کر

مصحفی میرا صنم بھی ہے وہ بُکا نور کا
غش کرے صورت کو جس کی نُور بائی[4] دیکھ کر

185

یا دیکھتے تھے ہر دم پردہ اُٹھا اُٹھا کر
یا پھیر لیں نگاہیں آنکھیں ملا ملا کر

منہ سے پتے کی میرے نکلی تھی کچھ، سو اس پر
جی کھا گئے وہ میرا ہر دم بلا بلا کر

اب اور کیا لگاوٹ کرنی ہے تم کو ہم سے
دل خون تو کیا ہے مہندی لگا لگا کر

انگشت گر[5] کا لڑکا آتش کا ہے بھبوکا
دل کو یلا کرے گا آخر جلا جلا کر

کیا جانے وصل اُس کا ہوتا ہے کس کو روزی
ہم کو تو مار ڈالا صورت دکھا دکھا کر

ہر گام پر گلی میں اپنی سُلا رکھے ہیں
اس پشتِ پا نے لاکھوں فتنے جگا جگا کر

گالوں میں ان بتوں کے چاول بھرے ہیں گویا
جو اس قدر کریں ہیں باتیں چبا چبا کر

1- رضائی = اوڑھنے کا ہلکا لحاف، وَسمہ = کامدانی 2- نخل مَرجاں = مُونگے کا پیڑ
3- خطا = ایک شہر جو چین میں بتایا جاتا ہے۔ 4- نور بائی = اپنے زمانے کی مشہور ڈیرے دار طوائف جسے نادر شاہ اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ 5- انگشت گر = انگوٹھیاں بنانے والا

اب ہاتھ کو تمھارے میں کوئی چھوڑتا ہوں؟ جاتے رہے ہو اکثر بتّا[1] بتا بتا کر
کیا ہم ذبیل[2] اُن کے ہیں اس قدر، جو جویاں دیکھا کریں ہیں ہم کو آنکھیں دبا دبا کر
یا چپ رہا وہ پہروں، یا جب کبھی کہ بولا روتوں کو مار ڈالا دم میں ہنسا ہنسا کر
وہ رتبجھتا نہیں اور، آزاد پیشہ کتنے لاتے ہیں روز کیا کیا نقشے بنا بنا کر
اک میں ہی غیر ٹھہرا، اور میرے مدعی کو خط بھیجتے رہے تم، مجھ سے چھپا چھپا کر
مر ہی چلے تھے ہم تو، پر شکر وقتِ پیری اُلفت سے ان بتوں کی چھوٹے خدا خدا کر
افیوں کا جس نے گھولا ہر دم پیا وہ آخر تحت الثریٰ کو پہنچا گردن جھکا جھکا کر
دستِ جنوں سے ازبس صد چاک تھا گریباں میں سوزنی بنایا اس کو سِلا سِلا کر

اے مصحفی کہیں کیا جوں شمع داغِ غم نے
آخر بٹھا دیا ہے ہم کو گھلا گھلا کر

186

ستم اتنا نہ کر، ظالم تو ہم پر ہماری زندگی ہے تیرے دم پر
بیابانِ محبت کی تو کر سیر کہ واں سٹھراؤ[3] ہیں ہر ہر قدم پر
سفالی کاسۂ درویش خالی کرے ہے خندہ، یاں نت جامِ جم پر
لگا جب طائرِ دل پر ترا تیر قیامت ہو گئی صیدِ حرم پر
دل اُس کے میں تو شفقت ہے ولیکن مزاجِ یار ہے مائل ستم پر
مرے اعمال نامے کی سیاہی جھڑے ہے کاغذ و روئے قلم پر
نہیں رنگِ جہاں ہرگز قراری نہ ہو مغرور اِس جاہ و حشم پر
بہارِ زیست فرصت ہے شرر کی کرے کیا کیا کوئی اِس عمرِ کم پر
غمِ قوّت و فراق و ناتوانی یہ آفت ہیں مرے اس ایک دم پر

1- بتّا بتانا = حیلے کرنا، دھوکا دینا 2- ذَبیل = داب کھانے والے، مرعوب
3- سٹھراؤ ہیں = کشتوں کے پشتے لگے ہوئے ہیں۔

قوی جو تھے سو وہ آگو ہی بھاگے　　جو باقی ہیں سو ہیں اب وے بھی رَم[1] پر

مجھے دیکھوں تو کب تک مصحفی حرص
رکھے گی سکّہ وش چسپاں درم پر

187

غور سے دیکھے کوئی کس کس کے ہے ست[2] کا ظہور　　تا فلک ہے جلوہ گر صانع کی قدرت کا ظہور

ہم پہ جو ہونا ہو یارب آج ہی ہو جائے کاش　　ایک دن آخر تو ہونا ہے قیامت کا ظہور

ہم نے پہچانا ہے تجھ کو، اے نگار پردہ پوش　　ہے ہر اک صورت میں یہ تیری ہی صورت کا ظہور

نشۂ غفلت میں آ کر ہو گئی ہے خلق مست　　چشم عبرت بیں ہو تو سب ہے یہ عبرت کا ظہور

میں کہاں اور خال و خط کی چہرہ پردازی کہاں　　ہے یہ کلک صنع صانع کی ہی صنعت کا ظہور

اپنے کشتے کو جہاں گاڑا ہے، قاتل تو نے واں　　بعد چندیں سال ہوگا اُس کی تربت کا ظہور

مصحفی در در نہیں پھرتے ہیں وے عالی دماغ
کچھ نظر آتا ہے جن کو کنجِ عزلت کا ظہور

188

آخر ہوا وہ حسن بہ زیرِ نقاب خوار　　اُس کی ہوس میں رہ گئے کیا کیا شراب خوار

اللہ رے تیرے جامۂ گل رنگ کی مہک　　جس کی لپٹ سے ہووے شمیمِ گلاب خوار

خط لے گیا تھا اُس کی گلی میں سو اب تلک　　قاصد پڑا پھرے ہے برائے جواب خوار

کودک مزاج خلق نے سمجھے نہ میرے شعر　　لڑکوں کے ہاتھ پڑ کے ہوئی یہ کتاب خوار

رہتا نہیں ہے حسن بہت اُس کا مصحفی
جو طفلِ سادہ رُو کہ ہو پیش از شباب خوار

189

پڑے بال بھیگے ہوئے جب کمر پر　　وہیں برق ہنسنے لگی ابرِ تر پر

1- رَم پر = بھاگنے پر آمادہ　2- سَت (سفیہ) = حق

لگاتا نہ تھا وہ تو دیر اتنی شاید
کہیں اب کے بجلی پڑی نامہ بر پر

ذرا ٹھہریو جانِ بر لب رسیدہ
کہ ہیں مستعد ہم بھی عزمِ سفر پر

وہ جھانکے نہ جھانکے، و لے عاشقوں کی
نگاہیں لگی رہتی ہیں بام و در پر

ہوا رشک سے دردِ سر مجھ کو پیدا
وہ تعویذ باندھ آئے تھے اپنے سر پر

صفائے بدن کا کہوں کس سے عالم
ٹھہرتی نہیں آنکھ اُس سیم بر پر

چمک اُس کے دانتوں کی وقتِ تکلّم
نمک پاش ہے میرے زخمِ جگر پر

شب وصل گر اپنا مقدور ہوتا
لگا دیتے ہم قفل بابِ سحر پر

غزل اور بھی مصحفی کہہ تو ایسی
کہ ہو طعنہ زن نظمِ سلکِ گہر پر

190

دل آیا خدا جانے کس عشوہ گر پر
پھر ان روزوں صدمہ سا ہے کچھ جگر پر

چھری پھیر دی کیوں نہ، اے نالہ تو نے
شب وصل حلقوم مرغِ سحر پر

لگائی اگر دیر آنے میں اُس نے
مرا خوں رہے گا سرِ نامہ بر پر

ملی تھی جو کافر نے دانتوں پہ مسّی
کبودی کا عالم تھا سلکِ گہر پر

وہ سیراب لب میرے لوہو کے پیاسے
سدا دانت پیسا کیے دل جگر پر

ہوا کھانے آیا تھا جو بام پر وہ
ہوائی سی اُڑتی تھی روئے قمر پر

چھپالے منھ اپنا کہ عاشق کا تیرے
نہیں زور چلتا کسی کی نظر پر

مُواقیس جس روز، کہتے تھے اُس دن
بگولا سا دائر[1] تھا اک بحر و بر پر

یہ مسّی نہیں لعلِ شیریں کی اُس کے
کمر بندیاں ہوتی ہیں نیشکر پر

ہوے عازم کعبہ جب شیخ صاحب
لیا بوجھ لاد اپنا اک ماچہ خر[2] پر

1- دائر = گھومنے والا 2- ماچہ خر = گدھیا

غزل تیسری بھی لکھی مصحفی نے
قناعت نہ کی معنیِ مختصر پر

191

مرے خط کو پھینک آئے قاتل کے در پر بھروسا یہ پڑتا نہیں نامہ بر پر
سجا سرخ یک پیچہ جب اُس نے سر پر ہوئے سیکڑوں خون ہر رہ گزر پر
شبِ ہجر کا ماجرا کوئلے سے لکھا جا کے میں اُس کے دیوار و در پر
خدا جانے وہ لب ہیں قابو میں کس کے کہ بیٹھے ہیں دنداں رکھے ہم جگر پر
پسینے کا دیکھا جو اُس رخ پہ عالم وہیں پڑ گئی اوس گلہاے تر پر
مرے خط کو لے جا کے واں مارا جاوے لکھا تھا یہ پیشانیِ نامہ بر پر
رگِ گل کو وارفتگی ہے یہاں تک کہ انگڑائیاں لے رہی ہے کمر پر
شب مہ وہ کوٹھے پہ آیا تھا بن ٹھن پڑی برق کیا جانے کس کس کے گھر پر
حنائی ہر اک پور ان انگلیوں کی کمر بستہ ہے میرے خونِ ہدر[1] پر
میں دیکھ اُس کو جوں الحذر بول اُٹھا ہنسی اُس کو آئی مرے الحذر پر

شبِ دوش تو مصحفی دوں کٹی تھی
چڑھائی ان آہوں کی ہے پھر اثر پر

192

یہ رنگِ پاں نہیں ترے لعلِ کبود[2] پر لپٹی ہوئی ہے آتشِ حل کردہ دود[3] پر
وہ دے رہا ہے گالیاں، ہم سنتے ہیں کھڑے مرتے ہیں سیکڑوں اسی گفت و شنود پر
کوٹھے سے اُس کے پھر نہ اُڑا مرغِ نامہ بر پھندا لگا تھا کیا کہیں جاے ورود پر
لوحِ مزار چھٹ[4] نہ رہا ان کا کچھ نشاں مرتے تھے زندگی میں جو اپنی نمود پر
کھل جائے چشمِ دید تو اس جلوہ گاہ میں ہے پردہ کون سا تری شانِ شہود پر

1- ہدَر = وہ خون جس کا دعویٰ نہ ہو 2- کبود = نیلا 3- دود = دھواں 4- چھٹ = سوا

جس کو حضور قلب کہیں ہیں سو وہ نماز موقوف کچھ نہیں ہے قیام و قعود پر
مطرب نے گا بجا کے جو آتش سی پھونک دی دل عود[1] سا جلا مرا آوازِ عود[2] پر
سیراب آبِ تیغ سے تیرے ہوا ہے کون سَو پیاسے مر گئے ہیں اِسی زندہ رُود پر
یک پیچہ[3] دیکھ کر ترا سر کو جھکا چلے بعضے نمودیے[4] جو مریں تھے نمود پر
ہے مُستغاث[5] حضرتِ باری میں مصحفی
کیونکر نہ دھیان اس کا رہے اِس درود پر

193

ہو آشنائے غفلت چشمِ پُر آب کیونکر؟ پانی کے بیچ آوے مچھلی کو خواب کیونکر؟
کشتی کا ہم چھپاویں حالِ خراب کیونکر اشکوں سے ڈال لیوں منہ پر نقاب کیونکر؟
ہر حرفِ مدّعا پر کانپے ہے ہاتھ اپنا غصے کے خط کا لکھیں اُس کو جواب کیونکر؟
نقشِ قدم کو اُس کے جو دیکھے ہے کہے ہے ''اُترا زمیں کے اوپر یہ آفتاب کیونکر؟''
مہماں کوئی تو ہے جو سینے میں دل پھُنکے ہے یاروں سے ہم چھپاویں بُوئے کباب کیونکر؟
تجھ بن تو ہجر کی شب آنکھوں میں ہم نے کاٹی کیا جانیے کسی کو آتا ہے خواب کیونکر؟
اُس روئے آتشیں کا عالم اگر یہی ہے جنت کو جائیں گے پھر، اہلِ عذاب کیونکر؟
اس دم کے شعبدے کا باعث ہے نفسِ ہستی بے زخمہ[6] ہو نُوا زن تارِ رباب کیونکر؟
مُنہج[7] کا واسطہ ہی گر درمیاں نہ ہووے صابن سے پھر بناویں لڑکے حباب کیونکر؟
یہ تو غزل تلاشی[8] اے مصحفی لکھی تو
دیکھیں تو، عاشقانہ اس کا جواب کیونکر؟

1- عود = اگر (Aloeswood) جسے خوشبو کے لیے جلاتے ہیں 2- عود = ایک ساز کا نام۔ انگریزی میں Lude 3- یک پیچہ = ایک پیچ کی چھوٹی سی دستار 4- نمودِیے = دکھاوا کرنے والے، ریاکار 5- مُستغاث = فریاد کرنے والا، یہ ایک درود کا نام بھی ہے۔ 6-زخمہ = مضراب، جس سے ستار بجاتے ہیں 7- مُنہج (بروزن مسطر) = منھ سے ہَوا پھونکنے کی نلکی 8- تلاشی = یعنی قافیے تلاش کر کے مضمون بنالیے

194

پوچھے وہ آکے میری چشمِ پُر آب کیوں کر؟ یک بار اُس کا ٹوٹے مجھ سے حجاب کیوں کر؟
سایے سے بھی جو میرے برسوں چھپا رہا ہو دے کھول میرے آگے، منہ سے نقاب کیوں کر؟
داغِ فراق و حسرت، رشکِ رقیب و غیرت اک جان پر سہیں ہم، اتنے عذاب کیوں کر؟
جس خوش دماغ کو ہو سونگھے سے گُل کے نزلہ وہ ضعفِ دل کی خاطر پیوے گلاب کیوں کر؟
گرمی ہے اُس کی آفت، چہرہ سو ایک بھبوکا پردے میں وہ چھپاوے حسنِ شباب کیوں کر؟
پانو میں اپنے کوئی پتھر سے باندھتا ہے نکلیں ہم اُس گلی سے ایسے شتاب کیوں کر؟
اک پل میں وصل کی شب، طے ہوگئی دریغا آیا نکل شتابی آج آفتاب کیوں کر؟
جب خواب میں وہ دیکھے ہم بستر اپنا مجھ کو سچ ہے کسی کے آگے اُلٹے وہ خواب کیوں کر؟
ہر بات پر ہماری لگ جائے ہے تمھیں چپ کیا جانے مدعی کو دو ہو جواب کیوں کر؟
شیشوں کے منہ تو ہم نے سب مُہر کر رکھے تھے پہنچی بہ مغزِ قاضی بوے شراب کیوں کر؟
جن انگلیوں[1] پہ چھریاں نظارے میں گئیں چل یوسف کا کھول دیں وے بندِ نقاب کیوں کر؟
چاہِ ذقن کی تیرے حسرت میں جو ہو مرتا ہنگامِ نزع مانگے وہ تشنہ، آب کیوں کر؟
اک وار ہی میں جس کو رکھا ہو ٹھور تو نے جاوے پھر اپنے گھر وہ خانہ خراب کیوں کر؟
جب پاے رخش[2] خوبی ہو ہفتم آسماں پر خورشید و ماہ لیویں اُس کی رکاب کیوں کر؟

دل کی قلق ہمارے چہرے سے خود عیاں ہے
اے مصحفی، چھپاویں یہ اضطراب کیوں کر؟

195

حالِ دلِ بے قرار ہے اور شاید کہ خیالِ یار ہے اور
اے دیدہ نہ رو کہ تجھ پر اک شب رنجِ شبِ انتظار ہے اور

1- حضرت یوسف علیہ السلام کی حکایت کی تلمیح ہے، جس کا حوالہ قرآن میں آیا ہے [پارہ 13 سورہ یوسف، آیت نمبر 31] 2- رخش = گھوڑا

جاگا ہے کہیں مگر تو دیشب[1] آنکھوں میں تری خمار ہے اور
فرہاد نے دیکھتے ہی گلگوں[2] جانا تھا کہ یہ سوار ہے اور
کوچے میں ترے مری نگہ کا ہر گوشہ امیدوار ہے اور
ہے آخرِ عمر اس چمن میں دو چار ہی دن بہار ہے اور
ناوک کا ترے شکار گہ میں ہر گوشے نیا شکار ہے اور
وہ ہم سے کرے ہے کل کا وعدہ اوروں سے وہاں قرار ہے اور
کیالالے سے نسبت اُس کو؟ سچ ہے داغِ دلِ داغ دار ہے اور
اوروں سا نہ جان مجھ کو، پیارے یہ عاشقِ جاں نثار ہے اور
اے مصحفی اس میں چپ ہی رہ تو
سنتا ہے، یہ روزگار ہے اور

196

پہلو میں رہ گیا یوں یہ دل تڑپ تڑپ کر رہ جائے جیسے کوئی بسمل تڑپ تڑپ کر
مجنونِ بے خرد نے دی جاں بہ نا امیدی لیلیٰ کا دیکھتے ہی محمل، تڑپ تڑپ کر
کہیو صبا جو جاوے، مذبوحِ غم نے تیرے آسان کی شب اپنی، مشکل تڑپ تڑپ کر
اُس پردگی[3] نے اپنا آنچل نہیں دکھایا مر مر گئے ہیں اس کے مائل تڑپ تڑپ کر
قاتل کا میرے کوچہ ہے خواب گاہِ راحت کیا کیا نہ سو رہے یاں گھایل تڑپ تڑپ کر
حال اس غریق کا ہے جاے ترحم، اے دل رہ جائے ہے جو زیرِ ساحل تڑپ تڑپ کر
قابو میں آئے پر میں چھوڑا نہ اُس کو ہرگز بل کھا کے گرچہ نکلا قاتل تڑپ تڑپ کر
تو نے تو آبرو ہی کھو دی ہماری، اے دل مقتل میں عاشقوں کے شامل تڑپ تڑپ کر
جھمکے[4] دکھا کے اُس کو تو نے جو منھ دکھایا مر ہی گیا نہ تیرا سائل تڑپ تڑپ کر
گو مرغِ نامہ بر کو بسمل کیا ہے اُس نے طے کر رہے گا آخر منزل تڑپ تڑپ کر

1- دی شب= پچھلی رات 2- گلگوں= گھوڑے کی ایک قسم 3- پردگی= بہ معنی پردہ نشین
4- جھمکے (جھومکے) کانوں کے آویزے

فرقت میں اس کی تو نے، اے مصحفی بتا تو　ق　جز اشکِ خوں کیا کیا حاصل تڑپ تڑپ کر
مجھ کو یہ سوجھتا ہے ناحق تو جان دے گا　اک دن اسی طرح سے، جاہل، تڑپ تڑپ کر

197

اے آہ اس کے دل میں تو ہرگز اثر نہ کر　اُس بے خبر کو حال سے میرے خبر نہ کر
فریاد و آہ کرنے میں ہم نے کمی نہ کی　تو بھی جو تجھ سے ہو سکے آ در گذر نہ کر
چھیڑ اُس کو جا کے، ہووے جو تجھ سے رُکا کوئی　تو مجھ سے اختلاط نسیمِ سحر نہ کر
اے آہ نالہ جب نہ مرا کارگر ہوا　پھر اس کا کچھ گلہ نہیں تو بھی اثر نہ کر
چھوٹا ہے پیچ زلف سے دو دن ہوئے یہ دل　اب، ہم نشیں حکایتِ موے کمر نہ کر
بچتا ہے خود وہ، اور ڈھٹائی تو دیکھیو　غمزے کو کہہ دیا ہے کسی سے حذر نہ کر
اے دل میں تجھ سے ترکِ محبت کو کہہ چکا　اب آگے اختیار ہے تیرا تو کر نہ کر
مرہم ہے دستِ صبر میں، اور یوں کہے ہے شوق　چندے علاج سوزشِ داغِ جگر نہ کر
گوشے میں چھپ کے رو لے، جو فرصت ملے کہیں　رسوائے خلق مجھ کو تو، اے چشمِ تر نہ کر
ہے عاشقوں میں میری ٹک اس سے ہی آبرو　قطرے کو میرے اشک کے یا رب گہر نہ کر
نامے کو میرے خطِ رقیباں میں مت ملا　ایسا تو مجھ پہ تو ستم، اے نامہ بر نہ کر

آخر تو عشق کر کے ہوا مصحفی خراب
سو بار میں تو تجھ سے کہا تھا ''نہ کر نہ کر''

198

پانو دامن سے رہے ہاتھ گریباں سے دور　پہنچا نزدیک بہ مردن میں تری جان سے دور
مثلِ آئینہ جو بھچک [1] میں کھڑا رہتا ہوں　کس کی صورت ہے مرے دیدۂ حیران سے دور؟
بے نصیبی کا ہے مجنوں کو گلہ، ورنہ مدام　ناقہ جاتا ہے نکل کوہ و بیابان سے دور

1- بھچک = حیرت زدہ

تا نہ آلودۂ کیفیتِ دنیا ہوویں — اس لیے ہم کو رکھا ہے سَر و سامان سے دور
دل کو دھویا بھی میں گھر جا کے، مرے چہرے سے — رنگِ الفت نہ ہوا پر کسی عنوان سے دور
لب ترے بعد محرّم تو ہوئے تشنۂ خوں — کیونکے دس دن یہ رہے تھے مسی و پان سے دور
بوسہ لوں خاک، کہ رکھتی ہے مری شومیِ بخت — لب و دنداں کو مرے اُس لب و دندان سے دور
قلقِ دل کا یہ عالم ہے کہ گھر بیٹھے مجھے — روز لے جائے ہے وحشت کے بیابان سے دور
اُس کے مارے تو موئے جاتے نہیں تم باللہ — ہووے شانے کی بلا زلفِ پریشان سے دور
چاہیے کشتۂ شمشیرِ ادب ہو جو شخص — دو قدم چل کے گرے قتل کے میدان سے دور
عاشق اس چشم کے ہم، خوبیِ طالع سے ہوئے — نکلے تھی جس کی ہر اک جنبشِ مژگان سے دور[1]

مصحفی اور ہے سب درد کی دنیا میں دوا
جز غمِ عشق، یہی درد ہے درمان سے دور

199

نالہ مرا پھرتا تھا دَواں[2] کوہ کے اوپر — تھا خلق کو بجلی کا گماں کوہ کے اوپر
پانی جو سیاہی لیے گرتا ہے یقیں ہے — روتا ہے کوئی سوختہ جاں کوہ کے اوپر
انساں نے سر اپنے پہ وہ خوش ہو کے اُٹھایا — تھا بارِ امانت جو گراں کوہ کے اوپر[3]
دھڑکے تھا ہر اک گام پہ اُس کے دلِ مجنوں — تھا ناقۂ لیلیٰ جو رواں کوہ کے اوپر
بھادوں کے اندھیرے میں چمکتے ہیں جو جگنو — تاروں کا میں دیکھوں ہوں سماں کوہ کے اوپر
طوفانِ حوادث سے بچے، یہ نہیں ممکن — گو جا کے بناوے تو مکاں کوہ کے اوپر
آ دیکھ کہ خونِ سرِ فرہاد سے، شیریں — پھولے ہے عجب لالہ ستاں کوہ کے اوپر

کس طرح چھپے مصحفی سوزِ دلِ عاشق
آتش کوئی ہوتی ہے نہاں کوہ کے اوپر؟

1- دُور = بہ معنی دور باش 2- دواں (بروزن جواں)= دوڑتا ہوا

3- قرآن کی آیت کی طرف اشارہ ہے [پارہ 22، سورۃ الاحزاب، آیت نمبر: 72]

200

پھرتے ہوں جہاں لالہ رُخاں کوہ کے اوپر سر پھوڑیے پتھروں[1] سے وہاں کوہ کے اوپر

گنبد میں درختوں کے نہیں ماہ کا جلوہ ہے طورِ تجلّی کا سماں کوہ کے اوپر

ہر وقت اُٹھاتا نہیں دل ناز بتاں کا ہے کاہ بھی اک وقت گراں کوہ کے اوپر

گم گشتہ ترا منزلِ مقصد کو نہ پہنچے ہر سنگ ہو گر سنگِ نشاں کوہ کے اوپر

آشوب سے نالے کے مرے، سنگ کے روڑے اُڑتے پھرے جوں برگِ خزاں کوہ کے اوپر

خاموشی و فریاد ہیں یاں کام میں اپنے واں چلتی ہے تیشے کی زباں کوہ کے اوپر

ہر سنگ ہے جو خانۂ زنبور کی صورت کیا ابر سے برسے ہیں سناں[2] کوہ کے اوپر؟

پرزے جو گریباں کے مرے رَہ بہ ہوا تھے بادل سے گرے ہیں طیراں[3] کوہ کے اوپر

پامالِ حوادث یہ ہوئی صورتِ شیریں پتھر کا بھی پایا نہ نشاں کوہ کے اوپر

طوفان سے گریے کے نہیں مصحفی کچھ دور
ہو نوح کی کشتی جو رواں کوہ کے اوپر

201

جنھوں کے تختۂ گل کا تھا رنگ چھاتی پر وہ اب دھرے ہوئے سوتے ہیں سنگ چھاتی پر

گلے کا ہار نہ کر اِن کو آپ منصف ہو ہے یہ بھی زلفوں کے رکھنے کا ڈھنگ چھاتی پر

فضائے باغ تھی جس دم سے یہ اُسی دم نے بہ وقتِ نزع کیا عرصہ تنگ چھاتی پر

یہ کس غزالہ کے غم سے پڑے ہیں داغِ سیاہ کہ جلوہ کرتی ہے پشتِ پلنگ[4] چھاتی پر

گلے لگانے کی خواہش کسی کو کیونکے نہ ہو کہ ہے جوانی کی اُس کی اُمنگ چھاتی پر

پیا ہے خوں ترے عاشق کا تیرے تیغے نے وہ جب سوار ہوا جوں نہنگ چھاتی پر

1- پتھروں بروزن برسوں نظم کیا ہے۔ 2- سناں =(بروزن نشاں) نیزے 3- طیَراں =طائر، پرندے
4- یعنی سینے پر ایسے داغ ہو گئے ہیں جیسے چیتے کی کمر پر ہوتے ہیں۔

صفائے آئینہ اُن میں کہاں، کہ یاروں کی
جما ہے گردِ کدورت کا رنگ چھاتی پر

پناہ جن کی خدا خود ہے، چار آئینے[1] کو
وہ باندھتے نہیں ہنگام جنگ چھاتی پر

یہ طفلِ اشک ہے کس کشتی گیر کا شاگرد
کیا کرے ہے جو پہروں شلنگ[2] چھاتی پر

مقابل اُس کے ہو کس طرح مہر کی تختی
جو اربسی[3] کو سمجھتا ہو ننگ چھاتی پر

ہوا تھا جس بتِ کافر کا مصحفی عاشق
رہے ہے اب وہ شبیہِ فرنگ چھاتی پر

ز

202

عشوے نے اُس کے جب سے کدایا سمندِ ناز
ابرو نے قاشِ زین[4] سے پھینکی کمندِ ناز

کیا وہ بھی دن تھے خوب کہ گلزارِ حسن میں
تھا سر پہ میرے سایۂ سروِ بلند ناز

دل کس طرح طلسمِ زنخداں سے چھٹ سکے؟
بابل کا چاہ ہے یہ نہیں شہر بندِ ناز

مجمر[5] میں اُس کے حسن کے از بہرِ چشمِ بد
حوروں کے دل جلیں ہیں بجائے سپندِ ناز

چینِ جبیں میں اُس کی جو کل مر گئے تھے آج
پھر جی اُٹھے وہیں وہ بیک زہر خندِ ناز

دل دے کے نذر اُس کو ہم آخر خجل ہوے
جنسِ قلیل اپنی نہ آئی پسندِ ناز

کیا وہ تبار پیشہ جئیں مصحفی جو نت
مژگاں سے دل پہ کھاتے ہیں زخمِ گزندِ ناز

203

خوش صفیروں کا ہے ازبس ان دنوں بازار تیز
مرغ سب چوبِ قفس پر کرتے ہیں منقار تیز

---

1 چار آئینہ = جو میدانِ جنگ میں دفاع کے لیے سینے پر باندھتے ہیں۔ 2- اُچھل کود 3- اربسی= ایک زیور 4- زین کا وہ حصہ جس میں پیر رکھ کر سوار ہوتے ہیں 5- مجمر (بروزن مسطر) انگیٹھی

دیکھیے منظور کیا ہے اس لگاوٹ سے اسے　　ان دنوں پڑتی ہے پھر مجھ پر نگاہِ یار تیز

حسنِ گلشن کی صفائی جیسے تیغ آبدار　　اپنے اپنے کام میں ہیں گل سے لے تا خار تیز

اور بھی بپھرے جب ابرو پر پڑا اُس کے گلال　　خون چاٹے سے ہوئی یہ تیغِ جوہر دار تیز

برگِ سوسن[1] یوں لگے ہے، مجھ کو تجھ بن باغ میں　　جس طرح ہوتی ہے فولادی چھری کی دھار تیز

سخت جاں ہے کون ایسا روز جس کے قتل کو　　سنگِ خارا پر کرے ہے اپنی تو تلوار تیز

واں ہے دعوت آسماں پر اُس کی اور یاں بہرِ قتل　　مدعی کرتے ہیں از بہر مسیحا دار تیز

صفحۂ کاغذ کا میداں طے کبھی ہوتا نہیں　　خامہ قدموں کو اُٹھاوے گو دمِ رفتار تیز

مصحفی اس بحر میں اک اور بھی لکھ جا غزل

ہے تری تیغِ زباں اِس وقت کچھ اے یار تیز

204

سان پر رکھوا کے کی ہے اُس نے پھر تلوار تیز　　پھر نظر آتا ہے ہوتا مرگ کا بازار تیز

زلفِ مشکیں اُس کی شانے سے ہوئی خونخوار تیز　　سچ ہے ہاں ہوتا ہے دندانِ گزندہ[2] مار تیز

بسکہ تھی تیزی طبیعت میں مری من بعدِ مرگ　　سبزہ میری خاک سے اُگتا ہے نشتر وار تیز

ہے توسط میں ابھی تو شعلہ قد میرے کا حسن　　قہر ہے گر پھر ہوئی یہ آتشِ ہموار تیز

عاشقوں کے دل میں کیونکر زخمِ ناخن پڑ نہ جائیں　　اُس کے تیروں کا ہے پیکاں سے سوا سوفار تیز

حال خوش اُن کا (کہ) جو قطعِ منازل کر گئے　　کر کے قدموں کے تئیں اپنے گہِ رفتار تیز

گاؤ زوروں کو کیا چالاک ہل میں جوت جوت　　ہر مژہ دہقاں پسر کی بسکہ تھی جوں آر[3] تیز

دل کے یاں ٹکڑے ہوئے جاتے ہیں سینے میں مرے　　جوں جوں تیغِ ناز کو کرتا ہے وہ خوں خوار تیز

مصحفی کیا کام تجھ کو تیغ بندی سے، میاں

بہرِ دشمن تیغ سے خود ہے تری گفتار تیز

1- سوسن = ایک پھول کا نام۔ (Lilly)　2- گزندہ (بہ فتح اول) مار = ڈسنے والا سانپ

3- آر = پینی جس سے جانوروں کو ہانکتے ہیں

205

غم کھا گیا تمام مرے استخواں کا مغز
سر میں رہا نہیں مرے آہ و فغاں کا مغز

سرگشتگی کا اپنی فسانہ وہ تھا کہ ہائے
سننے سے جس کے پھرنے لگا داستاں کا مغز

پٹکے ہے بسکہ نالہ و فریاد سے مری
بُحراں میں آگیا ہے سرِ آسماں کا مغز

جب رات دن وہ نالہ و فریاد میں رہے
خالی نہ کیونکے ہو جرسِ کارواں کا مغز

میرے دماغِ شعر کا عالم نہ پا سکے
مل کر جو صرفِ فکر ہو سارے جہاں کا مغز

مانندِ پیہ[1] شمع بہ فتوائے سوزِ عشق
سب اشک ہو بہے ہے مرے جسم و جاں کا مغز

ہرچند اپنے سر میں وہ شورش نہیں رہی
عاشق ہے تو بھی نکہت زلفِ بتاں کا مغز

گرتے ہیں قطرے خون کے آنکھوں سے کیوں مگر
صدموں سے پھٹ گیا ہے دلِ ناتواں کا مغز

یارب شفا دے اس کو کہ عضووں کو چین ہو
خیلے[2] خلل میں ہے سرِ ہندوستاں کا مغز

ہے ذات اُس کی رتبۂ فہمید سے پرے
قاصر ہے اُس کے درک میں وہم و گماں کا مغز

گل ٹکڑے ٹکڑے جیسے ہوا ہائے اس طرح
بادِ بہار سے نہ پھٹا باغباں کا مغز

آخر سپندِ آتشِ گل ہو گیا دریغ
وہ مرغِ خوش صفیر کہ تھا آشیاں کا مغز

ظاہر میں تندرست ہوں باطن میں روز و شب
گھُن چاٹتا ہے میرے تنِ ناتواں کا مغز

جاں بر ہو کس طرح تپِ سودا سے مصحفی
ہانڈی سا کھدبدائے[3] ہے کچھ اس جواں کا مغز

206

واں دست غیر اس کے ہے طوقِ گلو ہنوز
یاں دل میں کر رہی ہے خلش آرزو ہنوز

کانپے ہے آفتاب کہ کیا جانے کیا بنے
آیا نہیں ہے گرچہ ترے رو برو ہنوز

یاں چاک سینہ تا سرِ دامن گزر گیا
ناصح کرے ہے چاک گریباں رفو ہنوز

1- پیہ = چربی (مراد پگھلا ہوا موم) 2- خیلے = بہت زیادہ 3- کھدبدانا = ہانڈی کا جوش سے اُبلنا

کتے نے روکشی بھی ذرا کی تو کیا ہوا بھاگے ہے دم دبا کے ہمارا عدو ہنوز
کینہ مزاج زلف سے کافر کے کب گیا شانے کے ساتھ اُلجھے ہے ہر تارِ مو ہنوز
بال اُس نے بیٹھے بیٹھے کہیں ٹک دیے تھے کھول آتی ہے میری خاک سے سنبل کی بو ہنوز
ہر چند مصحفی میں وہ طاقت نہیں رہی
جاتی نہیں ہے اس پہ تری جستجو ہنوز

207

تصویر کا اس شوخ کی کاغذ پہ ہر انداز انداز کو حوروں کے کرے ہے نظر انداز
رکھنے لگا شوخی میں قدم کبکِ دری بھی کم کم ترے پانو کا میاں دیکھ کر انداز
خوں ہو کے ٹپکتا ہے ہر اک اشک کا قطرہ رنگیں ہے ترے گریے کا، اے چشمِ تر انداز
اُس در سے میں گزرا تو، ولیکن یہی ڈر ہے کیا جانیے کیا اس کو لگاویں گے در[1] انداز
گزرا مرے آگے سے وہ یوں سر کو جھکائے میخانے سے آوے کوئی جوں مست سر[2] انداز
اے سروِ سہی جلوہ لچک کا ترے قد کی اس باغ میں پاتا ہے کوئی ہر شجر انداز!
مرہم کی طلب کی جو مسیحا سے تو بولا "مشتے نمکِ سُودہ بہ زخمِ جگر انداز[3]"
اے مصحفی لکھ اور غزل تازہ تو ایسی
ہر شعر کا جس کے ہو بہ وضعِ دگر انداز

208

شب دیکھ تبسم کا ترے زیرِ لب انداز بجلی نے بھی ہنسنے میں نکالا عجب انداز
نسبت تری رفتار سے کیا کبک دری کو؟ انداز ہے اس میں، پہ یہ رکھتا ہے کب انداز
جس بزم میں وہ شوخ ہے سرکوبِ حسیناں ایجاد ہوا کرتے ہیں واں روز و شب انداز
انداز کو انداز ذرا اپنا دکھا دے ہے نازِ تغافل سے ترے جاں بلب انداز
جو لازمۂ حسن ہیں خوبانِ جہاں کے ہیں یاد وہی اُس بتِ کافر کو سب انداز

1- در انداز = بیچ کے بچولیے 2- مستِ سر انداز = سیاہ مست، نشہ میں دُھت
3- مٹھی بھر پسا ہوا نمک زخمِ جگر پر چھڑک لو

آتی ہے نظر بے حرکت، موجِ تبسم تصویر کا ہے اُس کے لبوں کے غضب انداز
کاوش تری مژگاں کو رہی ہم سے ہمیشہ کچھ آج نکالا نہیں یہ بے سبب انداز
اے مصحفی کیا دیکھے ہے میوہ، ہے رسیدہ
"سنگے بزن و از سرِ نخلش رطب[1] انداز"

209

دلِ صد پارہ مرا سیر کے قابل ہے ہنوز دم شمشیرِ جفا اس کے مقابل ہے ہنوز
قطعِ الفت سے مری ہوگئی مجھ کو گٹھیا ہر اک اعضا میں مرے وجعِ مفاصل[2] ہے ہنوز
غسل کر کون یہ دریا سے گیا قطرہ فشاں؟ گوہرِ حسن سے پُر دامنِ ساحل ہے ہنوز
مجھ کو ڈر ہے وہ مرے قتل سے بدنام نہ ہو کیونکہ آلودہ بہ خوں دامنِ قاتل ہے ہنوز
شب کا پیالا ہے جو دن، مہ کا، قدح ہے خورشید آسماں تیرے درِ حسن پہ سائل ہے ہنوز
حسن اور عشق کے آثار کہیں مٹتے ہیں! وہی مجنوں، وہی لیلیٰ وہی محمل ہے ہنوز

س

210

ساتھ اپنے لے گیا گل و گلزار کی ہوس نکلی نہ جی سے مرغِ گرفتار کی ہوس
اے حور چہرہ جاتے ہوئے تجھ کو راہ میں دیکھے جو شل[3] تو اُس کو ہو رفتار کی ہوس
طوبیٰ کے سایے میں بھی ہمیں جا ملی و لے نکلی نہ دل سے سایۂ دیوار کی ہوس
تیرے خرامِ ناز کا عالم ہے وہ جسے دیکھے پری، تو اُس کو ہو رفتار کی ہوس

1- فارسی مصرعہ: ایک پتھر مارو اور درخت کی چوٹی سے پکے پھل گرالو۔ 2- وجعِ مفاصل = جوڑوں کا درد، اس شعر میں مصحفی نے لفظ مفاصل کی رعایت سے مضمون پیدا کیا ہے۔ اعضا جو عضو کی جمع ہے اُسے بطور واحد استعمال کیا ہے۔ 3- شَل = مفلوج، اپاہج

بوسہ تو آج اُس کے کفِ پا کا میں لیا　ہووے نہ دل کو بوسۂ رُخسار کی ہوس
پیش از اجل تو خواب میں آیا بھلا ہوا　یُوں ہی نکل گئی ترے بیمار کی ہوس
تیرا خرامِ ناز کہاں، اور وہ کہاں　کبکِ دری کو ہے یوہیں رفتار کی ہوس
وہ خود فروش طُرفہ بلا ہے کوئی جسے　ہر دم رہے ہے تازہ خریدار کی ہوس
جب مر گیا یہ جان کہ مٹی میں مل گئی　رخش[1] و یراق[2] و جامہ و دستار کی ہوس
کیا جانے روزِ حشر ہو کیا اُن پہ واردات　جو دل میں لے گئے ترے دیدار کی ہوس
اک بوسہ پہلے دے لے میاں، پھر تو بات کر
بس ہے یہ مصحفیِ گنہگار کی ہوس

211

مجھ سے اک بات کیا کیجیے بس　اس قدر مہر و وفا کیجیے بس
آفریں سامنے آنکھوں کے مری　یوں ہی تا دیر رہا کیجیے بس
دلِ بیمار ہوا اب چنگا[3]　دوستو ترک دوا کیجیے بس
خونِ عاشق سے یہ پرہیز اسے　آشنائے کفِ پا کیجیے بس
شرم تا چند، حیا بھی کب تک؟　منھ سے برقعے[4] کو جدا کیجیے بس
گر زباں اپنی ہو گویا تو مدام　طالعوں کا ہی گلا کیجیے بس
تم میاں مصحفی رخصت تو ہوئے
اب کھڑے کیوں ہو دعا کیجیے بس

212

بھلا وہ بیٹھ سکے کیونکے بے خلل ہم پاس　فلک نہ دیکھ سکے جس کو ایک پل ہم پاس
شکستہ دل نہ رہے کیونکے غیر تنہائی　کوئی ندیم نہیں اور، آج کل ہم پاس

1- رخش = گھوڑا　2- یراق = سازوسامان　3- چنگا = صحت مند　4- برقعے میں ع ساقط ہے، مصحفی نے بُرقے کے وزن پر نظم کیا ہے۔

ہمیشہ داد نسیم و صبا ہی دیتی رہی
نہ آئے تم کبھی نیمے[1] سے عطر مل ہم پاس

عمل کہاں وہ کہ جس سے نجاتِ عقبیٰ ہو
ہیں حبّ و بغض کے یوں سیکڑوں عمل ہم پاس

نکالے ہیں دلِ مضطر نے اپنے ڈھنگ نئے
کسی طرح نہیں پڑتی ہے اُس کو کل[2] ہم پاس

فراق میں بھی جو اُس بت کے ہم نہیں مرتے
مگر کہ آتے ہوئے ڈرتی ہے اجل ہم پاس

نہ جاوے مصحفی پھر حرصِ حسن جوں داؤد[3]
اگر ہوں حور سے ستانوے محل ہم پاس

213

کیا خاک کر سکیں گے بتوں کے بدن کو مس
اک دیکھنے کے کام کے ہم رہ گئے ہیں بس

موسیٰ ذرا تو وادیِ دل کی تو سیر کر
جھمکے ہے خار خار یہاں آتش قبس[4]

بھٹکوں ہوں واپسی سے بہ دنبالِ قافلہ
کیوں بولتا نہیں ہے تو، اے نالۂ جرس

دامن کو تیرے ہاتھ میں کیوں کر لگا سکوں
گو پاس ہے تو لیک کہاں اتنی دسترس؟

ممکن نہیں کہ اس سے ذرا ہو سکے جدا
خالِ سیاہِ لب ہے ترا شہد کی مگس

بھڑکی چمن میں آتشِ گل اس قدر کہ رات
بلبل کے استخوان جلے جیسے خار و خس

مرغِ اسیر گو کہ کرے لاکھ زمزمہ
صوتِ چمن سے فرق ہے تا نالۂ قفس

بندہ ہوں میں تو انجمنِ وصلِ خواب کا
جس میں نہ بیمِ شحنہ نہ اندیشۂ عسس[5]

ہم دادخواہ بن کے بھلا کس کے در پہ جائیں؟
تیرے سوا جب اپنا نہ ہو کوئی داد رس

ناچار ہم بھی رہ گئے خاموش مصحفی
مجلس سے اپنی اُٹھ گئے جب اپنے ہم نفس

1- نیمہ = نیم جامہ، آدھی آستین کا لباس 2- کل پڑنا (بہ فتح اول) چین سے ہونا، راحت پانا (روزمرّہ)
3- یہ ایک اسرائیلی روایت ہے کی طرف اشارہ ہے۔ 4- قبس = (بروزن جرس) انگارہ
5- شحنہ = سپاہی، عسس = کوتوال

ش

214

شب میں حیراں رہ گیا دیکھ اُس کے لبسمل کی تلاش
سر نہ تھا گردن پہ، اور کرتا تھا قاتل کی تلاش

کارواں کے پیچھے یہ جاتا جو ہے اک گرد باد
خاکِ مجنوں ہے کہ وہ رکھتی ہے محمل کی تلاش

میری اور اُس کی بھلا کس طرح صحبت پھر بنے
میں ہوں بے دل اور اُسے دن رات ہے دل کی تلاش

نقش یہ مارا ہے کچھ دل پر محبت نے، کہ میں
آبِ حب[1] کے واسطے کرتا ہوں عامل کی تلاش

مجھ کو اس غرقے[2] پہ رحم آیا جو وقت اضطرار
دامنِ ہر موج میں کرتا تھا ساحل کی تلاش

پھر بہار آئی، لگی موجِ ہوا پھر اینڈنے
پھر لگے اہلِ جنوں کرنے سلاسل کی تلاش

مصحفی اس در سے اب آگے کہاں جاوے کہ ہے
کوچۂ لیلیٰ تلک لیلیٰ کے سائل کی تلاش

215

خلوت میں تو ہے غیروں سے واں یار ہم آغوش
یاں ہوتے ہیں ہم با در و دیوار ہم آغوش

ہے گل کی تمنا جو اسے، چوبِ قفس سے
ہوتا ہے سدا مرغِ گرفتار ہم آغوش

منھ پھیر لیا صبح کو پہچان کے ہم سے
ہم ہو گئے اُس سے جو شبِ تار ہم آغوش

تو شوق تو دیکھ اس کا، نگاہوں میں زلیخا
یوسف سے ہوئی بر سرِ بازار ہم آغوش

بیماریِ[3] رشتہ مجھے کیوں کر نہ سکھاوے[4]
اس بت سے ہو جب رشتۂ زنار ہم آغوش

اس وقت کی لذت میں نہیں بھولتا، مجھ سے
جس وقت ہوئی تھی تری تلوار ہم آغوش

1- آبِ حب = کسی کو اپنی طرف مائل کرنے کے لیے عامل سے دم کرایا ہوا پانی

2- غرقہ = غریق، ڈوبا ہوا، ڈوبنے والا (اردو) 3- بیماریِ رشتہ = نارو کی بیماری (Ringworm) جس میں بدن سے باریک ڈورا سا نکلتا رہتا ہے۔ 4- سکھاوے = (بروزن سُناوے) دُبلا کرنا۔

ملتا ہے مزہ وصل کا تب دشتِ طلب میں ہر آبلۂ پا سے ہو جب خار ہم آغوش

افسوس ہے پروانہ ملے شمع سے ہر شب
اور تجھ سے نہ ہو مصحفیِ زار ہم آغوش

216

ہر سرِ مو ہے ترا، اے بتِ رعنا دل کش تو وہ بت ہے کہ ہوا جس سے کلیسا دل کش
ہم گرفتار ہوئے خوبیِ قسمت سے تری ورنہ اتنی تو نہ تھی زلفِ چلیپا دل کش
کس کا آویزۂ گوش اُس نے لیا کان میں پہن؟ نظر آتی ہے جو یوں عقدِ ثریا[1] دل کش
اپنی مجلس سے عبث تو نے نکالا اس کو وضع رکھتا تھا ترا عاشقِ رسوا دل کش
کیا کہیں یاں کی ہوا راس نہ آئی ہم کو تھا بنا گرچہ بہت گنبدِ مینا دل کش
وصل کا روز تو کرتا نہیں مشرق سے طلوع آج آتا ہے نظر صبح کا تارا دل کش
مہ و خورشید بھی اودھر ہی کھنچے جاتے ہیں آہ کتنا ہے وہ آتش کا بھبوکا دل کش
ناقہ ہر چند کہ جاتا ہے چلا رُو بہ ہوا جذب کہتا ہے کہ ہے نجد کا صحرا دل کش
دیکھ کر آئینہ ہمدم سے وہ یوں کہنے لگا حسنِ یوسف سے ذرا، چہرہ ہے میرا دل کش
چاہنے کا ترے مذکور کریں کیوں کے نہ یار تازہ عاشق کا تو ہوتا ہی ہے چہرا دل کش
لبِ پاں خوردہ وہ معشوق کے یاد اُس نے دیے تھا لبِ جو پہ جہاں لالۂ حمرا[2] دل کش
یوں تو صنعت سبھی صانع کی ہے مطبوع ولے کتنا اس خاک کے پُتلے کو بنایا دل کش
خط کے آنے سے بھی ہرگز نہ گھٹا حسن اُس کا وہ ہی رو، اور وہی رنگ، اور وہی چہرا دل کش
ابر وگل سے اُنھیں کیا کام کہ مستوں کو ترے خندۂ جام ہے یا گریۂ مینا دل کش
نامہ اس لطف سے لکھا میں کہ ہونے نہ دیا معنیِ یاس سے مضمونِ تمنا دل کش

مصحفی کو ہوسِ حور و پری پھر نہ رہی
اُس نے عالم جو ترے حسن کا دیکھا دل کش

1- عِقدِ ثریا = خوشۂ پروین، ستاروں کا ہار (Paliades) 2- حمراء = سرخ

ص

217

وہ دن گئے کہ میں رکھتا تھا بے قرار تخلص ہوا ہوں خاک، ہے اب میرا خاکسار تخلص
جو بعد مرگ نہ آوے گا گور پر تو ہماری رکھیں گے خاکِ لحد میں ہم انتظار تخلص
زمینِ باغ کا کیوں کر نہ رنگ ہووے سپندی[1] ملے ہیں خاک میں یاں کتنے بے قرار تخلص
غبارِ دامنِ خوباں نہ ہو تو فائدہ کیا ہے کیا میں فرض کہ شاعر رکھے غبار تخلص

نثار تا نہ کرے جان و مال عشق میں شاعر
ضرور کیا ہے کہ ناحق رکھے نثار تخلص

218

عاشق کے روبرو ہو سو ایسا نہیں وہ شخص چھپ کر کے دیکھ لے مگر اُس کو کہیں وہ شخص
مارا گیا جو دور گلی سے تری، میاں رکھتا تھا آرزوے بہشتِ بریں وہ شخص
سو پھونکے کان میں ترے میری نہ اک سنے میں جانتا ہوں ہے یہ ترا ہم نشیں وہ شخص
بسمل کیا تھا تو نے جسے تیغِ ناز سے مارے ہے دست و پا ابھی زیرِ زمیں وہ شخص
پہچان رکھو، ہے مرے قاتل کا یہ نشاں آوے گا روز حشر کے بے آستیں وہ شخص
دکھلاؤں ہوں میں جس کے تئیں اپنا چاکِ جیب کہتا نہیں زباں سے بجز آفریں وہ شخص
جانا ہو اُس گلی میں تو کہیو یہ اے صبا رہتا ہے تیرے واسطے اندوہگیں وہ شخص
عشقِ بتاں میں رکھتے ہیں پتھر کا جو جگر سچ پوچھیے جو ہم سے تو ہاں ہیں ہمیں وہ شخص
کوچے میں تیرے تھا جو مسافر طریق رات جاتا رہا نہ بھر کے اک آہِ حزیں وہ شخص
مسجود ہووے جس کا صنم، خاکِ در تری کیوں آستانِ دیر پہ رگڑے جبیں وہ شخص

1- سپندی = کالا

میں کچھ سراہنے جو لگا، رک کے بول اُٹھا دکھلائے گا نہ پھر تمھیں موے جبیں وہ شخص

خوباں میں دلبری کا جو دعویٰ کرے میاں جتنا کہ تو ہے چاہیے اُتنا حسیں وہ شخص

کر کے ارادہ پختہ جو کچھ پھر نہ کر سکا کیا جی ہی جی میں اپنے ہوا شرمگیں وہ شخص

کہتے تھے ماہِ مصر جسے ساکنانِ مصر تیرے ہی خوانِ حسن کا تھا ریزہ چیں وہ شخص

عاشق سے تیرے خاک کرے کوئی دشمنی اب تک تو جانتا ہی نہیں مہر وکیں[1] وہ شخص

تیرے مریضِ عشق کو کیا ہو گیا جو آہ کھول آنکھیں رہ گیا نفسِ واپسیں وہ شخص

اک دن کہا میں ''میری سفارش تو کیجیے'' ق اُس سے جو روز بیٹھے ہے اس کے قریں وہ شخص

احوالِ زار پر مرے کھا دوستانہ رحم مذکور لے چلا جو مرا کچھ کہیں وہ شخص

سن کر لگا یہ کہنے ''جو کرتا ہے اُس کا ذکر آنکھوں میں تلخ لگتا ہے میرے تئیں وہ شخص''

رسوائی کا تو عار نہ کر کیوں کہ مصحفی
رسوا نہ ہو جو عشق میں عاشق نہیں وہ شخص

ض

219

گل دستِ بخیل و خار بے فیض اس لطف پہ ہے بہار بے فیض

دل شاد نہ ہوا نہ صبح دم بھی نکلی شبِ انتظار بے فیض

وصل ہاتھ [illegible] نہ ہووے جوں بہلۂ[2] زر نگار بے فیض

گل لاش سے جما کبھی نہ دیکھا کشتے کا ترے مزار بے فیض

لے تیغِ کرشمہ وہ نہ جاوے زخمِ جگر فگار بے فیض

سب قدرِ سخن کی کرتے آئے ہے اپنا ہی روزگار بے فیض

1- مہر وکین = مہر محبت، کین کینہ، عداوت 2- بہلۂ زرنگار = سنہری جڑاؤ والی رتھ، سواری

زر ہاتھ لگا نہ لکھنؤ میں
ہے مصحفی یہ دیار بے فیض

220

دیکھتا کیونکے میں تپ میں بتِ خونخوار کی نبض
کہ نہ کی ناخنِ اندیشہ نے مَس خار کی نبض

دم قفس میں تو پھڑک کر نہ نکلتا اُس کا
باندھ دیتا جو کوئی مرغِ گرفتار کی نبض

اب صفا کا ہے یہ عالم کہ سدا روحِ قدس[1]
کر وضو دیکھے ہے اُس آئینہ رخسار کی نبض

اسی صورت سے رہی کج رویِ طبعِ بتاں
رو بہ اقرار نہ لائی کبھی انکار کی نبض

دیکھ رفتار مری نبض کی بولا یہ طبیب
جی ڈرا دیتی ہے سب کا اِسی رفتار کی نبض

مرضِ عشق کو معلوم کرے کیا کوئی
ایک سی چلتی ہے یاں بے خود و ہشیار کی نبض

خیر صلا[2] سے کہیں رات کٹی ہو اُس کی
دیکھ آیا تھا میں بے ڈھب ترے بیمار کی نبض

مصحفی چاہے تو پھر مجھ کو کرے باغ و بہار
وہ جو دیکھے ہے بہاراں میں گل و خار کی نبض

ط

221

جب اپنا ہو نہ نالۂ آتش فشاں پہ ضبط
کیوں کر بٹھائیں ہم مژۂ خوں چکاں پہ ضبط

پھینکا جو تیر اُس نے سو برباد ہی گیا
سچ ہے کہ کم ہے اُس کا بھی دست و کماں پہ ضبط

دم کیوں کے رُک نہ جائے کہ گل چیں کے واسطے
بادِ سحر کرے ہے مرے آشیاں پہ ضبط

کہنا نہ تھا جو مجھ کو سو ناچار کہہ گیا
حالت میں طیش کی نہ رہا جب زباں پہ ضبط

1- روحِ قُدس = جبریل علیہ السلام 2- خیر صلا (روزمرہ) اور یہ صَلا صلاح کا مخفف ہے۔ یعنی خیریت سے

کس نے کیا یہ آئینہ و سرمہ داں پہ ضبط کھلتا نہیں مقابہ[1] جو اُس رشکِ ماہ کا

رُسوا ہوا جو عشق میں تو ہووے مصحفی
اپنا بھی اب رہا نہیں آہ و فغاں پہ ضبط

222

شاید کہ کسی اور سے واں تم نے کیا ربط جو مجھ کو تصور سے تمھارے نہ رہا ربط

چاہت کا بھی ناتا ہے غضب ہائے رے ظالم جوں جوں وہ کھنچا مجھ سے کیا دل نے سوا ربط

ہیں آنکھ لڑانے کو ترے سیکڑوں عاشق آئینہ و روزن سے کرے تیری بلا ربط

تھی بزم میں جس کی نہ فرشتے کی رسائی اے دل تو بتا اس سے ترا کیونکے ہوا ربط؟

223

ہم فقیروں کی ہے حصیر[2] بساط یہی رکھتے ہیں ہم فقیر بساط

یوں لکھا تھا کہ جب کنویں میں گرے ہووے رستم کا تیغ و تیر بساط[3]

کچھ بچھانے دے، یارِ نرم سُریں کیونکے چاہے ہے یہ خمیر بساط[4]

آوے شیریں تو واسطے اُس کے بے ستوں میں ہے جوے شیر بساط

چاندنی ہے کہ آ زمیں پہ ہوئی آسماں پر سے جوے شیر بساط

اب کے سطحِ زمیں پہ لالے نے کیا ہی کھولا ہے بے نظیر بساط[5]

مصحفی کیوں نہ بت ہوں تیرے غلام
عشق کے پھڑکا ہے تو میر بساط[6]

1- مُقابہ = زیورات رکھنے کا ڈبا (Jewel Box) 2- حصیر = بوریا، چٹائی

3 - بساط = فرش 4- خمیری آٹے کو چادر پر پھیلا کر رکھا جاتا ہے

5- بساط (مذکر) = بساط خانہ، جیسے کہ بازاری مختلف سامان کو زمین پر پھیلا کر بیٹھ جاتے ہیں

6- پھڑ = اکھاڑا، میر بساط = استاد، گورو

224

بھیجے میں لکھ لکھ کے جو اُس کو خطوط — میری اُس کی ہو گئی صحبت فروط[1]
چاہِ زنداں میں پھنسے ہیں دیکھیں اور — کیا دکھاتا ہے ستاروں کا ہبوط[2]
مردۂ مفلس کے حق میں بعدِ مرگ — خود ہے آبِ صاف کافور و حنوط[3]
کیا خبر ہے تجھ کو ناداں دانیال[4] — جانتا تھا خوک[5] یہ علمِ نقوط[6]
کچھ تو ان نقطوں سے بھی نکلے ہے راہ — کیا عبث ہیں اپنی اشکال و خطوط
صبح ہوتے آنکھ اُس کی لگ گئی ق تھا جو ترسا پاسبانِ قومِ لوط
صفحۂ ہستی سے یعنی مصحفی
اُس کا تھا منظور صانع کو سُقوط

225

بھیجا تھا میں جو اُس کو لکھا ہم نشیں سے خط — رکھ کر زمیں پہ پھر نہ اُٹھایا زمیں سے خط
کاغذ ہمارے یار کا اوروں نے کب پڑھا — اس ربط پر پڑھا نہ گیا جب ہمیں سے خط
واں جا سکے اگر نہ کبوتر تو ایک دن — اے نالہ، باندھ دے پرِ روح الامیں سے خط
محضر[7] ہمارے خون کا طاؤس بن گیا — از بسکہ بھر گیا سبھی مہر و نگیں سے خط
پڑھ کر کے خطِ شوق مرا یار نے کہا — ''ایسا تو آج تک نہیں آیا کہیں سے خط''
کھودیں جو میری قبر کو اب بھی، فراق کے — دس بیس تو گڑے ابھی نکلیں زمیں سے خط
جاتے ہوئے جو راہ میں ناگاہ مل گیا — قاصد نے لے لیا ہے مری آستیں سے خط
ہے اس کی چینِ زلف کا جو عرش پر دماغ — جزیہ کا مانگتی ہے وہ خاقانِ چیں سے خط
لکھ کر کے سوزِ دل کو نہ کر مصحفی تو آہ
جاوے نہ جل ترے نفسِ[8] آتشیں سے خط

1- صحبت قرو طی شد، فارسی محاورہ کا ترجمہ ہے 2- ہبوط = نیچے اُترنا، زوالی 3- حنوط = وہ اشیاء جو مُردے کے بدن سے مل کر دفن کرتے ہیں۔ 4- دانیال = ایک پیغمبر کا نام 5- خوک = خنزیر
6- علم نقوط = نقطوں کا پُر اسرار علم از قسم طلسمات 7- محضر = پنچایت نامہ، جس پر سب کی مہریں ثبت ہیں
8- نفس = سانس

226

جو جو کہ صنم مجھ سے تری خوردی میں تھے ربط
ملتا ہوں میں ہاتھوں کو جو یاد آتے ہیں وے ربط

نقصان ہی آیا کیا چاہت میں ہماری
جوں جوں وہ بڑھا یہ نہ ہوا اور بڑھے ربط

اب جان مری کیوں نہ رہو مجھ سے رکے تم
پیدا کیے ہیں تم نے نئے یار، نئے ربط

میں نے جو کہا ''ہم سے تمھیں ربط کبھی تھا''؟
بولا وہ بگڑ کر کسے کہتے ہیں، ابے ربط؟

اے مصحفی ہے کچھ بھی تجھے ہوش سخن کا؟
بکتا ہے تو کیا سامنے اُس شوخ کے بے ربط

ظ

227

کافر ہے اگر رشتۂ زنّار سے محظوظ
ہم ہوتے ہیں موے کمرِ یار سے محظوظ

گر روشنیِ شمع نہیں ہے تو نہ ہووے
ہیں بخت سیہ اپنے شب تار سے محظوظ

ایام بہاراں بھی رہے کنجِ قفس میں
کس روز ہوئے ہم گل و گلزار سے محظوظ

اس کوچے میں اک دم کبھی بیتابیِ دل نے
ہونے نہ دیا سایۂ دیوار سے محظوظ

منقار میں لے لے کے جو دل اُس نے بکھیرے
صیّاد ہوا مرغِ گرفتار سے محظوظ

کل تو نے جو چل کر روش اک تازہ دکھائی
کیا کبک ہوا ہے تری رفتار سے محظوظ

راتیں نہ وہ یاد آئیں کہ ہم موسمِ گل میں
تھے دم کشیِ مرغِ گرفتار سے محظوظ

ہم خانہ خرابوں کا ٹھکانا نہیں ورنہ
دنیا میں سبھی لوگ ہیں گھر بار سے محظوظ

ان چاہنے والوں میں ہیں ہم تیرے کہ جن کی
آنکھیں رہیں غیبت [1] میں بھی دلدار سے محظوظ

تنہائیِ عاشق کا تجھے کاہے کو غم ہے؟
اتنا ہے تو نت صحبتِ اغیار سے محظوظ

1- غیبت = (بروزن ہیبت) غیر حاضری، غیر موجودگی

از بس غزلیں[1] اُس نے پڑھیں سحرِ مجسم
ہم رات ہوئے مصحفیِ زار سے محظوظ

228

جو عیش میں ہیں، ہے اُنھیں سیرِ چمن کا حظ — مشکل کہ خلوتی کو ملے انجمن کا حظ
بچھڑے سے دوستوں کے ہوئی دوستوں کو قدر — غربت میں یاد آوے ہے جیسے وطن کا حظ
لالے نے داغ کھائے کہ لوٹا تمام شب — بادِ صبا نے رات گل و نسترن کا حظ
ہاتھوں کو اپنے رکھتے ہیں معذور روزِ وصل — عاشق لبوں سے لوٹیں ہیں سارے بدن کا حظ
کیوں اے صبا روا ہے رہیں سینہ چاک ہم — شانہ اُڑائے زلفِ شکن در شکن کا حظ
کیا مجھ سے بھوں چڑھاتے ہو دُھلوا کے پانو تم — اک روز یاد آوے گا سنگ ولگن کا حظ
گُپ چُپ[2] کی تھی مٹھائی وہ مت پوچھ مصحفی
اس سے زیادہ بوسۂ کُنجِ دہن کا حظ

ع

229

وہیں، تھے شاخِ گل پر گل جہاں جمع — کیے بلبل نے خارِ آشیاں جمع
لگا دیتا ہے ان کو چمن کے آتش — ہُما کر کے ہمارے استخواں جمع
چمن میں کس کے آنے کی خبر ہے؟ — کرے ہے پھول چن چن باغباں جمع
ہے صحبت کا پریشانوں کے یہ رنگ — ہوا سے ہوویں جوں برگِ خزاں جمع
سفر کی مجھ سے کیا کہتے ہو جاؤ — کروں کیا گر ہوا ہے کارواں جمع؟

1- غزل کی جمع غزلیں مصحفی نے بہ فتح دوم استعمال کی ہے۔ 2- گُپ چُپ کی مٹھائی۔ پُر اسرار مٹھائی جسے کھائے بغیر اندازہ نہیں ہوتا۔ بطور مزاح کسی بے تکلف کو چھیڑنے کے لیے بھی دی جاتی ہے۔

ابھی موئے پریشاں سے کسی کے مری خاطر نہیں اے دوستاں جمع
فلک نے سنگ پھینکا تفرقے کا ہوئے دو چار صاحب دل جہاں جمع
نہ خرچ مصحفی کی پوچھو اُس سے
توکل کا ہے مالِ بے کراں جمع

230

اُٹھا بیٹھے ہیں سب دوا سے توقع ہے بچنے کی میرے خدا سے توقع
غلط ہے اگر اِس زمانے میں یارو رکھے آشنا آشنا سے توقع
مرا دل وہ غنچہ نہیں جس کو ہووے کشایش کی بادِ صبا سے توقع
جو آزاد ہیں جیتے جی ہی اُنھوں نے اُٹھائی ہے[1] شاہ و گدا سے توقع
جلایا ہمیں اُس نے آتش میں، ہم کو نہ تھی یہ تو رنگِ حنا سے توقع
بدن تیغِ غم نے کچومر کیا ہے رہی ہے کسے دست و پا سے توقع
بلا مصحفی بھی ہے مغرور کوئی
کہ رکھتا نہیں اغنیا سے توقع

231

پیدا ہے تفِ آہ سے سوزِ جگرِ شمع ہر دیدۂ گریاں ہے مرا چشمِ ترِ شمع
کرنے دے ذرا طوقِ کمر ہاتھ کو ظالم اب داغِ سرِ شمع ہے طوقِ کمرِ شمع
رنگ اس کا نظر آئے ہے کچھ آج جو پھیکا کس گورے بدن کی ہے صباحت سحرِ شمع
اس صبح کا یا رب تو مجھے منھ نہ دکھانا جس میں سفرِ یار ہو بعد از سفرِ شمع
جب شمع نے ساعد کو ترے نامہ لکھا تھا پروانۂ دل سوختہ تھا نامہ برِ شمع
کس نور کا ہے عالمِ بالا پہ یہ جھمکا ہے شام سے تا صبح جو اودھر نظرِ شمع

1- اُٹھائی ہے = یعنی بند کر دی ہے (روزمرہ)

سرتا بہ قدم جل کے لگی شب وہ یہ کہنے　یا رب نہ کسی نخل کو ملیو ثمرِ شمع
پروین ہی نہ کچھ لے گئی ہے اشک کا خوشہ　ہے کرمکِ شب تاب بھی دردِ جگرِ شمع

پروانے کی لے لاش ستی ہوگئی آخر
میاں مصحفی اتنی تو ہمیں ہے خبرِ شمع

غ

232

دل ہے مری بغل میں وہ مثلِ شرارہ داغ　گرمی سے جس کی ہو جگرِ سنگ خارہ داغ
کیا خاک دیکھوں لالہ ستانِ بہار کو　کرتا ہے اس چمن میں مجھے تو نظارہ داغ
روئے عرق فشاں[1] کا ترے دیکھ کر فروغ　ہوتے ہیں جی ہی جی میں فلک پر ستارہ[2] داغ
جب کوئلہ سا آگ میں جلتا ہے دل مرا　پہلو سے اس کے کرنے لگے ہے کنارہ داغ
چھلّے کا اور داغ دیا تم نے کس لیے　پہنچا[3] تو کر چکا تھا یہی ہیچ کارہ[4] داغ
گویا دیا سلائی تھی بلبل کی استخواں　کرتی ہے جس کو آتشِ گل بے اشارہ داغ

جوں لالہ کچھ دوا نہ ہوئی اُس کی مصحفی
چھاتی ہی پر رہا یہ مرا چار پارہ داغ

233

ہوں زیرِ خاک بھی میں تغافل سے ترے داغ　لایا نہ تُو تو گور پہ میری کبھو چراغ
پیچھے رہے ہیں قافلۂ رفتگاں سے ہم　دیکھیں تو ہم کو اُن کا ملے اب کدھر سراغ
ٹک میری تیرہ بختی کی خوبی تو دیکھیو　نامہ دیا ہے باندھ میں اپنا بہ بالِ زاغ

1- روئے عرق فشاں = پسینہ میں بھیگا ہوا چہرہ　2- داغ ہونا = جلنا، حسد کرنا
3- پہنچا = کلائی　4- ہیچ کارہ = بے سود، بیکار

کیا لطفِ سیرِ باغ کہ نازک مزاج کو — فریاد آبشار بھی کرتی ہے بے دماغ
دل جامِ جم سے کم نہیں اپنا کہ مصحفی
کرتے ہیں ہم طلسم میں غنچے کے سیرِ باغ

234

دوستو، کیونکے نہ ہو حال مرا جاے دریغ — جس کو جی چاہے وہی چیز نہ ہاتھ آئے دریغ
میرے مرنے کی خبر سن کے بتِ کافر نے — شرم کے مارے نہ اتنا بھی کہا ہائے دریغ
مر گیا ہووے جو حسرت زدہ فرقت میں تری — اُس کے احوال پہ کیونکر نہ کوئی کھائے دریغ
قسمتِ غیر میں ہو یار کی صحبت داری — وصل کا دن تو فلک مجھ کو نہ دکھلائے دریغ
تیرے کشتے کو جہاں دفن کیا تھا شبِ کور[1] — واں سے آتی ہے صدا ہاے ستم وائے دریغ
ہاے وہ شوخ میں خوں جس کے لیے روتا ہوں — اپنے ہاتھوں پہ حنا غیر سے لگوائے دریغ
قیس فریاد کناں در پسِ محمل جاوے — سارباں ناقۂ لیلیٰ کو نہ ٹھہرائے دریغ
رشکِ طالع کا میں بندہ ہوں کہ اس کافر کو — ایک ساعت بھی مرے پاس نہ بٹھلائے دریغ
مصحفی دید سے جس شکل کی تھا دل کو چین
ہم جئیں اور وہ شکل آنکھوں سے چھپ جائے دریغ

235

لگے کرنے تم ہم سے نفرت دریغ — ہوئی تم کو عاشق سے وحشت دریغ
ہوا کس کی تم کو لگی تم نے جو — اُڑا دی وہ مہر و محبت دریغ
تو اے جاں، شبِ ہجر کیدھر چلی — یہ ہوتی ہے شرطِ رفاقت، دریغ
شب آخر ہوئی آہ کیا کیا کہوں — کہانی بڑی، کم ہے فرصت، دریغ
صبا سے جھڑا گل تو بولی نسیم — ”ملا خاک میں جامِ عشرت دریغ“

1- شبِ کور = گھور اندھیاری رات

تصور کبھی سامنے آئے تھا سو اب مٹ گئی وہ بھی صورت دریغ
مصیبت میں تھا ہی میں آ گے کہ اور شبِ ہجر لائی مصیبت دریغ
نہ پاس اپنے تو نے رکھا، غیر سے لٹی یوں ترے گھر کی نعمت دریغ
نہ میرے ہی حصے میں آیا یہ خواں ہوا حسن کس کس کی قسمت دریغ
نشاں تیرے کشتے کا یہ ہے کہ واں لکھا ہے فقط گردِ تربت دریغ
اُڑا کر کے لے جائے یوں ہر طرف صبا تیری زلفوں کی نکہت دریغ
ہمیں اب بہ تنہائی و بے کسی اُٹھانا پڑا رنجِ غربت، دریغ
نہ طاقت رہی اور نہ صبر و شکیب ہوئے دوست سب ہم سے رخصت دریغ
ہوا کیا جو رہنے لگی ان دنوں ق تجھے اپنے سایے سے نفرت، دریغ
تو وحشی سا کیوں بن گیا مصحفیؔ؟
یہ کیا ہو گئی تیری صورت دریغ

ف

236

نہ تھا کوچ میں اپنے چنداں توقف تمھارے توقف سے ہے یاں توقف
چلی ہے تو، اے جان بر لب رسیدہ نہ تو نے کیا بہرِ یاراں توقف
قیامت ہی تھی پھر تو، مرقد پہ میرے جو کرتا وہ سروِ خراماں توقف
تو مقتل سے کشتوں کے بے ہوش آیا نہ کرنا تھا واں تجھ کو ناداں توقف
بہار آئی شاید، جو زنداں میں اک دم نہیں کرتے اب اہلِ زنداں توقف
جھڑی باندھ دی دیدۂ تر نے ایسی کہ کرتا نہیں جس کا باراں[1] توقف

1- باراں = بہ معنی برسنا

اُدھر سے اشارہ ہے در کھولنے کا　　پہ کرتا ہے ادھر سے درباں توقف

پہنچتا ہے کوئی دم کو اب مصحفی بھی
ذرا کیجو منزل پہ یاراں توقف

237

بات تو کیجیے اس سے کہ ہو کچھ بات کا لطف　　فیلسوفوں سے ہے کیا خاک ملاقات کا لطف

آبِ گوہر سے زباں دھویئے اپنی سو بار　　تب بیاں کیجے تو کچھ کیجے تری گات کا لطف

آنکھ جس دن سے لڑی غیر سے اُس کافر کی　　نہ تو چتون ہی کا پایا نہ اشارات کا لطف

خواب میں بھی نہیں آواز اب اُس کی سنتے　　ساتھ تھا جس کے کبھی حرف و حکایات کا لطف

شکوۂ بوسہ وہ عاشق جو کرے ہے ناشکر[1]　　گہ و بے گاہ جسے مل رہے کچھ بات کا لطف

یوں کیا مات بھی شاطر کو تو کیا اس کا عجب　　مات بیلیں[2] ہی اگر کیجے تو ہے مات کا لطف

آہ کیا کیا کے[3] سمیں میں نے نہ دیکھے شبِ وصل　　مجھ سے تقریر میں آتا نہیں اُس رات کا لطف

یار ہم خانہ تھا پر خانہ خرابی کے سبب　　مفت برباد گیا موسمِ برسات کا لطف

مصحفی زیست کریں خاک کہ اپنا تو میاں
کھو دیا اُس کی جدائی نے سب اوقات کا لطف

238

بکتے ہیں شہر میں گلِ بے خار ہر طرف　　ہے باغباں کی گرمیِ بازار ہر طرف

کیا فصلِ گل پھر آئی جو کرتے ہیں زمزمہ　　دام و قفس میں مرغِ گرفتار ہر طرف

کوٹھے پہ اُس کے پھینکوں میں کس راہ سے کمند　　کم بخت پاسباں تو ہیں بیدار ہر طرف

تودے جہاں تھے اُس کے شہیدوں کی خاک کے　　تیر اُس نے مارے ناز سے دو چار ہر طرف

1- ناشکر = ناشکرا، شکر ادا نہ کرنے والا، احسان ناشناس　2- مات بیلیں = شطرنج کی اصطلاح

3- کیا کیا کے = کیسے کیسے (عوامی روزمرہ)

جب اُس کی برقِ حسن سے پردہ ہوا ہے وا　　ضائع ہوے ہیں طالب دیدار ہر طرف
عاشق کو اُس گلی سے نکالیں تھے جب بہ زور　　پڑتی تھی چشمِ حسرتِ دیدار ہر طرف
دعوت ہے کس کی بزمِ فلک میں جو کب سے ہیں　　آنکھیں لگائے رخنۂ دیوار ہر طرف
ثابت بچا نہ کافر و دیں دار تک کوئی　　تیغِ نگہ نے اُس کی کیے وار ہر طرف
سودے میں جستجو کے تری، اے متاعِ حسن　　سر مارتے پھریں ہیں خریدار ہر طرف
پرواز کا جو شوق ہے بلبل کے مشت پر　　کنجِ قفس میں اُڑتے ہیں ناچار ہر طرف
حیراں ہوں میں کہ کس کا یہ کوچہ ہے جس کے بیچ　　ٹکڑے ہوئے پڑے ہیں طرح دار ہر طرف
غوغا ہے شرق و غرب و جنوب و شمال میں　　فتنے جگا گئی تری رفتار ہر طرف

گو میں ہوا مقیم تو کیا ڈر ہے مصحفی
سیر و سفر میں ہیں مرے اشعار ہر طرف

ق

239

یوں قفس سے میں چلا ہو کے چمن کا مشتاق　　جیسے جاتا ہے کوئی گھر کو وطن کا مشتاق
اُس کے ہر عضو کے بوسے میں دہن کا ہے مزہ　　وقت بوسے کے نہیں کچھ میں دہن کا مشتاق
باغِ جنت کے اُسے سیب سے کیا تسکیں ہو　　دلِ بیمار تو ہے سیبِ ذقن کا مشتاق
چشمِ حسرت سے اسے دیکھے ہے پیچھے پھر پھر　　بسکہ ہر صید ہے اُس صید فگن کا مشتاق
نافۂ چیں تری زلفوں نے دیا جس کے تئیں　　نہ ہوا پھر وہ کبھی مشکِ ختن کا مشتاق
میرے آنسو نے مجھے درِّ عدن[1] دکھلایا　　کہ میں اک عمر سے تھا درِّ عدن کا مشتاق
قد و رخسارِ بتاں سرو سمن اپنا ہے　　باغ کو جاوے جو ہو سرو سمن کا مشتاق

1- درِّ عدن = عدن کا موتی، عدن یمن کا ساحلی شہر

ہے وہ پروانہ پر سوختہ میرا دلِ زار		جس کو نت پاؤں ہوں پابوسِ لگن کا مشتاق

اور کے شعر سے رجھتا[1] نہیں جی اس کا کبھی
مصحفی کے ہے جو اندازِ سخن کا مشتاق

240

قسمت میں تھی لکھی جو بلائے شبِ فراق		کیا کیا نہ صدمے ہم نے اُٹھائے شبِ فراق
وحشت دو چند اور ہوئی، ایک نے مجھے		تعویذ لکھ دیا تھا برائے شبِ فراق
رنگِ کفک کو ہم نے ترے یاد کر صنم		چشموں سے چشمِ خوں کے بہائے شبِ فراق
پردہ جو رازِ عشق پہ تھا اپنے، کھل گیا		دامن کو چاکِ جیب جب آئے شبِ فراق
کیسا رکوع و سجدہ، کہ بیٹھے ہوئے ہیں ہم		زانو پہ سر کو اپنے جھکائے شبِ فراق
مسدود ہے یہ بابِ اجابت کہ آج تک		ہوتی نہیں قبول دعائے شبِ فراق
ہوتا گناہِ عشق جو، یارو، سزائے عفو[2]		ملتی نہ عاشقوں کو سزائے شبِ فراق
ہم نا قبول اُس کے بھی قابل نہیں، دریغ		بخت ان کے ہیں جو شخص سزائے شب[3] فراق
بس یہ دعا قبول ہو میری کہ بعدِ وصل		منہ اپنا مجھ کو پھر نہ دکھائے شبِ فراق
چوکا یہیں وہ، صانعِ عالم کو کیا کہوں		رکھنا تھا روزِ وصل بجائے شبِ فراق
کیا کیا عزیمتیں نہ بھریں اُس کے واسطے ق		کیا کیا نہ نقش[4] میں نے جلائے شبِ فراق

اُس ماہ رو نے پر کبھی آ کر کے مصحفی
مجھ سے کیا نہ عذرِ جفائے شبِ فراق

241

دل میں ہے اُس کے مدعی کا عشق		خاک سمجھے ہے وہ کسی کا عشق

1- رجھنا = (بروزن بچھنا) ریجھنا، مائل ہونا		2- سزائے عفو = معافی کے قابل		3- سزائے یعنی موافقت کرے، فارسی مصدر سازکردن سے اردو میں بنالیا ہے۔		4- عزیمت اور نقش جادو ٹونے کی اصطلاحیں، نقش بہ معنی تعویذ

اچھی صورت کا ہوں میں دیوانہ نے مجھے حور، نے پری کا عشق
کیوں خفا ہم سے ہو، کہ ہوتا ہے آدمی کو ہی آدمی کا عشق
جان جاتی ہے ہر ادا پہ چلی نہ سنا ایسی رفتگی کا عشق
خوب رو زر طلب ہیں اور ہمیں خوار رکھتا ہے مفلسی کا عشق
اپنے موسم میں کیسا ہوتا ہے نونہالوں کو سرکشی کا عشق
مصحفی اک غزل تُو اور بھی لکھ
گر تجھے ہے رقم زنی کا عشق

242

واں رہا اُس کو آرسی کا عشق یاں ہوا دشمن اپنے جی کا عشق
جان سے اپنے ہاتھ دھو بیٹھے جو کرے تم سے آدمی کا عشق
میں ہوں وارفتہ اُس پہ، اور یہاں محو ہے میری رفتگی کا عشق
رکھے ہے رات دن قلق میں مجھے ہے مرے دل کو بیکلی کا عشق
چشم لالے سے کب اُٹھاتے ہیں ہے جنھیں رنگِ آتشی کا عشق
تھا ابھی سینہ یہ در شہوار کہ ہوا اُس کو اربسی[1] کا عشق
یار کو یوں رقیب لے جاوے ق منہ لگے تکنے مصحفی کا عشق
نہ کرے حق، نصیب دشمن بھی عشق، پھر ایسی بے بسی کا عشق

243

مزہ کچھ اُس میں نہیں گر ملا کبھی معشوق رہے جو پاس سدا اپنے، ہے وہی معشوق
فلک کی تاب ہے پروانۂ جمال نہ ہو کرے جو جلوہ بہ رخسار آتشی معشوق
دل اپنا چاہے جسے وہ بھی کچھ عجب شے ہے وگرنہ یوں تو پری چہرہ ہیں سبھی معشوق
تو مجھ سے مل کہ نہ مل، اس کو کون کہتا ہے ہے میرے حق میں فقط تیری دوستی معشوق

1- اربسی = سینے کا زیور

خفا ہو اُس سے طبیعت تو ہم نظر نہ کریں بناؤ کر کے بنے اپنا گر پری معشوق
ابھی ہے سادہ مزاج اُس کا، یہ خدا نہ کرے کہ وہ بھی سمجھے یہ کرتے ہیں کافری معشوق
ہزار حیف ہے اُس پر اگر بہ وقتِ وداع نہ روئے دیکھ کے عاشق کی بے کسی معشوق
سنو ہو حسن پر اتنا بھی مت گھمنڈ کرو میں لاکھوں دیکھے ہیں عاشق کے ملتجی معشوق
لڑائی ہووے دو تن میں تو یا رب ایسی ہو کہ بعدِ جنگ ہو خواہانِ آشتی معشوق
ہر ایک بات میں رُسوا ہو ساتھ عاشق کے اُٹھائے کیونکے بھلا یہ فضیحتی[1] معشوق

کرے ہر ایک سے الفت، نہ ہو سکے کہ کبھو
نکالے دل سے تمنائے مصحفی معشوق

244

کر سکے جس سے نہ دورِ مہِ افلاک سلوک ایسے دیوانے سے کیا کوئی کرے خاک سلوک
پرزے دل کے مرے محبوب تلک پہنچائے یہ تو قاصد نے کیا با دلِ صد چاک سلوک
اتنا امساکِ[2] طبیعت، نہیں کیفی[3] کو روا کچھ تو پینک[4] میں کرے صاحبِ تریاک[5] سلوک
مددِ پیر ہو ہر لحظہ تو پھر کیوں نہ کرے مردِ سالک کو رہِ جذب میں چالاک سلوک
اک اک بوند کو ترسے ہے دلِ تفتہ مرا اُس سے کرتے ہیں یہ اب دیدۂ نمناک سلوک
برق کی طرح جلا خاک کیا مزرعِ دل کر گئی ہم سے یہ دھانی تری پوشاک سلوک
دیدۂ غور سے دیکھو تو کیا کیا کیا کچھ کلکِ صنعت نے بہ یک قطرۂ ناپاک سلوک
لختِ دل کو مرے چھریوں سے نہ بیندھا اے بے درد کیا نگینے سے یہی کرتے ہیں حکاک[6] سلوک

1- فضیحتی = (فضیحت میں یائے زائدہ)= رسوائی، بدنامی 2- امساک = کنجوسی
3- کیفی = مست، نشہ کرنے والا 4- پینک = نشے کی جھونک، بے خبری 5- تریاک = افیون
6- حکاک = ہیرے کو تراشنے والا کاریگر

کشتے یاں سیکڑوں اور اُس میں جگہ ایک کی ہے — آہ کس کس سے کرے حلقۂ فتراک[1] سلوک

جیتے جی تو نہ کبھی ہم سے تو ہنس کر بولا — خاک میں یاد کریں گے ترا ہم خاک سلوک

نگہِ لطف کبھی ہم پہ وہ کر جاتی ہیں — اپنی آنکھوں سے ہی سیکھ اے بتِ سفاک سلوک

مصحفی ایک غزل اور بھی کر جائے رقم
ہووے گر تجھ سے کچھ اے خامۂ ادراک[2] سلوک

245

ہم سے کرتے تھے کبھی دیدۂ نمناک سلوک — خاک اُڑنے لگی ان میں تو کریں خاک سلوک

اُس کا جی چاہے ہے ملنے کو مرے، ہے ظالم — اتنا کرتی نہیں پر گردشِ افلاک سلوک

نمکِ سُودہ کی تاثیر قلق میں بخشی — یہ تو مرہم نے کیا با دلِ صد چاک سلوک

یہ ہی سج دھج ہے تو آتا ہے نظر میرے تئیں — جامہ زیبوں سے کرے کچھ تری پوشاک سلوک

لگ گئے میرے گلے، چھپ کے چمن والوں سے — ہو گیا اتنا بہ طرفِ شجرِ تاک سلوک

کام دل دینے میں ہے میرے تامل اسے یوں — سوچ کرنے میں ہیں جوں صاحبِ ادراک سلوک

ایڑ کے ساتھ جو لگتی ہے رکاب اس کے تئیں — اُس کو سمجھے ہے ترا بستۂ فتراک سلوک

کون سا صید سزاوار نہ تھا آتش کا — اُن سے کرتا نہ اگر حلقۂ فتراک سلوک

جا نہ حمام کو، کیا جانے کرے کیا ظالم — تنِ نازک سے ترے کیسۂ دلّاک[3] سلوک

آشیاں بھی کوئی بلبل کا جلاتا نہیں اب — برق کرتی تھی کبھی با خس و خاشاک سلوک

راتیں سو وصل کی آئیں، نہ کیا تو نے و لے — ایک بوسے کا کبھی اے بتِ چالاک سلوک

گل کی پتی سا چمکتا تھا کہاں رنگِ نگار — مجھ سے کرتی تھی مری یہ نگہ پاک سلوک

مصحفی خالِ لب یار کا ممنوں ہوں کہ وہ
کبھی کرتا ہے بہ یک حبۂ تریاک[4] سلوک

1- فتراک = شکاری کا تھیلا 2- ادراک = سمجھ، فہم 3- دلّاک = مالش کرنے والا

4- حبۂ تریاک = افیون کی چھوٹی سی گولی

246

ہوا پیری میں یوں اپنا بدن خشک ۔ کرے دَے[1] جوں نہالِ یاسمن خشک
خزاں آئی، ہوئے سروِ سمن خشک ۔ پڑی ہیں آب جوئیں سب چمن[2] خشک
ترے کُشتے کی خاطر اپنے ہاتھوں ۔ ملائک دھو کے کرتے ہیں کفن خشک
عرق سے رخ کے گو رومال تر ہوں ۔ تفِ سینہ سے تو ہے پیرہن خشک
لحد میں بھی ترے عاشق کا ہم نے ۔ نہیں دیکھا گریبانِ کفن خشک
مرقع[3] میں نہیں دیکھا یہ عالم ۔ کہ گل سیراب ہوں اور ہو چمن خشک
چمن میں کس کے آنے کی خبر ہے ۔ ہوئے جاتے ہیں کلیوں کے دہن خشک
تنِ مجنوں میں سچ ہے کیا رہا ہے ۔ لہو کر دیوے ہے دیوانہ پن خشک
ترے پیکاں کی دہشت سے رگوں میں ۔ ہے خونِ صید اے ناوک فگن خشک
گڑے ہیں اس میں جو کُشتوں کے پشتے ۔ نہیں خوں سے کبھی چاہِ ذقن خشک
ہم اُن حسرت نصیبوں میں ہیں جو لوگ ۔ کنویں سے لاتے ہیں دلو و رسن[4] خشک
لگا جب سر پہ وہ تیشہ لگانے ۔ ہوا تب کیوں نہ دستِ کوہ کن خشک
سرشکِ گرمِ شمعِ انجمن نے ۔ نہ ہونے دی کبھی چشمِ لگن خشک
نہیں برسات کے موسم میں ہوتی ۔ زبانِ خامۂ اہلِ سخن خشک

مرے یہ شعرِ تر ہیں مصحفی یوں
کہ جوں پانی میں ہوں دُرِّ عدن خشک

247

گر ہم سے نہ ہو وہ دل ستاں ایک ۔ کر دیجے زمین و آسماں ایک
عاشق کا ترے ہُمائے غم نے ۔ چھوڑا نہ بدن میں استخواں ایک

1- دَے = ایرانی مہینوں میں خزاں کا مہینا 2- سب چمن = سب چمن میں 3- مرقّع = البم
4- دَلو = ڈول، رسن = رسّی

ہم چھوٹ کے جب قفس سے آئے　　دیکھا نہ چمن میں آشیاں ایک

کہتی تھی خلق[1] رہ اے زلیخا　　کنعاں سے چلا ہے کارواں ایک

یک رنگی کہیں ہیں کس کو، یعنی　　دو شخص کا ہووے جسم و جاں ایک

سازش کسی ڈھب سے کر بھی لیجے ق اُس در پہ جو ہووے پاسباں ایک

ہے واں تو نیا رقیب ہر دم　　ہونے پاتے ہیں ہم کہاں ایک

حسرت ہے کہ یوں لٹے چمن اور　　گُل ہم کو نہ دیوے باغباں ایک

آہستہ کہ قافلے کے پیچھے ق آتا ہے غریب ناتواں ایک

ہم کرتے ہیں سوز باں سے باتیں　　یوں کہنے کو منھ میں ہے زباں ایک

اس پر بھی اے مصحفی ہمارا
قصّہ ایک اور ہے داستاں ایک

248

عید کو تو نے پہن کر جو دکھائی پوشاک　　میری آنکھوں میں صنم تیری وہ بھائی پوشاک

ہو گیا دیکھ انھیں رنگ گلوں کا پھیکا　　گُلِ اُمری[2] کے جو رنگ اُس نے رنگائی پوشاک

گل بدن کا ہے جو پاجامہ ترا رشک بہار　　ایسی دلچسپ پری نے نہیں پائی پوشاک

گوکھرو[3] لہر بنت[4] اس میں لگائے تو نے　　اب کے نوروز میں ٹھسّے[5] کی سلائی پوشاک

ہے جو لاہی[6] کے دوپٹے پہ تمامی[7] کی سنجاف　　نظر آتی ہے تری اس سے سوائی پوشاک

پیٹ پر جالی کی کُرتی جو تری ہے کافر　　اُس کے پھولوں ہی نے پھولوں میں بسائی پوشاک

ہے کنگن دھول[8] کی انگیا جو تری شکل حباب ق جس سے دکھلاتی ہے پنڈے کی صفائی پوشاک

1- خلق (عام لوگ) سکونِ دوم کے ساتھ ہے مگر مصحفی نے بہ فتح دوم بروزن فلک نظم کر دیا ہے۔ ا

2- گل اُمری = ایک پھول کا نام　3- گوکھرو = وہ چھوٹے چمکیلے پھلودار بُوٹے جو لباس میں زینت کے لیے لگاتے ہیں　4- لہر بُنت = (بُنت یعنی بُناوٹ) Zig Zag کا کتنا اچھا ترجمہ ہے۔

5- ٹھسّے کی (بہ فتح اول) بڑی شان کی　6- لاہی = کپڑے کی قسم　7- تمامی کی سنجاف = چمکدار بیل، لچکا۔　8- کنگن دھول = شفاف قسم کی انگیاں

ہاتھ ملتے ہیں اسے دیکھ کے عاشق پیشہ کہ غضب رکھتی ہے طالع کی رسائی پوشاک

مصحفی دیکھ کے اس شوخ کی تیاریِ عید
میں نے یوں شاہدِ معنی کو پنہائی پوشاک

249

اُس نے سوہی[1] جو کبھی اپنی رنگائی پوشاک ہم کو اک شعلۂ آتش نظر آئی پوشاک

رہ گئی دل میں یہ حسرت کہ سلا رکھ چھوڑی مجھ کو کافر نے پہن کر نہ دکھائی پوشاک

ننگے پنڈے کو ترے دیکھ طرحداروں نے اپنی اپنی سرِ آتش پہ جلائی پوشاک

دھانی جوڑے نے ترے کھیت[2] رکھا میرے تئیں مجھ کو برسات میں تیری یہی بھائی پوشاک

رنگِ گل کسوت[3] شبنم میں کوئی چھپتا ہے کیا چھپاوے تری بھبھ[4] بند طلائی پوشاک

جامۂ آبِ رواں[5] میں تو بدن اُس کا دیکھ تا دکھاوے تجھے پنڈے کی صفائی پوشاک

ہم بھی گل کھاتے ہیں نت جامۂ عریانی پر کیا ہوا تم نے جو پھولوں میں بسائی پوشاک

میں جو ملنے کو گیا اس کے، تو عیاری دیکھ کہیں جانے کو وہیں اس نے منگائی پوشاک

کون سے روز ہوئی صبح کہ آ خادم نے دستِ بقچہ[6] میں نئی اک نہ لگائی پوشاک

کیا گریباں پہ مرے رحم نہ آیا اس کو اپنے ہاتھوں سے تجھے جس نے پنہائی پوشاک

رشک کی جا ہے کہ مل مل کے گل اندامون سے کشورِ حسن میں کرتی ہے خدائی پوشاک

اُس نے پائی نہ ترے جامۂ شبنم[7] کی مہک گرچہ شبنم نے بھی پھولوں میں بسائی پوشاک

ایک کے گھر تو نہ شب باش گیا، ہے ظالم اور ترے واسطے کس کس نے سلائی پوشاک

مصحفی آگ مرے دل کی بھڑک اُٹھی اور
اگری[8] اُس نے پہن کر جو دکھائی پوشاک

1- سوہی = گہرا سرخ رنگ 2- کھیت رکھنا = مار رکھنا 3- کسوت (بروزن نسبت) لباس
4- بھبھ = رنگت 5- آبِ رواں = نہایت باریک شفاف کپڑا 6- بقچہ = صندوق
7- جامہ شبنم = ایک قسم کا کپڑا 8- اگری = عودی رنگ، Dark Brown۔

250

جانے دے ٹک چمن میں مجھے، اے صبا سرک
کیوں چھیڑتی ہے تو مجھے نا آشنا سرک

جیسے اندھیری رات میں بجلی چمک گئی
اُس رخ سے شب گئی جو وہ زلفِ دوتا سرک

آثارِ مرگ مجھ میں ہویدا ہوئے، مگر
جب پاس سے گئے مرے سب آشنا سرک

کہتا ہے وقتِ نزع مریض اُس کا اُس سے یوں
''لگنے دے میری آنکھ، تو اس دم ذرا سرک''

میت سے میری گزرے ہے جس دم وہ بعد قتل
لاشہ کہے ہے ''خون سے دامن بچا، سرک''

پوروں پہ ڈورے باندھے ہیں اُس پر شعور نے
تا اُس کے فندقوں کی نہ جاوے حنا سرک

شب اختلاط سے وہ مرے کیا خفا ہوا
حد سے گئی زیادہ جو انگشتِ پا سرک

دھڑکے ہے بے طرح سے یہ پہلو میں رات دن
ڈرتا ہوں زخمِ دل کی نہ جاوے دوا سرک

کرنے دے میرے خون کو آرام خاک میں
اے شورِ حشر، اس کو ابھی مت جگا سرک

یہ کیا غضب ہوا کہ نہ خنجر لگا نہ تیر
پہلو سے آپھی آپ مرا دل گیا سرک

خوابِ عدم سے میں ابھی چونکا ہوں، دور ہو
اے صبحِ غم نہ اپنا مجھے منھ دکھا سرک

پیچھے مرے پڑا ہے تو کیوں گھر کی راہ لے
رسوا کرے گا کیا مجھے؟ بہرِ خدا سرک

کیا بے حیا ہے جو نہیں ٹلتا تو مصحفی
سو بار میں نے تجھ کو دوانے کہا سرک

251

مژگاں کو جائے خوں ہو، رود ارس[1] مبارک
آنکھوں کو ہجر کی شب نورِ قبس[2] مبارک

صیاد نے جو مجھ کو پکڑا قضا یہ بولی
اس مرغ کو نہ ہوگا ہرگز قفس مبارک

صَرف آشیاں میں اُس کے ہوتا رہے ہے از بس
بلبل کو اس چمن کا ہے خار و خس مبارک

اب کے برس میں مجھ کو جیسا صنم ملا ہے
ایسا ہی مجھ کو یا رب ہو ہر برس مبارک

1- رودِ ارس = دریائے ارس 2- قبس = انگارہ

مجنوں کو جا کے کوئی جلدی خبر یہ کر دے | لیلیٰ کا محمل آیا، بانگِ جرس مبارک
آنے سے تیرے مجلس شادی کا گھر بنی ہے | کہتے ہیں مجھ کو اپنے، جو ہر نفس مبارک
گر بختِ خفتہ اُس کے جاگیں تو کیوں نہ ہووے | عاشق کو وصل کی شب خوابِ عسس مبارک
جب عشق کی کشش نے مجھ سے اُسے ملایا | تب بولے لالہ لو جی اہلِ ہوس مبارک
کتوں کے پلّے پالے فیضی[1] سا جب کہ دانا | عرفی[2] کہے نہ کیوں کر پھر اُس کو بس مبارک[3]

اے مصحفی تو اتنا اب شور کیوں کرے ہے
لے سامنے تو آیا فریاد رس مبارک

252

چاہا کروں میں اُٹھ کے عرق کو جبیں سے پاک | تب اس نے اپنا چہرہ کیا آستیں سے پاک
نکلے ہے جب نہا کے وہ کرتا ہے آفتاب | پانی کی بوندیں اس کی تنِ نازنیں سے پاک
روتا ہوں میں کہ ہائے وہ، غم خوار کیا ہوئے | آنسو کریں تھے جو مری چشم نمیں سے پاک
دامن عبث دُھلاتے ہو، عاشق کا تازہ خوں | کرنا تھا اولاً تمھیں شمشیر کیں سے پاک
میں جو کہا کہ "تم سے میں رکھتا ہوں پاک عشق" | بولا کہ "آپ آئے ہیں ایسے کہیں سے پاک"
تڑپے ہمیشہ خون میں ہم، اور نہ ہو سکا | قصہ ہمارا اُس نگہٗ شرگیں سے پاک
کعبے میں کوے یار کے کیا کیا ہوئے نہ خوں | ہر چند تھی نہ کوے زمیں اُس زمیں سے پاک
آلودگانِ وصل کو مشکل ہے منعِ وصل | بالِ مگس کو کیونکے کریں انگبیں سے پاک
مجنوں کو آفریں ہے کہ اس ارتباط پر | رکھتا ہے عشقِ لیلیٰ، مکتب نشیں سے پاک

طرفہ یہ مصحفی نے کہی ہے جو اب غزل
یارب رکھ اس کو چشمِ بدِ عیب بیں سے پاک

1- فیضی فیّاضی دربار اکبری کا امیر، عالم، فارسی کا شاعر 2- عرفی شیرازی مشہور شاعر
3- یہ ایک لطیفہ کی طرف اشارہ ہے۔ فیضی کو کتے پالنے کا شوق تھا۔ ایک کتا دیکھ کر عرفی شیرازی نے فیضی سے پوچھا اس کا کیا نام ہے؟ فیضی نے کہا: عرفی، (یعنی کوئی نام نہیں، بس معروف نام یعنی کتا ہی ہے) عرفی نے برجستہ کہا: مبارک باشد (مبارک ہو، اور دوسرے معنی یہ کہ مبارک ہوگا، اور مبارک فیضی کے باپ کا نام ہے)

253

لبریزِ شکوہ بیٹھے ہیں دل سے زباں تلک　　سینے میں دردِ رشک چھپاویں کہاں تلک
شاید پسند اس کی نہ آئے یہ خار و خس　　برق آ کے پھر گئی جو مرے آشیاں تلک
رستے میں اپنا عشق نے قصہ چکا لیا　　جانے دیا نہ اس کے ہمیں پاسباں تلک
صیاد فصلِ گل میں دکھا دے ہمیں چمن　　کیا جانیے جئیں نہ جئیں پھر خزاں تلک
آخر تو جان دے چکے ہیں کیجیے، میاں　　تم سے بھی ہووے ناز و تغافل جہاں تلک
ہے جائے رحم حال تباہ اس غریب کا　　پہنچا نہ مارے ضعف کے جو کارواں تلک
نالے کو اب تو تیرِ[1] ہوائی کا حکم ہے　　وے دن گئے کہ جائے تھا تُہ آسماں تلک
اتنی ہے عرض اس سگِ کو سے کہ بعدِ مرگ　　آنے نہ دے ہُما کو مرے استخواں تلک

راضی وہ ہو جو ہم سے تو ہم کب کے مصحفی
سودے میں اُس کی زلف کے حاضر ہیں جاں تلک

254

کیونکر کرے اب اس کو دلِ بے قرار ترک　　پہلے ہی جب کہ ہو نہ سکی حبِ یار ترک[2]
مُلّا نے اس پہ بھی نہ کیا ترک علم کو　　ہر چند بعد صفحے کے دیکھے ہزار ترک

پوچھے ہے کیا معاش کی ہم سے، کہ مصحفی
ہتھیار کھول ڈالے کیا روزگار ترک

255

ڈرتے ہیں رزقِ تنگ سے کب وہ خدا کے لوگ　　جو مردِ گوشہ گیر ہیں فقر و فنا کے لوگ

1- تیرِ ہوائی = وہ تیر جو نشانے پر نہ چھوڑا جائے　2- ترک = کتابت کی اصطلاح ہے، (عبارت میں کچھ الفاظ کا لکھنے سے رہ جانا)

اپنا تو کربلاے محبت میں گھر ہوا — جاویں وہ کربلا کو جو ہیں کربلا کے لوگ
دھوتے ہیں آنسوؤں سے منھ اپنا بوقتِ صبح — پڑھتے ہیں جب نماز کو صدق و صفا کے لوگ
اے آئینے، عبث ہے تری اس سے رفتگی — ہر اک کے سامنے نہیں آتے حیا کے لوگ
آتا نہیں تو ایک کے گھر اور یاں سدا — رہتے ہیں منتظر تری آوازِ پا کے لوگ
پھر آگئی ہے ہاتھوں پہ با آنکہ سادگی — اس پر بھی کشتہ ہیں تری رنگ حنا کے لوگ
آ کر کے سامنے ترے تیرِ نگاہ کے — ناحق ہوئے نشانہ خدنگِ قضا کے لوگ
پایانِ خط میں آپ ہیں اب، یا یہ خاکسار — فرمایئے کدھر گئے وہ ابتدا کے لوگ

اب رہ نہ تو بھی شہرِ محبت میں مصحفی
شاکی ہیں اس دیار کی آب و ہوا کے لوگ

256

ہیں نظر دوختۂ دولتِ دنیا ہم لوگ — جی میں کیا کیا نہیں رکھتے ہیں تمنا ہم لوگ
ماہ دیکھا کبھی خورشید کا عالم دیکھا — آہ کس کس کے ہوئے محوِ تماشا ہم لوگ
ضبط یاں تک ہے کہ آنے نہیں دیتے قطرہ — ورنہ آنکھوں سے بہاتے ابھی دریا ہم لوگ
گر نہ دل شہر کی کچ بچ[1] سے بتنگ آیا تو — اُٹھ چلے کیوں طرفِ دامنِ صحرا ہم لوگ؟
کرمِ شب تاب کا رکھتے ہیں خواص اپنے میں — جز بہ شب دن کو جو ہوتے نہیں پیدا ہم لوگ
گرچہ ہر روز غذا خونِ جگر ہے اپنی — تو بھی کھاتے نہیں ہرگز غمِ فردا ہم لوگ
قہر تھا قہر اگر عالم و فاضل ہوتے — خیر گزری کہ ہوئے عاشقِ شیدا ہم لوگ
گرچہ دل پاس ہمارے نہیں اک مدت سے — تو بھی دل دینے کی رکھتے ہیں تمنا ہم لوگ
دیکھنے کا مرض اُن سے نہیں جاتا اے واے — اپنی آنکھوں کی کریں کیونکے مداوا[2] ہم لوگ
بعدِ صد قرن کوئی ایسا بھی آجاتا ہے دور — سچ ہے ہر وقت تو ہوتے نہیں پیدا ہم لوگ

1- کچ بچ (بہ کسرِ اوّل)= بے ہنگم زندگی 2- مصحفی نے مداوا کو مونث باندھا ہے

پوچھتا ہم سے نہیں عشق کا قصہ کوئی　　آپ ہوتے ہیں زباں اپنی سے رسوا ہم لوگ

دن کو گریے سے چمن کرتے ہیں صحرا کے تئیں　ق　شب رہیں ہیں بہ تصور چمن آرا ہم لوگ

مصحفی سچ تو یہ ہے گرچہ ہیں دیوانے سے

بارے رکھتے تو ہیں اک عشق کا چرچا ہم لوگ

257

دولتِ فقر و فنا سے ہیں تونگر ہم لوگ　　جوتیاں ماریں ہیں اقبال کے سر پر ہم لوگ

وادیِ عشق میں سو رنج و تعب دیکھیں[1] ہیں　　اپنی وادی سے نہیں ٹلتے ہیں اس پر ہم لوگ

258

ہو مبارک تجھ کو، اے دل نخلِ مرجاں[2] کا پلنگ　　چاہیے ایسا ہی رنگیں ہووے خوباں کا پلنگ

کیونکہ جاؤں در تک اُس کے میں نپٹ حیران ہوں　　واں سے اُٹھتا ہی نہیں اک لحظہ درباں کا پلنگ

اک جھلنگے[3] میں پڑے رہتے ہیں وہ زار و ملول　　کون بُنواتا ہے یاں شوریدہ حالاں کا پلنگ

نعش کشتے کی ترے ہے اس قدر لوہو لُہاں　　جوں نہالی پوشِ رنگینِ[4] عروساں کا پلنگ

رہنے والے عشق کی وادی کے ہیں اشجع، تمام　　تیر پر حملہ کرے ہے اس بیاباں کا پلنگ[5]

گر مری آنکھوں میں آوے استراحت کو وہ شوخ　　اشک[6] کی پٹی بناؤں سار،[7] مژگاں کا پلنگ

بدگمانی کا تری کشتہ ہوں میں، اے مستِ ناز　　گھر سے باہر کس نے بچھوایا ہے مہماں کا پلنگ

کس طرح دیکھوں کہ جب غیر اُس کے گھر آوے کوئی　　وو ہیں کوٹھے پر بچھے اُس ماہِ تاباں کا پلنگ

یاد ہیں وے دن کہ میں راتوں کو اکثر مصحفی

پاس بچھواتا تھا اُس سروِ خراماں کا پلنگ

1- دیکھیں ہیں = دیکھتے ہیں　2- نخلِ مرجاں= مونگے کا پیڑ　3- جھلنگا (بروزن تلنگا) بے کسا ہوا ڈھیلا ڈھالا پلنگ　4- پلنگ =چیتا　5- اشک = آنسو　6- سار = پلنگ کی بلّیاں

259

دیا یہ چشم کو میں وقتِ خوں فشانی رنگ
کہ لے گیا صدف[1] اپنی میں بھر کے مانی رنگ

شبیہ کش نے قضا کے تجھی میں صرف کیا
رکھا قلم میں نہ از بہرِ نقشِ ثانی رنگ

میں ہوں وہ نخل کہ موسم کے بیچ جس کا رہا
ہمیشہ صرصرِ آفات سے خزانی رنگ

نہ کیونکے خوں بہ دلِ خلق جوں شفق وہ کرے
کہ ہے لباس کا اُس گل کے آسمانی رنگ

یہ تہ میں بیٹھی ہے دانتوں کی تیرے سرخیِ پاں
کہ ہیرے کا نہیں لگتا ہے اس کو قانی[2] رنگ

میانِ عالمِ یک رنگی اُس کے چہرے کا
پرکھتی رہتی ہے نت اپنی بدگمانی رنگ

وہ رنگ دوست نہ ہو کس طرح، کہ ہوتا ہے
پسندِ طبعِ حسیناں ہو جو جوانی رنگ

بہار کہہ رہی ہے جی میں پیش از آمدِ گل
کہ اب کے جوگیا جوڑا[3] تو، اے دوانی رنگ

کبھی ہے چہرہ مرا زرد اور کبھی ہے سپید
دکھاوے ہے مجھے کیا کیا یہ ناتوانی رنگ

نقیہ[4] چہرہ یہ کس شاخِ گل کا دیکھا ہے؟
کہ ہوگیا ہے گلِ تر کا زعفرانی رنگ

کیا ہے مصحفی اُس گل نے نیم سبز[5] لباس
کہ زہر گھولے مرے حق میں اُس کا دھانی رنگ

260

دیدۂ تر نے رکھی یوں دلِ کافر پہ آگ
موسمِ باراں میں جوں رکھیں مجامر[6] پہ آگ

لختِ جگر یہ نہ جان قافلہ سالارِ غم
لادی ہوئی جائے ہے اشک کے قاطر[7] پہ آگ

مرنے کو جاتے ہیں جو، دیتے ہیں رکھ بے گناہ
کر کے وہ باروت فرش، پہلے عشائر[8] پہ آگ

سینۂ عاشق کو یوں داغ سے نقصاں نہیں
لاگ[9] سے ہووے دھری جوں کفِ ساحر پہ آگ

1- صدف = سیپی کا آدھا حصہ جسے مصوّر رنگ رکھنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ 2- قانی رنگ = حد سے زیادہ سُرخ رنگ 3- جوگیا جوڑا = جوگیوں جیسا لباس 4- نقیہ = کمزور، افسردہ 5- نیم سبز = ہلکا ہرا 6- مجامر (مجمر کی جمع) بروزن خواطر = انگیٹھیاں 7- قاطر = چوپایہ، خچر (Mule) 8- عشائر = قبیلے، خاندان 9- لاگ = یعنی جادوگر ہاتھوں پر کچھ لگا کر آگ ہتھیلی پر رکھ لیتا ہے۔

شمع صفت اس کا تن کیونکے بھلا پھل نہ جائے — عشق کے شعلے کی ہو جس کے دھری سر پہ آگ
سوزشِ دل کا سبب اہلِ سخن سے نہ پوچھ — روزِ ازل رکھی تھی سینۂ شاعر پہ آگ
سوزِ سخن گو نہ ہو، چاہیے یاں دردِ دل
کر کے بہم مصحفی رکھ دے دفاتر پہ آگ

ل

261

مجھ سے ادا کی اُس نے فریبندگی کی چال — دل لے گئی تبھی تو یہ زیبندگی کی چال
دامن کی دھجیاں نہ اُڑیں کیوں، کہ چلتے ہیں — شوریدگانِ عشق پراگندگی کی چال
چلنا جھکا کے سر کا ترے جی کو بھا گیا — سیکھے ہیں آپ کس سے یہ شرمندگی کی چال
کیا عقربِ فلک کا گلہ ہے کہ ان دنوں — چلتا نہیں ہے ماہ بھی فرخندگی کی چال
سر سیکڑوں کے ہو گئے پامال ناز سے — تو بھی گئی نہ اُس سے سرافگندگی کی چال
دیکھی جو نبض میں ترے بیمارِ عشق کی — جنبش میں اُس کی نکلے تھی خواہندگی کی چال
وہ پانو اُٹھائے جائے ہے اور میری مصحفی
اُس کی گلی میں ہے وہی درماندگی کی چال

262

او میاں بانکے ہے کہاں کی چال — تم جو چلتے ہو نت یہ بانکی چال
ناز رفتار یہ نہیں دیکھا — ہم نے دیکھی ہے اک جہاں کی چال
لاکھوں پامالِ ناز ہیں اُن کے — کون سمجھے ہے ان بتاں کی چال؟
کبک کو دیکھ کر یہ کہنے لگا — "یہ چلے ہے ہمارے ہاں کی چال"
رکھ کے شطرنجِ غائبانہ عشق — تم چلے اک تو امتحاں کی چال

تس پہ دشمن ہمارے جی کی ہوئی   کجی پیلِ آسماں[1] کی چال
مصحفی بھر چلا وہ ریش و بروت[2]
ہوئے جس[3] پیر ناتواں کی چال

263

آج خوں ہو کے ٹپک پڑنے کے نزدیک ہے دل   نوکِ نشتر ہو تو ہاں قابلِ تحریک ہے دل
اے فلک، تجھ کو قسم ہے مری اُس کو نہ بجھا   کہ غریبوں کو چراغِ شبِ تاریک ہے دل
درمِ داغ کئی سامنے رکھ کر اُس کے   عشق بولا "یہ اُٹھالے تری تملیک[4] ہے دل"
مجھ کو حیرت ہے کہ کی عمر بسر اُس نے کہاں   اس جہالت پہ تو، نے تُرک نہ تاجیک[5] ہے دل
کمرِ یار کے مذکور کو جانے دے میاں   تُو قدم اس میں نہ رکھ راہ یہ باریک ہے دل
جامۂ داغ کو ملبوس کر اپنا دن رات   کیونکہ یہ جامہ ترے قد پہ نپٹ ٹھیک ہے دل
مصحفی اک تو میں ہوں دست خوشِ[6] دیدۂ شوخ
تس پہ دن رات مرے درپئے تفحیک[7] ہے دل

264

جبیں سے اپنی مل اک دن میں خاکِ آستانِ دل
کسی معبد میں جا بیٹھوں گا کہنے داستانِ دل
جہانِ چشم اُس سے کس طرح ہووے نہ نورانی
کہ ہے داغِ غم اس کا آفتابِ آسمانِ دل
مجھے پیکاں سے اُس کے اِس لیے الفت زیادہ ہے
کہ دل ہے درمیاں سینے کے، اور وہ درمیانِ دل

1- شطرنج کی بساط پر فیل کی چال ٹیڑھی ہوتی ہے 2- یعنی معشوق کی داڑھی مونچھ بھر کر آ گئیں
3- جس = جیسے 4- تملیک = مالک بنانا، کسی کی ملکیت میں دینا 5- تاجیک = تازی، تاجکستان کا باشندہ 6- دست خوش = سامانِ تفریح 7- تفحیک = ٹٹھول کرنا

خدا کے واسطے، اے آہ، مت قصدِ سفر کر تو،
کہ تیرے دم سے ہے روشن چراغِ دودمانِ دل

جو پہلو میں کسی کے دل کو میں دیکھوں ہوں کہتا ہوں
"کبھیں روزوں مرا پہلو بھی تھا یوں ہی مکانِ دل"

نہیں معشوق کے جاتے تغافل اور توجہ پر
جو عاشق ہیں وہ اپنا کرتے ہیں اب امتحانِ دل

قفا[1] سے اُس کے آیا ڈھونڈتا پھر مصحفی پیکاں
سناں نے اُس کی سینے میں نہ چھوڑا جب نشانِ دل

265

بانکا بنا پھرے ہے ہر روز و شب مرا دل
پھر ان دنوں ہوا ہے شورش طلب مرا دل

سیماب کی طرح سے، ہے بے قرار ایسا
گویا نکل پڑے گا سینے سے اب مرا دل

غصے کے وقت اُس کے کیوں سامنے ہوا تھا
چینِ جبیں سے لایا مجھ پر غضب مرا دل

اُس کی شگفتگی پر کیوں گل نے زہر کھایا
اس باغ میں کھلا تھا جوں غنچہ کب مرا دل

لوگوں کی پاسبانی یہ ہی تو نت کرے گا
واں پُرقلق[2] ترا دل، یاں جاں بہ لب مرا دل

گہ خون ہو بہے ہے، گہ داغ ہو جلے ہے
پیدا کرے ہے ہر دم شانیں عجب مرا دل

سبزے[3] کا کان کے ہی اُس کے عوض دے بوسہ
مہنگا نہیں ہے پیارے، ہے اک عنب[4] مرا دل

دستِ حنائی اس نے تب ناز سے دکھایا
ہو کر کے خون آیا مژگاں پہ جب مرا دل

ڈرتا ہوں میں کہ تجھ سے صحبت بگڑ نہ جاوے
ساقی ٹھٹھول[5] ہے تو، اور بے ادب مرا دل

خدمت تمھاری کی ہے اُس نے عجب نہ تھا کچھ
رکھتے جو تم بھی پیارے اک آدھ شب مرا دل

دیوانگی ہے اُس کی اے مصحفی قدیمی
پہنچائے ہے جنوں کو اپنا نسب مرا دل

1- قفا سے = اس کے پیچھے سے 2- قلق = رنج 3- کان کا سبز آویزہ 4- عِنَب = انگور
5- ٹھٹھول = مسخرہ

266

چاہت کے ڈھنگ اگرچہ جانے تھا سب مرا دل
ناچار ہوگیا ہے لیکن کچھ اب، مرا دل

اختر شماریِ داغ آئی ہے اُس کے حصے
آنکھوں میں کاٹتا ہے ہجراں کی شب مرا دل

سمجھائے سے کسی کے جب یہ نہیں سمجھتا
کہتا ہوں اپنے جی میں "سمجھے گا کب مرا دل"

ایامِ عاشقی کی آتی ہیں یاد دھومیں
یعنی کبھی رکھے تھا رُسوا لقب مرا دل

نے کوئی اُس پہ عاشق، نے کوئی اُس کا طالب
بگڑا کرے ہے ہر دم یہ بے سبب مرا دل

نت تازہ خوب رُو پر للچائے ہے یہ مجھ کو
لاتا ہے مجھ پر آفت اک جب نہ تب مرا دل

بے درد ہر کسی سے آنکھیں تجھے لڑانا
تیری بلا سے ہووے گو جاں بہ لب مرا دل

اے مصحفی کہوں کیا احوالِ زار اپنا
دو دن سے پھر یہ لایا مجھ پر غضب مرا دل

267

ہاں جیتے جی تو دوریِ یاراں نہیں قبول
مرنا قبول ہے مجھے زنداں نہیں قبول

صد چاک ہے یہ، لے کے اسے کیا کروں، جنوں
مجھ کو تو اس طرح کا گریباں نہیں قبول

اللہ رے بے نیازی ترے ناز کی کہ واں
عز و نیازِ دیدۂ گریاں نہیں قبول

روزِ فراق کے تو سہے جائیں درد و رنج
لیکن مصیبتِ شب ہجراں نہیں قبول

حاضر ہیں ہم تو جان سے سودے میں عشق کے
پر دوستوں کو اپنا یہ نقصاں نہیں قبول

مسدود کیوں ہے بابِ اجابت شبِ فراق
اس شب بھی کیا دعائے غریباں نہیں قبول

جا اے طرب نہ کوئے خموشانِ عشق میں
کس واسطے کہ واں لبِ خنداں نہیں قبول

لاشے پڑے ہوئے ہیں شہیدانِ ناز کے
شاید کہ واں یہ نذرِ شہیداں نہیں قبول

اے رشکِ حور، واں نہ ملا تو اگر ہمیں
تو ہم کو پھر یہ روضۂ رضواں نہیں قبول

ٹھکرائے ہے سران کا جو یوں پیر مے فروش
کیا پائے خم بھی سجدۂ مستاں نہیں قبول

یہ قفل کنجی ڈھونڈے ہے، واں شانِ حسن کو اک دم کی پاسبانیِ درباں نہیں قبول

دے کچھ تو مصحفی کو کہ، اے بادشاہِ حسن
آگے گدا کے عذرِ کریماں نہیں قبول

268

اُس کے لب دم بہ دم نہ مس کر دل لے چکا بوسے اب تو بس کر دل
جان جاتی ہے عشق بازی میں ایسی باتوں کی مت ہوس کر دل
آتشِ عشق کا بُرا ہووے اوشاں[1] ہو گیا جھُلس کر دل
دیکھ ناقے کی شوخیِ رفتار رہ گیا نالۂ جرس کر دل
تو بھی آخر اسیرِ الفت ہے اُنس با طائرِ قفس کر دل
کود پڑ آگ میں پتنگ کی طرح گر ہے عاشق نہ پیش و پس کر دل
لے چلی ہے جو دل، تو زلفِ دراز گانٹھ میں باندھ لیچو کس کر دل
شب تاریک اور تصور ہے دزدیِ بوسہ بے عسس کر دل
اشک مژگاں سے تا چوئیں تیرے نہ تمنائے عطرِ خس کر دل
ناگنی زلف کی، بہ روے عذار کیسی بیٹھی ہے میرا ڈس کر دل

ان دنوں ڈوک[2] میں ہے اُس کا گلا
مصحفی کو نہ ہم نفس کر دل

269

چمن کے گلشن سے جب اُس گل نے رکھے کان میں پھول
اشکِ خونیں نے دیے پھر مرے دامان میں پھول

شبِ تاریک میں جھمکیں ہیں ستارے سے پڑے
ہیں چنبیلی کے جو اُس زلفِ پریشان میں پھول

1- اوشاں = راکھ، خاکستر 2- ڈوک = پھندا

یاد گل گشت کے ایام کے گلشن سے صبا
ہم بھی آتے تھے کبھی رکھ کے گریبان میں پھول

رات اندازِ روش سے تری، اے مایۂ ناز
ہو گئے سیکڑوں پامال گلستاں میں پھول

غارتِ دستِ حنائیِ بتاں سے اس سال
نہ رہا ایک بھی لالے کے خیابان میں پھول

سطحِ سینہ ہے پُر از داغ ہمارا اس طرح
جیسے لالے کے مصور ہوں کسی خوان میں پھول[1]

وائے قسمت رہے ہم کنجِ قفس کے قیدی
ہم صفیروں نے بھرے باغ سے دامان میں پھول

رہ گیا داغ یہی جی میں کہ اس جوشش پر
دی نہ ساقی نے مجھے موسمِ باران میں پھول

کس کی نکہت سرِ بازار سے جاتی تھی کہ صبح
گل فروشوں نے چھپا رکھے تھے دُکاں میں پھول

آشیانہ مرے نالوں سے جلا بلبل کا
اُڑ پڑا سروِ چمن کے سر و سامان میں پھول[2]

میری آنکھوں میں ہیں یوں لختِ جگر جلوہ فروش
مصحفی جیسے دھرے ہوں کسی گل دان میں پھول

270

کر کے شب کلکِ تصور سے میں تحریر کا ڈول
باندھ لایا ہی نہ آخر تری تصویر کا ڈول[3]

مل نہ بیٹھی کوئی بات اپنی محبت میں کبھو
ہم نے ہر چند کیا وصل کی تدبیر کا ڈول[4]

1- پھول = شراب 2- پھول پڑنا= آگ لگنا 3- خاکہ 4- تدبیر

تھا عدم میں ترا دیوانہ کہ حدّادِ[1] قضا
واسطے اُس کے گھڑے تھا تبھی زنجیر کا ڈول[2]

جاوے وہ باغ میں جو تشنۂ خوں ہو اپنا
خمِ ہر شاخ میں واں نکلے ہے شمشیر کا ڈول

قصد جس کام کی تدبیر کا ہم کرتے ہیں
ہم کو بگڑا ہی نظر آئے ہے تقدیر کا ڈول

رشتۂ[3] سال گرہ اُس کا نہ کیوں ہو دل کش
کہ ہے ٹھیک اُس میں کسی زلف گرہ گیر کا ڈول[4]

کیا کہیں چوک ہوئی دھیان میں رکھنا تھا ہمیں
کچھ تو اس خاک کے پتلے کی بھی تعمیر کا ڈول

لاکھ سوہانِ[5] تغافل کی تراشیدہ ہے آہ
تیر گر[6] ہووے تو کچھ سمجھے مرے تیر کا ڈول[7]

سبزہ ہوتا جو چلا ہے ترے رخ پر آغاز
کشورِ ہند کی بندھتا ہے یہ تسخیر کا ڈول

استخواں بندیِ الفاظ[8] کا عالم تُو دیکھ
اہلِ معنی کی جدا ہووے ہے تقریر کا ڈول

مصحفی حسرتِ دل خوں میں جو تڑپے ہے پڑی
صفحۂ شعر میں ہے کاغذِ نخچیر کا ڈول

271

کب ہوا ہم سے سراپا تو ترے تن کا مول
ساقِ سیمیں ہے فقط اک تری گردن کا مول

دستِ حورا[9] میں جو تولیں ہیں ترے ساعد کو
عقد پرویں کے تئیں کہتے ہیں کنگن کا مول

حلقۂ نتھ ہے ترا سجدہ گہِ اہلِ نماز
اور بطِ قبلہ نما[10] اُس کے ہے لٹکن[11] کا مول

کیا کروں سروِ خراماں کی میں اپنے تعریف
نہ تو رفتار کی قیمت ہے نہ دامن کا مول

بخیہ کاری سے مرے چاکِ گریباں کی، مسیح
ہاتھ آیا نہ کبھی تیرے تو سوزن کا مول

مسّی آلودہ لب اس گل کے ہیں وہ قہرِ خدا
جن کی خاموشی ہے خود غنچۂ سوسن کا مول

کیا زلیخا سے بھلا اُس کی خریداری ہو
حسن یوسف صفتاں جس کی ہوں چتون کا مول

1- حدّاد= لوہار 2- ڈول= سانچا 3- پہلے زمانے میں سالگرہ ایک سرخ ڈورے میں گرہ لگا کر، دعائیں پڑھ کر مناتے تھے۔ 4- انداز 5- سوہان = چھینی، ریتی 6- تیرگر = تیر بنانے والا 7- بناوٹ، کاریگری 8- استخواں بندی الفاظ = ٹوٹے پھوٹے الفاظ سے ترکیب بنانا 9- حورا = حور کا واحد 10- بطِ قبلہ نما جیسے مرغ قبلہ نما، کوئی پرندہ جو ہوا سے حرکت کرتا رہتا ہے اور قبلہ کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ 11- لٹکن = جس کے سہارے سے آویزاں کیا جائے۔

فندقِ پا گل اور نگ کو ڈالے ہے ملے سرخیِ رنگِ کفک ہے گل و گلشن کا مول

تیغ ابرو پہ تری مصحفی کیوں جان نہ دے
جو سپاہی ہے وہی سمجھے ہے آہن کا مول

272

مے پی کے نشے میں ہو بدمست مرا غافل خلوت میں مری پہروں رہتا ہے پڑا غافل
تو شوق سے سو لیکن اتنا بھی نہ رہ بے گاہ جو پانو کی چھٹ جاوے یوں بستہ حنا غافل
کیا لاش پہ میری تو جاتا ہے، خراماں ٹک لوہو سے مرے اپنا دامن تو بچا غافل
آنکھیں مرے چہرے پہ بینا تھیں کہ اندھی تھیں وہ پاس رہا میرے میں اُس سے رہا غافل
کل وہ مرے پہلو سے جوں تیر گیا، ہے ہے اتنا بھی نہ کر دیوے بندے کو خدا غافل
مضطر ہو خیال اُس کا آیا گلہ کرنے کو یاں یاد سے میں اس کی گر ٹک بھی ہوا غافل
بوے سمن و سنبل اغلب کہ اُڑا لاوے تو خواب گہ اُس کی میں گر جاوے صبا غافل
کیا ہوش کا دم مارے یاں کوئی فلاطوں کو دے دار وے بے ہوشی کرتی ہے قضا غافل
یہ طرفہ تماشا ہے قدموں کے تلے اُس کے میں جاں بہ لب، اور مجھ سے وہ مستِ حنا غافل

تم مصحفی اپنے کو دیکھو تو ذرا پہروں
کچھ آپ سے رہتا ہے یہ بے سر و پا غافل

273

گھر سے اپنے جو دیا اُس نے ہمیں رات نکال منفعل پیچھے ہوا منھ سے میں اک بات نکال
جن میں حلّت[1] تھی مے و نغمہ کی ہم سنتے ہیں آہ قرآن سے ڈالی ہیں وہ آیات[2] نکال
حور دیکھ اُس کے تئیں کہتی ہے جی ہی جی میں اُس سے دو باتیں کر اور راہِ ملاقات نکال
ہے بڑا خُمس[3] کے دینے کا ثواب، اے منعم کچھ تو مال اپنے سے تو نیّت سادات نکال

1- حلّت = حلال ہونا 2- مصحفی نے خدا جانے یہ بات کیسے لکھ دی، قرآن سے کوئی آیت نہیں نکالی گئی۔
3- خُمس = مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ جو اہلِ بیت کے لیے تھا۔

ہاتھ نباض کا چھٹتے ہی گریباں پہ گیا اُس نے پردے سے جو چلمن کے دیا ہات نکال
ناتراشیدہ گر آوے ہے تو موزوں طبعاں بزم سے دیتے ہیں اُس کو بہ کنایات نکال
چل گلستاں کو تو ساقی، کہ بہار آئی ہے نخل سب باغ کے لائے ہیں ہرے پات نکال
مصحفی آنکھیں بھری آتی ہیں چپ رہ ظالم
مجھ سے دلی کا نہ مذکورِ محلات نکال

274

آ کے مہندی نے لگایا یہ تری مشت پہ قفل جیسے ابخل[1] کی لگا ہووے زرِ انگشت پہ قفل
کیا کھلے وہ کہ ترے حسن کے شعلے کے حضور وصفِ آتش میں لگا ہے لبِ زرتشت پہ قفل
قفل و کنجی کی جو اُس شوخ نے چوٹی گوندھی پھر زباں دے نہ سکی حرفِ فلاں کُشت[2] پہ قفل
نہ کھلا جنّ و پری پر جو معمّاے فلک کسی ابجد کا لگایا تھا یہ اس کُشت پہ قفل
کچھ تو اس فرض میں اے مصحفی حکمت ہوگی
ہے بتاسے کا کشف کی جو لگا پشت پہ قفل

275

وہ نہال تازہ کھاتا ہے لچک جوں شاخِ گل یوں وہ قد جاتا ہے مستی میں لٹک، جوں شاخِ گل
خامۂ نقاش سے نکلی نہ اُس گل کی شبیہ رہ گیا کاغذ پہ آخر سر پٹک، جوں شاخِ گل
یہ مزے میں ہے کہ دیوانے کے تیرے جسم پر بید قچی[3] ہی سے چھڑکے ہے نمک جوں شاخِ گل
آخرش گل کرر[4] ہے ہے مجھ سے میرا رنگِ لطف مجھ کو کانٹوں میں رکھے ہے گو فلک جوں شاخِ گل
ناز کے کشتے کی تربت سے جو اُگتی ہے سناں سایۂ بلبل سے جاتا ہے جھجک جوں شاخِ گل
یہ نہیں واقف، چھلاوا[5] ہو کدھر جاتا رہا ساتھ تھا میرے کوئی گلشن تلک جوں شاخِ گل

1- ابخل = بخیل کا اسم تفضیل۔ بہت زیادہ کنجوس 2- فلاں کُشت = یعنی فلاں کو مار ڈالا
3- قچی = بید کی لچک دار چھوٹی سی قچی جو عموماً مدرسوں کے استاد ہاتھ میں رکھتے تھے۔
4- گل کرنا = ظاہر کرنا 5- چھلاوہ = آسیب، بھوت، جھلک دکھا کر چھپ جانے والا

مصحفی ہے سوچ میں اب تک کہ کیا شوخی سے رات
چھپ گئے تم بس دکھا کر اک جھلک جوں شاخِ گل

276

کیوں کروں آرزوے زلفِ دوتا کیا حاصل؟
پیچھے اپنے میں لگاؤں جو بلا، کیا حاصل؟

تم نے رسوا تو کیا مجھ کو پہ یہ پوچھوں ہوں
تم کو ان باتوں سے، اے یار و ہوا کیا حاصل؟

گل کی پتی کی طرح کیوں اُسے لپٹا جاؤں
اینٹھی ہی جائے ہے کچھ موجِ ہوا کیا حاصل؟

تم جو رسوا مجھے کرتے ہو شکایت کر کے
یہ تو فرماؤ کہ پھر اس سے بھلا کیا حاصل؟

اس کے کوچے میں ذرا خاک کو رہنے دے مری
تجھ کو اس کاوشِ بے جا سے، صبا کیا حاصل؟

آ گو ہی نعل در آتش ہیں تمھارے مشتاق
تم جو لگواتے ہو ایڑی کو حنا کیا حاصل؟

مصحفی گر تو جیا لاکھ برس دنیا میں
آخر اک دن تری آوے گی قضا، کیا حاصل؟

م

277

گھر کو عاصی کے میاں اپنا ہی گھر سمجھو تم
ہر طرح میں تو تمھارا ہوں اگر سمجھو تم

اہلِ نظارہ کو کہتی ہے یہی نرگسِ باغ
نیچی آنکھوں کا بھی اندازِ نظر سمجھو تم

سر اُٹھاؤ نہ شبِ وصل مرے زانو سے
رات کی رات، اسے بالشِ پَر [1] سمجھو تم

اے مقیمانِ چمن بھر لو ذرا دامن میں
گل کی پتی کو مرے لختِ جگر سمجھو تم

لب و دندان کی کیا اس کے کہوں، زہا دو
قیمت لعل نہ سودائے گہر سمجھو تم

دل لگانے کی نہیں جا یہ جہانِ فانی
دوستو یاں کی اقامت کو سفر سمجھو تم

1- بالشِ پَر = پروں سے بھرا ہوا نرم تکیہ

ایسی باتوں میں میاں مصحفی رسوائی ہے
اُس کے پیچھے نہ پھرو شام و سحر، سمجھو تم

278

مکھڑے پہ ہے از بسکہ ترے نور کا عالم — صاف اس سے نکلتا ہے پڑا حور کا عالم
دل ہاتھ سے جاوے نہ کہ صانع نے رکھا ہے — ساعد میں ترے لعبتِ[1] کافور کا عالم
ہر چند کہ نرگس نے چڑھائے کئی فنجاں — پایا نہ تری نرگسِ مخمور کا عالم
ممکن ہے کہ اُٹھ جائے اگر پردۂ ممکن — آجائے نظر تجھ کو بھی منصور کا عالم
زلفوں میں تری عقدِ گہر چمکے ہے اس طرح — جوں تاک میں ہو خوشۂ انگور کا عالم
وہ جالیاں یاد آویں نہ کس طرح کہ جن میں — تھا چار طرف خانۂ زنبور کا عالم
ہر چند کہ سرکش ہے بہت سروِ سہی بھی — پاتا ہے کوئی اُس بتِ مغرور کا عالم
افسردگیِ گل بھی نہیں لطف سے خالی — زیبندہ ہو جوں شاہدِ رنجور کا عالم
با آنکہ ملا کاسۂ سر خاک میں لیکن — ویسا ہی رہا اس سرِ پر شور کا عالم

اے مصحفی وہ صفحہ کوئی اُس کو دکھا دے
جس صفحے پہ ہو ناظر و منظور کا عالم

279

وہ بتِ شوخ بٹھا کر کے قطارِ مردم — قتل کے واسطے کرتا ہے شمارِ مردم
اور کیا خاک نظر آئے ہے ان اندھوں کو — ہے شب و روز کا آئینہ دو چارِ مردم
اب یہ عالم ہے کہ جو ہے سو چلا آتا ہے — کبھی کوچے میں نہ تھا جس کے گزارِ مردم
جس طرح آنکھوں میں کاٹوں ہوں میں تجھ بن شبِ ہجر — کیا اسی طرح کٹے ہے شبِ تارِ مردم
آدمی ہم کو سمجھتا ہی نہیں یاں کوئی — کاش ہم لوگ بھی آتے بہ شمارِ مردم
کچھ تو دیکھا ہے جو ہر لحظہ مرے دیدۂ تر — گوہرِ اشک کو کرتے ہیں نثارِ مردم[2]

1- لعبت کافور = کافور کا بنا ہوا کھلونا 2- مردم = آنکھ کی پتلی

خوار پھرتے ہیں پڑے اہلِ فراست شب و روز　　اس زمانے میں نہیں بسکہ وقارِ مردم
ایک یہ؟ کشتۂ شمشیر تغافل تھے سبھی　　سیکڑوں ہیں ترے کوچے میں مزارِ مردم
آہوے چشم ترا آئے ہے جب شوخی پر　　حرمِ کعبہ میں کرتا ہے شکارِ مردم
تجھ پہ دو چار میں تلوار جہاں چل جاوے　　دیکھیے واں دمِ خوں ریز بہارِ مردم
جا کے میں بیٹھ رہا گوشۂ تنہائی میں　　نہ رہا مجھ سے بس اب کچھ سروکارِ مردم
اب ملاقات ہے دشوار مری بعد از مرگ　　ہاں مگر ہو مری تربت پہ گزارِ مردم

مصحفی پڑتی ہے آنکھ اس پہ تو چاہے ہے یہ اشک
کیجیے پنجۂ مژگاں سے فشارِ مردم

280

ہر چند کہ وہ جواں نہیں ہم　　اتنے بھی تو ناتواں نہیں ہم
قیمت ہے ہماری اک تبسم　　اس نرخ پہ کچھ گراں نہیں ہم
ہیں کنجِ قفس کے رہنے والے　　پروردۂ آشیاں نہیں ہم
کیوں در پہ رہیں ہمیشہ بیٹھے　　کچھ آپ کے پاسباں نہیں ہم
تصویر کسی کی دیکھتے ہیں　　محوِ گل و بوستاں نہیں ہم
گر آنکھ ذرا بھی تو نے پھیری　　تو، گردشِ آسماں، نہیں ہم
ہاتھوں سے ترے، بہارِ خوبی　　شرمندۂ برگِ پاں نہیں ہم
تم تک بھی پہنچ رہیں گے آخر　　کچھ دور تو ہمرہاں نہیں ہم
کس روز جراحتوں پہ دل کی　　اشکوں سے نمک فشاں نہیں ہم
مجلس سے کرے ہے ہم کو باہر　　گویا کہ مزاج داں نہیں ہم
سایے سے ہمارے اتنی نفرت　　کافر بھی تو اے بتاں، نہیں ہم
ہے چار طرف ہمارا جلوہ　ق　ڈھونڈے جو کوئی، کہاں نہیں ہم
یعنی کہ بہ رنگِ نکہتِ گل　　پردے میں ہیں اور نہاں نہیں ہم

ملتا ہے ہر اک سے مصحفی یار
سمجھے ہے کہ بدگماں نہیں ہم

281

لب نہ حرف آشنا کریں گے ہم — جی ہی جی میں کھپا کریں گے ہم
اے زباں، کھولیو نہ قفلِ سکوت — تیرے حق میں دعا کریں گے ہم
یہی اطوار اس کے کہتے ہیں — "کیوں نہ تجھ سے وفا کریں گے ہم!"
رہنے والے قفس کے ہیں، کب تک — انتظارِ صبا کریں گے ہم
یہ جو چند استخوان باقی ہیں — ان کو نذرِ ہُما کریں گے ہم
جب تک اپنی زباں رہے گی تر — دوستوں کا گلہ کریں گے ہم
دردِ دوری سے جاں لبوں پر ہے — کس دن اس کی دوا کریں گے ہم
اب تو قاتل نے ہم کو قتل کیا ق یہ سمجھ کر کے، کیا کریں گے ہم!
پر قیامت میں گر دو چار ہوئے — دعویٰ اس خون کا کریں گے ہم
گر نہ جاویں گے اُس کے کوچے میں — مرتے مرتے بُرا کریں گے ہم

مصحفی گر کیا دو روز فراق
یہی ڈر ہے کہ کیا کریں گے ہم

282

کھا تیرِ نگہ اُس کا جو یک بار گرے ہم — جا بسترِ اندوہ پہ ناچار گرے ہم
مستوں کی سی حالت رہی اُس کوچے میں اپنی — سو بار اُٹھے خاک سے، سو بار گرے ہم
کہتے ہیں مرے اشک مجھے "فائدہ پھر کیا — رک کر تری آنکھوں سے جو دو چار گرے ہم"
لے بخش دے تقصیر ہماری کہ شب آکر — پانو پہ ترے مثلِ گنہگار گرے ہم
ہرچند گرانے کا کیا قصد ہمارے — اس گنبدِ گردوں سے نہ زنہار گرے ہم
جانا سبھی عالم نے سبک ہم کو، پہ صد شکر — تو بھی تری نظروں سے نہ اے یار گرے ہم

افلاک ڈراتے ہیں ہمیں مصحفی ہر شب
کہہ کر کے یہی حرف ''خبردار، گرے ہم''

283

یوں کہیے تو گھوڑے سے کئی بار گرے ہم　　پر شکر کسی دل سے نہ زنہار گرے ہم
دیکھا جو کہیں سادہ رخ و مستِ تغافل　　اِس جنس پہ جوں تازہ خریدار گرے ہم
ہنگامہ ہمیں تک ہے یہ، ہو جائے گا پرچھا[1]　　جس وقت کہ کھا کر تری تلوار گرے ہم
آئی یہ صدا، سوجھے بھی ہے کچھ تجھے اندھے　　اُس در سے اُگھٹ کر[2] جو شبِ تار گرے ہم
میخانے سے آتے تھے پیے بادہ، پہ ہم کو　　خفت یہ ہوئی بر سرِ بازار گرے ہم
گرنے کا تو کیا ذکر تھا پر اُٹھتے ہی اس کے　　لغزش یہ ہوئی پانو کو ناچار گرے ہم
اے مصحفی کل کوچۂ خوباں میں گئے تھے
دیکھا جو وہاں سایۂ دیوار، گرے ہم

284

خاکسارانہ وہیں کیوں نہ ملے خاک میں ہم　　آ گئے دیکھ اُسے گردشِ افلاک میں ہم
اب کے آئی جو شبِ ہجر تو یہ ٹھانی ہے　　نمک سودہ بھریں گے جگرِ چاک میں ہم
ہائے وہ خوشۂ انگور لگا غیر کے ہاتھ　　جس کی رہتے تھے شب و روز لگے تاک میں ہم
اپنی حسرت پہ ہمیں کیوں نکے نہ رونا آوے　　آہ مارے گئے ہیں دوستیِ پاک میں ہم
کھل گیا سب پہ جو خجلت کا ہماری مضموں　　کتنے نادم ہوئے ہیں بھیج کے خط ڈاک میں ہم
آہ اس کو سے پھرے زندہ یہی خجلت ہے　　اپنا سر باندھ نہ آئے تری فتراک میں ہم
مصحفی باندھی ہیں ہم تو بہ تصور آنکھیں
اور وہ سمجھے ہے کہ ہیں نشۂ تریاک میں ہم

1- پرچھا = خاموشی　　2- اگھٹ کر = ٹکرا کر

285

جوں بادِ صبا آتے ہی گلشن سے چلے ہم ٹھہرے نہ کسی نخل کے سایے کے تلے ہم
یا ناز سے تھے دامنِ مادر میں پلے ہم یا آ گئے یوں خاک کے دامن کے تلے ہم
ایّام بہار آتے ہی صحرا کو چلے ہم بیٹھیں گے کسی نخل کے سایے کے تلے ہم
تھا یہ تنِ کاہیدہ جو نم اشک سے، ہم کو جوں ہیزمِ تر[1] جتنا جلایا نہ جلے ہم
تاروں سے یہ چھونے کے نہیں کم ہے عزیزو اب ایسے گریباں کو منڈھیں کس کے گلے ہم
دل مانگے ہے وہ ہم سے پہ ہم دے نہیں سکتے مدت سے یونہیں کرتے ہیں آرے و بلے[2] ہم
رامِ نگہ عربدہ جو ہوتے ہیں کوئی ہیں سایۂ مژگاں کے تغافل کے پلے ہم
ہر لحظہ نہ نزدیک ہمیں اپنے بٹھاؤ ہیں لوگ برے، جان مری، دور بھلے ہم

اے مصحفی، ہر چند زمیں ہے یہ کٹیلی
کرتے ہیں اسے اور بھی گلزار ولے ہم

286

کس آتشِ سوزاں کے لگے رات گلے ہم جو آج تفِ سینہ سے جاتے ہیں جلے ہم
اُس کوچے سے کیا اب سفرِ دور چلے ہم پھر پھر کے جو یوں لگتے ہیں ہر اک کے گلے ہم
سمجھیں گے یہی روضۂ رضواں میں پلے ہم یک چند رہے گر ترے قدموں کے تلے ہم
میں نے جو کہا ان سے "کہاں جاتے ہو صاحب؟" یوں کہنے لگے منھ کو پھرا "روٹھ چلے ہم"
دامن کو اُٹھا بہرِ خدا سروِ خراماں اس چال سے تو خاک میں جاتے ہیں رَلے ہم
وہ نخل ہیں سرما زدۂ گلشنِ ہستی جو فصلِ بہاراں میں نہ پھولے نہ پھلے ہم
میں نے جو کہا "سی دو گریباں مرا" بولے "پھرتے ہیں ابھی ہاتھوں سے مہندی کو ملے ہم"
اس شوق کو تم دیکھو کہ گر صبح کو نکلے تو آئے گھر اپنے کہیں دوپہر ڈھلے ہم

1- ہیزم تَر = گیلی لکڑی 2- آرے و بلے = جی ہاں

گر دستِ حنائی کو رکھا یار نے تپ میں سینے سے یہی نکلی صدا "ہائے جلے ہم"

اے مصحفی کیوں کرنے لگے چاک گریباں؟
کیا ہو گیا ہم کو؟ تھے ابھی چنگے بھلے ہم

287

کچھ اِن دنوں ہے یہ اُس رشکِ ماہ کا عالم کہ اُس کو دیکھنے لگتا ہے راہ کا عالم

جھکی پڑیں ہیں ستاروں کی آنکھیں درشبِ مہ غضب ہے اُس مہِ زرّیں کلاہ کا عالم

شبِ فراق سیاہی کو اپنی جاوے بھول جو دیکھے وہ مرے روزِ سیاہ کا عالم

ملے ہے عید کی لذت اُسے محرّم میں جو دیکھے ہے ترے رختِ سیاہ کا عالم

اُسی جگہ پہ ذرا اپنا جی بہلتا ہے جہاں ہو سبزہ و آب و گیاہ کا عالم

رہے ہے سر بہ گریبان روزِ محشر بھی جو دیکھتا ہے ترے داد خواہ کا عالم

غضب ہے، قہر ہے، آفت ہے اور قیامت ہے خدا دکھائے نہ ترچھی نگاہ کا عالم

ہوا ہے محو جو صورت کا تیری، اَور سے اَور نظر پڑے ہے ترے داد خواہ کا عالم

سماں وہ بارہ[1] وفاتوں کا کیوں نہ یاد آوے کہ واں بھی تھا عجب اک وعدہ گاہ کا عالم

بتانِ ہند جو اُترے ہیں قطب صاحب میں ہے رشکِ بت کدہ ہر خانقاہ کا عالم

مزے یہ حسن پرستی میں ہم نے لوٹے ہیں کہ اُن کو لگ نہیں سکتا گناہ کا عالم

کہوں میں کیونکے، گیا مجھ سے مصحفی غمِ عشق؟
وہی فغاں ہے، وہی آہ آہ کا عالم

288

پیشِ پا اُس کے ہوئے ہیں جو کئی بسمل تمام خوں سے افشاں ہو گیا ہے دامنِ قاتل تمام

پھر گیا جب ناقہ، تب مجنوں نے اپنی جان دی اُس کو ہو جانا تھا پیشِ صاحبِ محمل تمام

1- بارہ وفات = 12 ربیع الاول کو میلاد النبی کی محفلیں

کاں کے یاں کو آئے ہیں خوبانِ ہند (کذا) ہے مرقّع کاغذِ تصویر کا ساحل تمام

قیس کو از بس دیا پیغام لیلیٰ نے مرا　　ساتھ قاصد کے وہ خود طے کر گیا منزل تمام

زخمِ حرماں سے نہیں اب تک بھی سیری کیا کروں　　کاشکے ہوتا سراپا جسم میرا دل تمام

رفتہ رفتہ خط نے اُس کا رخ سیہ یوں کر دیا　　جوں گہن لگنے سے نورِ ماہ ہو زائل تمام

کیا خلل واقع ہوا جو ان دنوں اے مصحفی
رخنۂ دیوار ہیں اس شوخ کے پُر گل تمام

289

آنکھیں آملی مل گئے جو اس پہ صاحب دل تمام　　تختۂ نرگس ہے اب تربت کی میری سل تمام

ناقۂ لیلیٰ جہاں پیچھے ذرا رہ جائے ہے　　قافلے والے کھڑے کر رکھتے ہیں محمل تمام

جب نہا کر گنگ سے نکلا ہے وہ تصویرِ حسن　　موتیوں سے بھر گیا ہے دامنِ ساحل تمام

طرفہ گردش میں فلک نے ہم کو ڈالا ہے کہ اے　　رات دن چلتے ہیں اور ہوتی نہیں منزل تمام

ٹک تو خیمے سے نکل کر دیکھ تو دریائے حسن　　تڑپیں ہیں تیری طنابوں کے تلے بسمل تمام

قتل میں عاشق کے ہے خاصیتِ مردم گیاہ[1]　　ہمرہِ مقتول ہو جاتا ہے یاں قاتل تمام

ہوں تو میں محفل میں تیری، پر ہجومِ رشک سے　　خون کی پیاسی مرے بیٹھی ہے یہ محفل تمام

مصحفی اک ہو گئی ہے اور بھی مجھ سے غزل
کیونکے یک جا ہوں مکرر قافیے شامل تمام

290

کم نہ سمجھو جسمِ انساں ہے سراپا دل تمام　　حاملانِ عرش ہیں اس خاک کے حامل تمام

کشتہ تیری تیغ کا سرگشتہ اک مدت رہا　　اولِ منزل پہ بس اُس کی ہوئی منزل تمام

لا کے کوچے میں ترے کہتی ہے یوں مجھ سے قضا　　"اس زمیں پر ہو چکے ہیں سیکڑوں بسمل تمام"

1- مردم گیاہ = ایک قسم کی گھاس جسے مہر گیاہ بھی کہتے ہیں۔ انگریزی میں (Mardragora)

حسن کا تیرے نہ دیکھا ابتدا اور انتہا　　نور کا سطحہ[1] ہے یہ دریاے بے ساحل تمام

روزِ محشر طرفہ اک ہنگامہ برپا ہووے گا　　جب اُٹھیں گے اس کی تیغِ ناز کے گھائل تمام

رہ گئی کشتے کو اس کے زخمِ ثانی کی ہوس　　ہوگئی اک زخم ہی میں قوتِ قاتل تمام

آئی جب بس میں تو اے دل تو تڑپ کر رہ گیا　　یہ شبِ ہجراں نہ کی تو نے کبھی جاہل تمام

اک جھلک میں نجد کے ساکن پہ یاں بجلی پڑی　　اور ابھی اُٹھا نہ تھا واں پردۂ محمل تمام

گھونگچی[2] کو بھی میں دیکھا کچھ ہے سرخ اور کچھ سیاہ　　داغ دار ایسی نہیں جیسا کہ میرا دل تمام

مصحفی اک جسم کا پردہ جہاں یکسو ہوا
یہ سمجھ تو درمیاں سے اُٹھ گئے حائل تمام

291

آنکھیں لڑاتے رہتے ہیں حور و پری سے ہم　　منھ پھیر لیں نہ کیونکے مہ و مشتری سے ہم

اوراقِ منتشر کی طرح بے محل پڑے　　دیوانِ روزگار کی ہیں ابتری سے ہم

نقشا نہ تیرے حسن کا ہم سے رقم ہوا　　حیراں ہیں کلکِ صنع کی صنعت گری سے ہم

پتھر کو پھاڑ ڈالیں ہیں ہاتھوں سے جوں حریر　　اتنے ہوئے ہیں مشقِ گریباں دری سے ہم

اس کا تو دھیان کب ہے مگر اس کے نقشِ پا　　اک دن، کہیں ہیں سمجھیں گے کبکِ دری سے ہم

مجروحِ چشمِ یار جو ہیں اس لیے کبھی　　بہلاتے دل ہیں اپنا ذرا خنجری سے ہم

اتنے جلے ہوئے ہیں کہ محشر کو آئیں گے　　عرصے کے بیچ جامۂ خاکستری سے ہم

جوں شمع اس میں آپ کو آخر گھلا دیا　　کچھ پیش لے گئے نہ زباں آوری سے ہم

اے مصحفی کہیں ہیں غزل در غزل ہنوز
با آنکہ کام رکھتے نہیں شاعری سے ہم

1- سطحہ = پاٹ　2- گھونگچی = ایک سرخ و سیاہ دانہ جسے رتی کا باٹ بنا کر بھی استعمال کیا جاتا تھا۔

292

سوزک[1] اُٹھا چکے فلکِ چنبری[2] سے ہم
اس پر بھی باز آئے نہ جادوگری سے ہم

آتے ہیں کوئی دام میں جادوگری سے ہم
ہوتے ہیں رام بھی، تو میاں دلبری سے ہم

کنجِ قفس میں چھیڑ نہ آکر ہمیں، سرک
گزرے صبا تری بھی پیام آوری سے ہم

میں اُنسے لگ چلا تو یہ بولے کہ "بے شعور
سودا کریں ہیں کوئی ہر اک مشتری سے ہم"

پونچھا کریں ہیں نت اُسے ناسور کی طرح
عاجز ہیں اپنے زخمِ جگر کی تری سے ہم

چتون ادھر پڑی، نہ کبھی آنکھ ہی لڑی
مارے پڑے فقط نگہِ سرسری سے ہم

جوں خاکِ[3] تیرہ، رنگ ہمارا سیاہ ہے
یہ تو کلنک[4] رکھتے ہیں اک بے زری سے ہم

تلوے شب اُس کے کہتے تھے آپس میں یوں کہ "واہ
کیا روکشی کریں گے مہ و مشتری سے ہم؟"

روتے ہی روتے صبح ہمیں شام ہوگئی
چونکے جو خوابِ وصل کی ہم بستری سے ہم

رنگِ کفک[5] سے کہتے ہیں یوں لالہ ہائے زرد
اس رنگ[6] کو تو پہنچے ترے ہمسری سے ہم

روز اک جفائے تازہ کا مذکور لے چلے
باہر گئے نہ محکمۂ داوری سے ہم

اے مصحفی حسد سے جو چاہے کوئی کہے
انصاف ہو تو کم نہیں کچھ انوری سے ہم

293

کیا خطّ و کتابت اسے تحریر کریں ہم
خود جاویں، تو کچھ آپ ہی تقریر کریں ہم

نالے شبِ ہجراں کے یہی کہتے ہیں مجھ سے
چاہیں تو دلِ سنگ میں تحریر کریں ہم

طاقت نہیں اتنی بھی کہ زنجیر کٹے پر
پانووں سے جدا حلقۂ زنجیر کریں ہم

کہتی ہے یہ لیلیٰ کہ جو مجنوں ادھر آوے
گلیوں میں اُسے شہر کی تشہیر کریں ہم

گر زلف سے چھوٹے تو پھنسے دام میں خط کے
اب یاں سے نکل جانے کی تدبیر کریں ہم

1- زک = مات 2- چنبری = گول، دائرے کی شکل کا 3- خاکِ تیرہ = کالی مٹی
4- کلنک = کالا دھبا 5- کفک = ہتھیلی 6- اس حال کو

دل زیر و زبر سینے میں ہے گریے سے اپنا	یوں چاہیے اب خندہ بہ تقدیر کریں ہم
اتنی ہے تمنا کہ دمِ ذبح بہ حسرت	دو چار نگاہیں تہِ شمشیر کریں ہم
اے مصحفی حیران ہے یاں کلکِ مصوّر
کیا اس کے خط و خال کی تحریر کریں ہم

ن

294

اپنا رفیق و آشنا غیرِ خدا کوئی نہیں	رنج و محن میں غم زدا[1] غیرِ خدا کوئی نہیں
پوچھا جو میں حکیم سے، علّتِ کن فکاں ہے کون؟	سوچ کے اُس نے یہ کہا "غیرِ خدا کوئی نہیں"
کعبے کا شب کو میں جو جا، حلقۂ در ہلا دیا	آئی صدا یہ "اندر آ غیرِ خدا کوئی نہیں"
عارف اگر بہ چشمِ غور آئینۂ جہاں کے بیچ	دیکھے تو سمجھے رونما غیرِ خدا کوئی نہیں
گرچہ جہاں ہے ماسوا ذات کے اُس کی مصحفی
سوچیے پھر تو ماسوا غیرِ خدا کوئی نہیں

295

یہ دل وہ شیشہ ہے جھمکے ہے وہ پری جس میں	بھرا ہے موے بہ مو سحرِ سامری جس میں
یہ لعلِ لختِ جگر ہے وہ لعلِ بیش بہا	کہ کام کرتی نہیں چشمِ جوہری جس میں
دیا ہے میں نے دل ایسے کو اور پریشاں ہوں	نہ مہر ہے، نہ محبت، نہ دلبری جس میں
خدا دوچار نہ ہم سے کرے کبھی اُس کو	نکلتی ہو تری آنکھوں سے کافری جس میں
ہٹے[2] ہے مانی سے لیلیٰ کہ وہ ورق تو دکھا	لکھی ہے صورتِ مجنوں کی لاغری جس میں
غضب ہے تو نے نہ دیکھا وہی مرا دل تھا	بندھی ہوئی تھی ترے تیر کی سری جس میں

1۔غم زدا (آخر میں الف) زدودن مصدر سے، بہ معنی دور کرنا 2۔ ہٹے ہے یعنی ہٹ کرتی ہے (ضد، اصرار)

کسی سے کام میاں مصحفی نہ کچھ رکھیے
وہ کام کیجیے ہو اپنی بہتری جس میں

296

دل مفت میں اسیرِ بلا ہو تو کیا کروں؟ نظّارہ باز زلفِ دوتا ہو تو کیا کروں؟
لکھتا تو ہوں میں غیر کا شکوہ، اسی طرح کچھ غیر نے بھی اُس کو لکھا ہو تو کیا کروں؟
بھیجا تو قاصد اس کے کنے [1] دے کے خط و لے قاصد کو واں جواب ملا ہو تو کیا کروں؟
تیرِ کرشمہ دل پہ لگا اور نہ آئے اشک سوے جگر جو خون بہا ہو تو کیا کروں؟
جانا مجھے قبول ہے دوزخ میں لیک واں آتش تمام رنگِ حنا ہو تو کیا کروں؟
لے جاؤں ساتھ غیر کو سیرِ چمن میں لیک اُس پر بھی التفاتِ صبا ہو تو کیا کروں؟
سو منتوں سے جس کو منایا ہو مصحفی
گر بیٹھے بیٹھے پھر وہ خفا ہو تو کیا کروں؟

297

رستے میں اس کے لاکھوں نت باندھے صف کھڑے ہیں لے کاسہ بعضے بعضے سائل بہ کف کھڑے ہیں
گہ تیر مارتا ہے گہ سنگ پھینکتا ہے وہ شوخ ہم پر، اور ہم مثلِ ہدف کھڑے ہیں
جاؤ گے اب کدھر سے پیارے، کہ ہولی والے رستے میں راہ روکے با نا و دَف [2] کھڑے ہیں
چشمِ گہر فشاں کا گر پوچھے مول کوئی تو ہاتھ میں لیے ہی ہم یہ صدف کھڑے ہیں
پھر دیر کیا ہے قاتل تلوار کھینچ کر آ میدانِ عاشقی میں ہم سر بہ کف کھڑے ہیں
فاقے کی مار یارو تنہا نہ ہے انھیں پر گھوڑے بھی اکثروں کے یاں بے علف [3] کھڑے ہیں
وہ مصحفی کو بوسہ دیتا نہیں ہے اور یہ
آزار [4] سے اڑے ہیں، مثلِ اَلف [5] کھڑے ہیں

1- اس کے کنے = اُس کے پاس (عوامی) 2- نای (بانسری) دَف (چنگیرن) 3- علف = چارہ
4- آزار سے = بیماری کی طرح 5- الف (بہ فتح دوم) بجاے الف۔ ضرورت قافیہ

298

نرگسِ باغ اگر دیکھے وہ مخمور آنکھیں
شرم سے اپنی کرے خاک میں مستور آنکھیں

کوئی دم چاہے تو سو رہ نہ مرے مست شراب
کیونکہ اس وقت نشے میں ہیں تری چور آنکھیں

جالی برقعے[1] میں رکھی آنکھوں کے آگے کہ مجھے
تھیں دکھانی اُسے اِس پردے میں منظور آنکھیں

گلِ نرگس کی جگہ تربتِ یوسف پہ رکھیں
کاڑھ کر اپنی زلیخا نے بہ ساطور[2] آنکھیں

آہ کس مُنھ سے میں دیکھوں کہ یہاں موسیٰ کی
دید میں حسنِ تجلی کی ہیں رنجور آنکھیں

ضعف کا اس کے یہ عالم ہے کہ اب دو دو پہر
بند رکھتا ہے ترا عاشقِ معذور آنکھیں

بہہ گئے گریے کی شدت سے یہ تل آنکھوں کے
کہ نظر آنے لگیں صورتِ ناسور آنکھیں

منتظر تھا ترے آنے کا جو بیمار ترا
تھیں لحد میں بھی کھلیں اُس کی بدستور آنکھیں

کشتۂ حسرتِ دیدار کا سنگِ تربت
کیوں نہ پیدا کرے جوں خانۂ زنبور آنکھیں

کیونکے اُنکو ترے تلووں سے ملوں میں شبِ وصل
کہ مری اتنا بھی رکھتی نہیں مقدور آنکھیں

آہ جس خاک سے اُگتے ہیں یہ بادام کے نخل
شاید اس خاک میں خوباں کی ہیں مستور آنکھیں

تو پرستاری[3] میں گر اپنی کرے اُس کو قبول
لے کے بوسہ ترے تلووں سے ملے حور آنکھیں

سامنے اس کے اگر خاک میں ہم مل جاویں
تو بھی سیدھی نہ کرے وہ بتِ مغرور آنکھیں

رات پروانہ بھٹکتا تھا بہ پیشِ رخِ شمع
یاالٰہی نہ ہوں دشمن کی بھی شب کور[4] آنکھیں

خوابِ آرام سے پھر حشر کے دن ہی وہ اُٹھا
لگ گئیں جس کی تہِ سایۂ انگور آنکھیں

مصحفی پاتی ہیں کب اس کی نگہ کا انداز
گرچہ لیلیٰ کی ملاحت میں ہیں مشہور آنکھیں

299

بھری آتی ہیں ہر گھڑی آنکھیں
گویا ساون کی ہیں جھڑی آنکھیں

1- برقعے (بروزنِ مُرغے) بدونِ عین نظم کیا ہے 2- ساطور = دشنہ 3- پرستاری = بندگی
4- شب کور = رتوندے والی جسے رات کو نظر نہیں آتا۔

نرگس آٹھ آٹھ آنسو روتی ہے یاد کر وہ بڑی بڑی آنکھیں
شرر افشانیِ سرشک سے رات تھیں مری جیسے پھلجھڑی آنکھیں
جوں قلم رو رہی ہیں اشکِ سیاہ دیکھ اُس مسّی کی دھڑی آنکھیں
مصحفی دیکھ بد بلا ہے وہ شوخ
نہ ملا اُس سے ہر گھڑی آنکھیں

300

ہیں تری سحرِ سامری آنکھیں نہ کریں کیونکے کافری آنکھیں
اک طرف حور، یاں پری کی نہیں یہ پری پلکیں، یہ پری آنکھیں
آرسی میں طلا کی کرتی ہیں عکس سے جنگِ زرگری[1] آنکھیں
تیری بالیں پہ، اے دلِ بیمار کون ہے کھول تو زری آنکھیں
کل تر و خشک سے ڈبایا تھا آج رکھتی نہیں تَری آنکھیں
زہر کھاتے ہیں ان پہ کیا کیا لوگ ہیں جو کیری[2] وہ بس بھری[3] آنکھیں
مصحفی کتنی زیب دیتی ہیں
گورے چہرے پہ سانوری[4] آنکھیں

301

چہرے کی تیرے دیکھ کے پیارے صفائیاں اُڑتی تھیں ماہتاب کے منھ پر ہوائیاں
جس دن کہ میں نے یار سے آنکھیں لڑائیاں کیا کیا خرابیاں کہ نہ درپیش آئیاں
کنعاں سے لایا مصر میں یوسف کو کھینچ کر تم دیکھتے ہو عشق کی زور آزمائیاں
زیور نہ پہنا کر مرے پیارے، نہ جائیں مڑ پہنچی[5] کے بوجھ سے تری نازک کلائیاں
عاشق دریدہ[6] دیدہ نہ اتنا بھی چاہیے رسوا کریں ہیں مجھ کو مری بے حیائیاں

1- جنگِ زرگری = مصنوعی جنگ 2- کیری آنکھ = جس میں سیاہی کی جگہ سبز رنگ ہوتا ہے
3- بس بھری = زہر سے بھری ہوئی 4- سانوری = سیاہ 5- پہنچی = ہاتھ میں پہننے کا زیور، کنگن
6- دریدہ دیدہ = بے حیا، بے شرم

شب یار تک پہنچ کے نہ پہنچا مراد کو کیا اپنے طالعوں کی کہوں نارسائیاں
بے وارثی تو دیکھ، کہ اب تک کسو نے ہائے اس کُو سے کشتگاں کی نہ لاشیں اُٹھائیاں
کوئی دوچار ان کے نہ ہووے خدا کرے آفت ہیں دلبروں کی غرض خوش ادائیاں
پیارے، خدا کے واسطے اب تو وفا تو کر حد سے زیادہ ہو چکی ہیں بے وفائیاں
ہم ایک آشنا تھے تمھارے سو ہو چکے اب جس سے چاہو اس سے کرو آشنائیاں
لاشوں کے تودے پڑ گئے رستے میں مصحفی
اک جھانولی[1] سی اس نے جو پلکیں ہلائیاں

302

ہم دل کو لیے بر سرِ بازار کھڑے ہیں حیرانِ تمنائے خریدار کھڑے ہیں
غیروں سے وہ خلوت میں ہے مشغولِ ظرافت ہم رشک کے مارے پسِ دیوار کھڑے ہیں
اُن شرم زدوں کو بھی بُلا سامنے اپنے جو شرم کے مارے پسِ دیوار کھڑے ہیں
از بہرِ خدا بام پر آ، اے بتِ کافر کوچے میں ترے طالبِ دیدار کھڑے ہیں
ڈھب پاؤں تو میں اس سے کہوں حالِ دل اپنا اُس بت کو تو گھیرے ہوئے اغیار کھڑے ہیں
ہے اُس کی سواری کی خبر سیرِ چمن کو اور اہلِ تماشا سرِ بازار کھڑے ہیں
جوں نقشِ قدم بیٹھنے کی جا نہیں ملتی اُس کوچے میں ہم اس لیے ناچار کھڑے ہیں
کوچہ ہے ترا وعدہ گہِ خلق کہ جس میں دو چار جو بیٹھے ہیں تو دو چار کھڑے ہیں
ہو عزمِ سفر تجھ کو تو اے مصحفی اب بھی
چلنے کے لیے قافلے تیار کھڑے ہیں

303

نہ سمجھو تم کہ میں دیوانہ ویرانے میں رہتا ہوں خیالِ روئے خوباں سے پری خانے میں رہتا ہوں
تماشا گاہِ عالم کا تماشا مجھ سے مت پوچھو کہ جوں آئینہ میں حیرت کے کاشانے میں رہتا ہوں

1- جھانولی = جھالر، چلمن کی ایک قسم

خُمِ جوشانِ عشقِ بے محابا ہوں میں، تب ہی تو
نہ شیشے میں ٹھہرتا ہوں نہ پیمانے میں رہتا ہوں

شریفِ کعبہ نت مجھ کو سلامِ شوق بھیجے ہے
میں کافر گرچہ ہندستاں کے بت خانے میں رہتا ہوں

مجھے اے مصحفی ہے کام ہر دم ذکرِ خوباں سے
اِسی خاطر تو میں مشغول افسانے میں رہتا ہوں

304

دم غنیمت ہے کہ وقتِ خوش دلی ملتا نہیں
یہ سماں، یہ چین دنیا میں کبھی ملتا نہیں

دیکھیو نفرت کہ میرا نام گر لیوے کوئی
روبرو اُس کے، تو پھر وہ اُس سے بھی ملتا نہیں

کیا کروں ناسازیِ طالع کا میں شکوہ کہ آہ
جس کو جی چاہے ہے میرا اُس کا جی ملتا نہیں

کھو کے مجھ کو ہاتھ سے، سنتے ہو پچھتاؤ گے تم
مانو کہنا بھی کہ مجھ سا آدمی ملتا نہیں

کس طرف جاتا رہا کیا جانے وہ وحشی مزاج
ڈھونڈتے پھرتے ہیں ہم اور مصحفی ملتا نہیں

305

ہر مژہ میں وہیں موتی سے پرو دیتا ہوں
کچھ تو یاد آئے ہے مجھ کو جو میں رو دیتا ہوں

گر زمانے کی عداوت ہے یہی مجھ سے تو میں
ابھی رو رو کے جہاز اس کا ڈبو دیتا ہوں

دلِ غم دیدہ جو ہوتا ہے نظر سے غایب
اس کے گم ہوتے ہی میں جان کو کھو دیتا ہوں

کشتۂ رنگِ حنا کی ترے تربت پہ، میاں
اب کی برسات میں گل مہندی ہی بو دیتا ہوں

مصحفی سائلِ دشنام ہے کب کا تم سے
گو نہ دو اس کو دلے یہ تو کہو "دیتا ہوں"

306

تجھ بن تو کبھی گل کے تئیں بُو نہ کروں میں
مرجاؤں پہ گلشن کی طرف رُو نہ کروں

گر جعد کو سنبل کی، صبا بیچنے لاوے
خاطر سے تری قیمتِ یک مو نہ کروں

پلّے میں ترے حسن کے گو ہو وہ گراں تر
یوسف کو ترا سنگِ ترازو نہ کروں میں

یوں دل کو گرفتار رکھوں صیدِ الم میں
پر اور کا صیدِ خمِ گیسو نہ کروں میں

گر حور و پری دل کو لبھاوے مرے آ کر
واللہ کہ اُس پر کبھی جادو نہ کروں میں

گر مرثیہ خوانی پہ دل آوے کبھی میرا
تُو ہووے تو داؤد[1] کو بازو نہ کروں میں

ہوں بسکہ ہوادار تری آتشِ غم کا
پھنک جائے جو سینہ تو کبھو ہو نہ کروں میں

یوں دیکھوں تو دیکھوں کسی خوش وضع کو لیکن
خواہش کی نظر بر رخِ نیکو نہ کروں میں

بلبل کی طرح گل پہ نہ ہوں زمزمہ پرواز
قمری کی طرح سرو پہ کوکو نہ کروں میں

جب رات ہو، زانو پہ رکھوں اپنے سر اپنا
پر تکیۂ سر غیر کا زانو نہ کروں میں

محراب کے کعبے کا نمازی ہوں تو واں بھی
جز سجدۂ طاقِ خمِ ابرو نہ کروں میں

جب تک نہ کھلیں مجھ سے ترے حسن کے عقدے
ہرگز ہوسِ نافۂ آہو نہ کروں میں

ہم خوابہ اگر ہووے مری حورِ بہشتی
ایدھر سے اُدھر کو کبھی پہلو نہ کروں میں

کوئی اور تو کب مجھ کو لبھا سکتا ہے لیکن
ڈرتا ہوں، تصور سے ترے خو نہ کروں میں

اے مصحفی ہے عہد کہ جب تک نہ وہ گل ہو
گلگشتِ گل و سیرِ لب جو نہ کروں میں

307

مانا میں، ساتھ اشک کے لختِ جگر نہ ہوں
پر کیا وہ گریہ جس میں کہ مژگاں بھی تر نہ ہوں

نیچے نہ دیکھ میں ترے صدقے، مجھے ہے ڈر
افتادگانِ خاک کی آنکھیں اِدھر نہ ہوں

آشفتگی دماغ میں عاشق کے رہ نہ پائے
گر سر کے بال زینتِ دوش و کمر نہ ہوں

مرغانِ سدرہ تک ہیں تری خو سے سہم ناک[2]
خط دیجیے تو وہ بھی مرے نامہ بر نہ ہوں

صبحِ وصال شوق سے ہووے ہے جلوہ گر
نالے شبِ فراق کے گر بے اثر نہ ہوں

مجنوں نہ کیونکے ہاتھ سے ہو اُن کا شانہ کش
لیلیٰ کے بال ہیں یہ ترے موے سر نہ ہوں

1- داؤد پیغمبر جن کا لحن مشہور ہے۔ 2- سہم ناک = سہمے ہوئے، ڈرے ہوئے

بگڑے اگر وہ ہم سے، تو سمجھائے شانِ حسن ایسے پہ آپ دست بہ تیغ و سپر نہ ہوں
تسکیں نہ ایک شکل سے ہو اپنی، جب تلک دو چار خوب رو مرے پیشِ نظر نہ ہوں
دیکھیں تو چل کے راہ نوردانِ عشق کو وہ لوگ ہم سے یک دو قدم پیشتر نہ ہوں
پاویں نہ بوے زلف تو سودائیانِ عشق دنبالِ گردِ موجِ نسیمِ سحر نہ ہوں
سینہ سپر نہ کیجیو تو ان کا مصحفی
مژگاں کے تیر ہیں یہ سبھی کارگر نہ ہوں

308

عاشق کہیں ہیں جن کو وہ بے ننگ لوگ ہیں معشوق جن کا نام ہے وہ سنگ لوگ ہیں
کس طرح کسبیوں سے رکھے کوئی جی بچا سب جانتے ہیں اُن کو یہ سرہنگ[1] لوگ ہیں
مجنوں تو جا کے دشت میں فریاد کر کہ آئے نالے سے تیرے شہر کے دل تنگ لوگ ہیں
عالم کو صوفیوں کے کوئی کیا سمجھ سکے ہر رنگ سے جدا ہیں یہ بے رنگ لوگ ہیں
ہم تو نہ لعلِ لب کا ترے بوسہ لے سکے رکھتے ہیں یہ خیال، جو بے ڈھنگ لوگ ہیں
اُترا ہے کون آب میں یہ جس کے حسن سے حیراں کھڑے ہوئے بہ لب گنگ لوگ ہیں
میرے لغاتِ شعر کے عالم کو مصحفی
سمجھیں ہیں وہ جو صاحبِ فرہنگ لوگ ہیں

309

ہے دلِ وحشی مرا اُس زلف کی تسخیر میں اپنے دیوانے کو رکھتی ہے پری زنجیر میں
ہوں جہاں لاکھوں کماندارانِ ابرو تیر زن کیو نکے جانبر ہو وہاں اک صید سو تکبیر میں
خاک میں رُلتے ہوئے اک کاسۂ سر نے کہا ''آگے آگے دیکھیے کیا ہے مری تقدیر میں''
صید جو آتا ہے رکھ دیتا ہے بس اُس پر گلا کچھ تو لذّت ہے ترے آبِ دمِ شمشیر میں

1- سرہنگ = فوجی، لوٹنے والے

دل سے وہ آہن دلوں کے، صاف جاتا ہے گزر　　کیا قیامت توڑ[1] ہے مژگاں کے تیرے تیر میں
دیکھ اُس کو منہ لیا اُس نے پھرا نقاش سے　　بھر دیا تھا رنگِ بے صبری مری تصویر میں
کھینچ لیتی ہے شبِ مہ یوں دلِ عاشق کا زہر　　زہر مُہرہ[2] صاف ہو جاتا ہے جیسے شیر میں
رہ گیا تھا لگ کے جب سینے میں اُس کے اُس کا تیر　　حسرتیں کیا کیا تڑپتی تھیں دلِ نخچیر میں

مجھ کو ملک و مال سے کیا کام ہے اے مصحفی
بوریائے فقر آیا ہے مری جاگیر میں

310

ہر دم آتے ہیں بھرے دیدۂ گریاں تجھ بن　　مجھ کو یہ ڈر ہے کہ لاویں نہ یہ طوفاں تجھ بن
لالہ و گل کی طرف کس کی بلا دیکھے ہے　　جی کو بھاتی ہی نہیں سیرِ گلستاں تجھ بن
آ گیا بسکہ خلل مذہب و ملت میں مری　　نہ رہا گبر میں پیارے نہ مسلماں تجھ بن
دل گیا، دین گیا، صبر گیا، تاب گئی　　یوں ہی اپنے تو ہوئے سیکڑوں نقصاں تجھ بن
نہ کھلے غنچۂ تصویر کے مانند کبھو　　لبِ خاموش مرے، اے گلِ خنداں تجھ بن
جب سے اے گل تو گیا، بسترِ عاشق پہ ترے　　گلِ بالیں نہ ہوئے سنبل و ریحاں تجھ بن
سامنے سے مری آنکھوں کے نہ جا، مان کہا　　کس کو دیکھوں گا میں پھر اے مہِ تاباں تجھ بن
روز دشمن کا بھی اس طرح نہ کٹیو یا رب　ق　میں نے جس ظلم سے کاٹی شبِ ہجراں تجھ بن
مہِ نو شام کے ہوتے ہی، تصوّر میں ترے　　تھا کھڑا سر پہ لیے خنجرِ عریاں تجھ بن
اور جو جاتی تھی کبھی خوشۂ پرویں پہ نگاہ　　وہ بھی لگتا تھا صنم دستۂ پیکاں[3] تجھ بن

مصحفی جا کے گلستاں میں کرے کیا پیارے
کہ گلستاں ہے اُسے خانۂ زنداں تجھ بن

1- توڑ = یُرماتے ہوئے گھسنے کا زور (perforation)
2- زہر مُہرہ = ایک یونانی دوا (Bezoar Stone)
3- دستۂ پیکاں = تیر اندازی کا دستہ

311

وے جو غرفے سے سر نکالتے ہیں منھ پھرانے میں مار ڈالتے ہیں
میری تربت سے گزریں ہیں خوباں اور دامن نہیں سنبھالتے ہیں
کس سے سامانِ جنگ ہے یارب اشک جو گولیاں سی ڈھالتے ہیں
ناتواں ہوں، ولے مرے نالے دل میں آہن دلوں کے سالتے[1] ہیں
اب تو میاں مصحفی کی ہے یہ معاش
پتے بیٹھے ہوئے اُبالتے ہیں

312

رہے ہم اس شفا دانی پہ رنجوری کے عالم میں سہے کیا کیا نہ ہم نے رنج، مجبوری کے عالم میں
خدا جانے وہ کس ساعد کا چربہ کھینچ لائی تھی کہ تھے نقاش حیراں شمعِ کافوری کے عالم میں
بیاضِ چشم پر خالِ سیہ، اُٹھ خواب سے رکھا نکالا زور عالم اُس نے مخموری کے عالم میں
الٰہی کس طرح گزرے گی میری، سخت حیراں ہوں کہ میں پُر مضطرب اور وہ ہے مغروری کے عالم میں
ہمیں بھی روے خوش سے جن دنوں اک لاگ تھی گاہے مزے لوٹیں تھے کیا کیا ہم بھی مہجوری کے عالم میں
ہماری لاغری جاے تعجب بھی نہیں یارو یہی احوال ہو جاتا ہے مجبوری کے عالم میں
ہماری زندگی چاہے ہے تو مت دور رہ ہم سے خدا جانے کہ کیا گزرے تری دوری کے عالم میں
قیامت مصحفی کو جذب سا رہتا ہے ان روزوں
کہیں یہ آ نہ جاوے شانِ منصوری کے عالم میں

313

آ رہتی ہیں ہزاروں تصویرِ خوب رویاں گویا ہے پاس اپنے تسخیرِ خوب رویاں
دتی کہاں، کہاں وے راتیں محرّموں کی آتے ہیں یاد مجھ کو شب گیرِ[2] خوب رویاں

1- سالنا = سوراخ کرنا 2- شب گیر = رات میں آہ و زاری

ان کے پکڑنے ہی پر مرتے رہے ہزاروں　چلتی کبھی نہ دیکھی شمشیرِ خوب رویاں
زیور میں بھی اُنھوں کے گر کافری نہ ہووے　کہلائے کیوں جنیؤ زنجیرِ خوب رویاں
شادی کی ہے یہ مجلس یا کاغذِ مرقع　ہیں جس میں سو طرح کی تصویرِ خوب رویاں
تیرِ نگہ سے مارا جس کو اُسے چھپایا　تڑپا نہ خاک و خوں میں نخچیرِ خوب رویاں
گر جرم بے نقابی اُن سے عمل میں آوے　زندانِ تنگ بس ہے تعزیرِ خوب رویاں
کیا کیا نہ خوں اُنھوں نے کر کے چھپا دیے ہیں　تقدیر پر ہے غالب تدبیرِ خوب رویاں
کشتے پہ تیرے جس جا تلواریں چل رہی تھیں　کیا کیا بلند تھی واں تکبیرِ خوب رویاں
سیب و انار پر ہو گو کوئی ان کے مائل　بھاتے ہیں لیک مجھ کو انجیرِ خوب رویاں
ہیں رینڈیاں جمالی پستاں اُنھوں کے تب تو　طینت میں گرم تر ہیں تاثیرِ خوب رویاں
کیا کیا نہ وجد کرتے، دیتا پنہا جو کوئی　پانوؤں میں عاشقوں کے زنجیرِ خوب رویاں
تصویر پر میں اس کی وہ حاشیہ بناؤں　جس حاشیے میں ہووے تحریرِ خوب رویاں

ہم شعر کیا پڑھیں واں اے مصحفی جہاں ہو
مُعجز طرازِ عیسیٰ تقریرِ خوب رویاں

314

یک نالۂ عاشقانہ ہے یاں　یک زخمہ بصد ترانہ ہے یاں
مذکور رہے ہے درد و غم کا　دن رات یہی فسانہ ہے یاں
پھینکے ہے وہ تیرِ غمزہ مجھ پر　سمجھے ہے کہ دل نشانہ ہے یاں
گر اپنی بدی کے سر کو کاٹے　بیگانہ بھی پُر یگانہ [1] ہے یاں
یک جنبشِ شوق دل کو بس ہے　کیا حاجتِ تازیانہ ہے یاں
جو آئے ہے جھک کے جائے ہے وہ　گویا کہ شراب خانہ ہے یاں
ویران ہوئے چمن سے نکلے　ہم سمجھتے تھے آشیانہ ہے یاں

1- بیگانہ میں بدی کا سر حرف ب ہے، اُسے دور کر دیں تو وہ بھی یگانہ ہو جاتا ہے۔

آنکھیں جو بھری ہی آتیاں ہیں   پانی کا مگر خزانہ ہے یاں
دیواں کی مرے تو سیر تو کر   ق اے مصحفی اک زمانہ ہے یاں
بلبل ہے، چمن ہے، سرو و گل ہے
ساقی ہے، مئے مُغانہ ہے یاں

315

سب چاہتے ہیں یہ کہ کچھ آثار یاں رہیں   زنداں سے چھوٹ کر بھی گرفتار یاں رہیں
اہلِ دُوَل کو شوقِ عمارت ہے اس لیے   بعد از فنا مگر در و دیوار یاں رہیں
دارالشفائے عشق میں لے جا کے ہم کو عشق   بولا کہ چند روز یہ بیمار یاں رہیں
دیتا ہے ہر نگاہ میں تو جامِ بیہشی   پھر اس پہ چاہتا ہے کہ ہشیار یاں رہیں
شرکِ دوئی اُٹھا بھی کہیں آہ کب تلک   تارِ نفس کے بستۂ زنّار یاں رہیں
خالی قفس کو چھوڑ نہ جاویں سبھی اسیر   دو چار جاویں باغ کو، دو چار یاں رہیں
یا رب جمالِ نورِ تجلّی دکھا ہمیں   کب تک بتوں کے والۂ دیدار یاں رہیں
کنعاں سے جا کے مصر میں یوسف بکے تو پھر   کیونکر نہ ہاتھ ملتے خریدار یاں رہیں
مہماں سرائے ہے چمنِ دہر مصحفی
شب سے زیادہ کیونکے گل و خار یاں رہیں

316

کیونکر کہوں میں مجھ کو تری آرزو نہیں   سمجھے کسی کے دل کا قلق سو وہ تو نہیں
جرّاح کیا کرے کہ تری تیغِ ناز کے   یاں تک لگے ہیں زخم کہ جائے رفو نہیں
دیکھیں ہیں دستِ بخششِ پیرِ مغاں کو ہم   جوں ساغر اپنی چشم بہ دستِ سبو نہیں
شبنم نے یہ نچوڑ لیا ہے کہ کیا کہوں   چہرے پہ گل کے آج ذرا رنگ و بو نہیں
یا رب شفا دے اُن کو کہ کہتا ہے یوں وہ شوخ   گل خوردہ [1] ہاتھ قابلِ طوقِ گلو نہیں

1- گل خوردہ = جھلنے سے داغے ہوئے

سودا جو زلف کا ہے سو ہے زلف ہی کے ساتھ　قیمت میں زلف کی کمر اُس کی کا مو نہیں
اتنا میں گم ہوا ہوں کہ اب آئینے کے بیچ　حیرت سے عکس میرا مرے روبرو نہیں
بعد از فنا بھی مہر کی اُن کو تلاش ہے　یک ذرّہ میری خاک کا بے جستجو نہیں
منھ پر چڑھے ہے نت صفِ مژگاں کے مصحفی
سوجھے ہے مجھ کو یار کہ اک روز تو نہیں

317

سینہ ہے پرزے پرزے جاے رفو نہیں یاں　ٹانکے لگا دیں کس کو دل کی تو بو نہیں یاں
ساقی ہے، سرو وگل ہے، مطرب ہے اور ترانہ　افسوس اک یہی ہے، ایسے میں تو نہیں یاں
ہر چند تو ہمیشہ پیشِ نظر ہے، اس پر　چھٹ تیری جستجو کے کچھ جستجو نہیں یاں
مجلس سے اپنی گل کو بھجوا دے پھر چمن میں　کس واسطے کہ اس کا وہ رنگ و بو نہیں یاں
حیران ہوں کہ کہیے کس سے سراغِ عشرت　ماتم کدہ ہے عالم جز ہاے و ہو نہیں یاں
جو آرزو دلوں میں مضمر ہے صاحبوں کے　ہے آرزو تو لیکن وہ آرزو نہیں یاں
آئے تھے ہم چمن میں سن کر تری خبر کو　پھر کیا کریں گے رہ کر ظالم جو تو نہیں یاں
اہلِ سخن کا یا رب کیوں محتسب ہے دشمن؟　کلک و دوات ہے کچھ جام و سُبو نہیں یاں
قربانیانِ الفت سب سر کٹے پڑے ہیں　شمشیر کے حوالے کس کا گلو نہیں یاں
مجلس میں تیری ٹھہرے کیا مصحفی کہ ناداں
غیر از اَبے تبے[1] تو کچھ گفتگو نہیں یاں

318

جو ملے دل سے ہیں کب تجھ سے جدا ہوتے ہیں　دامِ الفت کے گرفتار رہا ہوتے ہیں
عکس سے اپنے اگر راہ نہیں تم کو تو جاں　یہ اشارے سے، پھر آئینے میں کیا ہوتے ہیں؟
طرفہ عالم ہے ہمارا بھی کہ ہر دم اس سے　آپھی ہم منتے ہیں اور آپھی خفا ہوتے ہیں[2]

1- اَبے تبے = بے ادبانہ گفتگو

2- قائم چاندپوری : ظالم تو میری سادہ دلی پر تو رحم کر　روٹھا تھا تجھ سے آپ ہی اور آپ ہی مَن گیا

بزمِ شوریدہ سراں کم نہیں از بزمِ سماع
جس میں نت پیرہن و خرقہ قبا ہوتے ہیں

اے اسیرانِ قفس، تم سے بھی اب رخصت ہے
آج صیاد سے ہم اپنے جدا ہوتے ہیں

نہ پھنسے کیونکے کوئی دام میں ان کے یا رب؟
بال بکھرے ہوئے خوباں کے بلا ہوتے ہیں

کشتہ ہوں دستِ نگاریں کا میں کس کے جو ہنوز
میری تربت سے علم نخلِ حنا ہوتے ہیں

کہہ دو قاتل سے کہ تا کھینچ کے شمشیر آوے
آج ہم حقِ محبت سے ادا ہوتے ہیں

ہم ہی بدنام ہیں اک، اُن کی خبر تجھ کو نہیں
تجھ پہ جو لوگ نگاہوں میں فدا ہوتے ہیں

چین سے آئے ہے اُس شب ہی مجھے نیند ذرا
جس شب آنکھوں پہ مری وہ کفِ پا ہوتے ہیں

مصحفی چاہیے کیا باد[1] کا طوفان کہ ہم
خسِ لاغر کی طرح دم میں ہوا ہوتے ہیں

319

ملنے کے بیچ وعدہ و اقرار کچھ نہیں
سمجھے مزاجِ یار تو تکرار کچھ نہیں

وقتِ خرامِ ناز ترے، نقشِ پا ترا
کہتا ہے کبک سے تری رفتار کچھ نہیں

مرغِ چمن کو کیوں مری اوقات پر ہے رشک
کنجِ قفس میں تو گل و گلزار کچھ نہیں

ہر دم کراہنے سے مجھے کر نہ تو خفا
تیری یہ وضع اے دلِ بیمار کچھ نہیں

مل جائیے گر آپ کو ملنا ہے آج کل
جاں بر لبوں سے وعدۂ دیدار کچھ نہیں

ساقی کی بددہی[2] سے ذرا دل ہے پُر کدر
دُردِ شراب سے تو مجھے عار کچھ نہیں

آتا ہے مے کدے سے صریحاً تو مے پیے
آنکھیں چڑھی ہوئی ہیں یہ انکار کچھ نہیں

رہتی ہے اک خلش سی مرے دل میں رات دن
ظاہر میں دیکھتا ہوں تو آزار کچھ نہیں

کنجِ قفس میں زمزمۂ باغ سر نہ کر
یہ بات تیری مرغِ گرفتار کچھ نہیں

اُٹھ اُٹھ کے دیکھتا ہوں شبِ ہجر میں، دریغ
اب تک طلوعِ صبح کا آثار کچھ نہیں

بلبل تو بے نصیب رہی رنگِ گل سے ہائے
جز برگِ سادہ قسمتِ منقار کچھ نہیں

آٹھوں پہر ہر ایک کی جو گالیاں سنوں
ایسا تو میں کسی کا گنہگار کچھ نہیں

1- باد = ہوا 2- بددہی = بُری طرح دینا، حقارت سے دینا

کیوں جاوے دَیر سے طرف کعبہ مصحفی
یہ شخص بت پرست ہے زوّار[1] کچھ نہیں

320

کوچے سے اُس کے جب کبھی اُٹھ کر چلا ہوں میں
ہر ہر قدم پہ ضعف سے گر گر پڑا ہوں میں

رکھتا ہے اپنے ہاتھ وہ اکثر حنا رَچے
جانے ہے یہ کہ کشتۂ رنگِ حنا ہوں میں

میں کہہ کے ''آشنا'' جو پکاروں تو یوں کہے
پہچانتا ہے، کس کا ابے آشنا ہوں میں؟

کیا جانے کس سے وہ گُلِ رعنا ہے ہم کنار؟
جو ساری رات کانٹوں میں لوٹا کیا ہوں میں

فصلِ بہار ہو بھی چکی اور قفس کے بیچ
اب تک امیدوارِ نسیم و صبا ہوں میں

سو بار کر چکا وہ مجھے منع مصحفی
جاتا ہوں دوڑ دوڑ، عجب بے حیا ہوں میں

321

جی چاہتا ہے جس کو وہ آگاہ ہی نہیں
مجلس تک اُس کی، اپنے تئیں راہ ہی نہیں

خوب آزما کے دیکھ لیا ہم نے تم کو جاں
اِس چاہ پر ہماری تمھیں چاہ ہی نہیں

کس پر نظر کریں کہ تقدس کا نور ہے
چل گھر کو دیدباں تو نظرگاہ ہی نہیں

کوتہ کیا میں دستِ طلب کو تو کیا ہوا
دستِ درازِ حرص تو کوتاہ ہی نہیں

کھینچے ہے ماہ رو کو ترے جب شبیہ کش[2]
کہتے ہیں اہلِ ہوش یہ وہ ماہ ہی نہیں

ہیں اشکِ متصل سے بھی ہونٹوں پر آبلے
ہر دم کی دُکھ دہند[3] کچھ اک آہ ہی نہیں

کیا جانے مصحفی کو کئی دن سے کیا ہوا
وہ شورِ شب وہ بانگِ سحرگاہ ہی نہیں

1- زوّار =زیارت کرنے والا 2- شبیہ کش = مصوّر 3- دُکھ دینے والی

322

یا وہ غارت گرِ جاں آئے کہیں	یا مرا دم ہی نکل جائے کہیں
جس کی دوری سے ہے یہ حال مرا	کاش صورت مجھے دکھلائے کہیں
وہ پری گرچہ بلا ہے، مرے گھر	چرخ پھر ایسی بلا لائے کہیں
جستجو اُس کی مجھے، ڈرتا ہوں	کوچہ در کوچہ نہ دوڑائے کہیں
مجلسِ عشق کا عالم ہے کچھ اور	ہے جہاں ہائے کہیں، وائے کہیں
مجھ کو ہے اک بتِ نادان کی چاہ	ق	چاہ کا وہ بھی مزہ پائے کہیں

مصحفی جیسے دل آیا ہے مرا
اُس کا دل بھی ادھر آجائے کہیں

323

ڈھنگ سارے اُس میں محبوبی کے ہیں	سر سے پا تک سب چلن خوبی کے ہیں
دیکھ اسے بر جا رہیں کیونکر حواس؟	طور اُس میں عالم آشوبی کے ہیں
ہم سے لے جاتے ہیں لکھوا حسبِ حال	وے جو جویا شعرِ مکتوبی کے ہیں
وہ جو واقف ہیں ہمارے حال سے	معتقد کب صبرِ ایوّبی کے ہیں

مصحفی، تو طرفہ از خود رفتہ ہے
ہم تو بندے تیری مجذوبی کے ہیں

324

بن بن نہ پھرے سبزۂ صحرا کے دنوں میں	سودا نہ کیا ہم نے تو سودا کے دنوں میں
کیا سیرِ چمن کرتے کہ دل تنگی نے اپنی	رکھا ہمیں زنداں میں، تماشا کے دنوں میں
کام اس بتِ کافر سے بھلا کیونکے نکلتا	لب پر تو خموشی تھی تمنا کے دنوں میں
مکھڑے پہ ترے چھٹ کے تری زلفِ چلیپا	لائی ہے خلل عاشقِ شیدا کے دنوں میں

اے مصحفی ہے یہ وہ غزل جلدِ سُوم کی
تھی زلف تری طرّۂ لیلیٰ کے دنوں میں

325

اپنے پہلو میں نہ دیکھا ہم نے خنجر ایک دن
آرزوئے دل نہ نکلی دل سے باہر ایک دن

اس کا وہ آنکھیں ملانا بھولتا اب تک نہیں
چاکِ در سے یار نے جھانکا تھا چھپ کر ایک دن

لاکھ تم عاشق سے بھاگو، وصل کہتے ہیں جسے
آخرش ہوتا ہے وہ بھی بندہ پرور ایک دن

اپنے بالوں[1] پر بٹھا کر یار کو میرے لے آ
میرا قصہ ہی چکا دے، اے کبوتر ایک دن

خونِ دل کب تک پیوں، اے ساقیِ بزمِ خیال
وصل کا مجھ کو پلا دے تو ہی ساغر ایک دن

منتظر رہتا ہوں تیرا دامن افشاں ہو کبھو
خاک پر میری بھی اے سروِ صنوبر ایک دن

اس کو اے صیاد تو کنجِ قفس سے مت نکال
جان دیوے گا یہیں یہ مرغِ بے پر ایک دن

آہ کیا حسن و صفا اس کی ثنایا[2] کا کہوں
تو کہے پیدا ہوئے ہیں یہ دو اختر ایک دن

طالعِ خسرو میں لکھا تھا کہ ''اے غافل زکار
خوں میں ڈوبے گا ترا بالین و بستر ایک دن''

روز وہ رشکِ پری کرتا ہے اب اپنا بناؤ
آفت آوے گی کسی پر یاں مقرر ایک دن

کیوں جماتے ہو میاں ہونٹوں پہ مسّی کی دھڑی
زہر کھا کر کوئی مر جاوے گا تم پر ایک دن

مصحفی کی گر یہی حالت رہی اے دوستو
تو اُسی کوچے میں رہ جاوے گا مر کر ایک دن

326

مہندی سے پُر ہیں اک تو تری ساری انگلیاں
تس پر کریں ہیں اور بھی خونخواری انگلیاں

چھٹتا ہے دامن اُس کا اگر خوابِ وصل میں
کاٹوں ہوں اپنی اُٹھ کے بہ بیداری انگلیاں

اے ماہِ مصر، دیکھ کے تیرے جمال کو
خوباں قلم کریں ہیں بہ ناچاری انگلیاں

1- بال بمعنی پَر 2- ثنایا = دانت

مہندی جو چھلّے دار لگائی تو بن گئیں　　عاشق کے حق میں دامِ گرفتاری انگلیاں
کیا سہل سی طرح سے چھڑا کر چلے گئے　　آئیں جو ہاتھ اُن کی بہ دشواری انگلیاں
لینے لگا بلائیں میں خمیازہ لے کے صبح　　چٹخائیاں جو اُس نے بہ یکباری انگلیاں
فندق سے باندھتی ہیں کمر اپنی روز و شب　　کرتی ہیں کس کے قتل کی تیاری انگلیاں
لالے کا پھول دیکھ انھیں کیوں نہ داغ کھائے　　رنگِ حنا سے رکھتی ہیں گل کاری انگلیاں
دیکھے ہے آ کے جب وہ پری میری نبض کو　　ہوتی ہیں وو ہیں دافعِ بیماری انگلیاں
جانے لگا جو ہاتھ مرا جیب کی طرف　　دکھلائیں کس صنم نے بہ عیّاری انگلیاں
ہوتے ہیں غنچہ ہائے شقائق[1] بھی سر بہ جیب　　چلمن سے جب کریں ہیں نموداری انگلیاں

کر جائے دوسری بھی غزل مصحفی رقم
کچھ اور بھی کریں جو مددگاری انگلیاں

327

چھلّوں سے اُس کے کیوں نہ لگیں پیاری انگلیاں　　رکھتی ہیں سو طرح کی طرح داری انگلیاں
رکھ کر کے زخمِ دل پہ ہمارے چلی گئیں　　اُودی حنا سے مرہمِ زنگاری انگلیاں
اک دم حسین بند[2] کو کرتی نہیں جدا　　رکھتی ہیں کتنا ذوقِ گرفتاری انگلیاں
تھے حلقہ حلقہ لوگ کہ بازارِ حسن میں　　چھلّوں کی کر رہی تھیں خریداری انگلیاں
پنجے کا ہے نشاں مرے رخ پر کہ شوخ نے　　ماری تھیں زور سے گہِ بیزاری انگلیاں
ہو کافری نہ کیونکے ادا اُن سے، ہو گئیں　　فندق کے ڈورے باندھ کے زُنّاری انگلیاں
انکارِ قتلِ بے گنہاں، وا چھڑے صنم　　اب تک لہو میں تر ہیں تری ساری انگلیاں
وہ دل جلا ہوں میں کہ مری قبر پر ہنوز　　رکھتے ہیں اہلِ ہوش بہ ہشیاری انگلیاں
مہندی جو چاند تارے کی ہے پور پور پر　　رکھتی ہیں آسماں کی سی طیاری انگلیاں

1- شقائق = لالہ کے پھول اور کبھی مجازاً بمعنی مطلق پھولوں کے بھی آتا ہے۔　2- حُسین بند = لکھنؤ میں علیؓ بند اور حسینؓ بند کے نام سے ڈورے بازو اور ہاتھوں میں پہنے جاتے ہیں

فصلِ جنوں پھر آئی ہے شاید، جوان دنوں　کرتی ہیں جیب ہی کی طلب گاری انگلیاں

اُس سا کوئی نہیں ہے غضب، اُس کی مصحفی
پانسے کے فن میں رکھتی ہیں عیاری انگلیاں

328

نہ بوسے کی طمع، نے کچھ خیالِ خام رکھتے ہیں
فقط چاہت سے تیری ہم تو پیارے کام رکھتے ہیں

گرفتاری کا محبوبوں کی عالم ہائے کیا کہیے
رہیں ہیں آپ الگ، اور ہم کو زیرِ دام رکھتے ہیں

ہوئے ہیں اس قدر رسوا تری چاہت سے ہم، پیارے
کہ ہم کو اپنے بیگانے جو ہیں سب نام رکھتے ہیں

تمھیں تو دوش کیا دیجے، اُنھی کو آفریں کہیے
جو رکھ کر ہاتھ، دل پہلو میں اپنے تھام رکھتے ہیں

ترے ہی نام کی رٹ لگ گئی ہے ہم کو ان روزوں
یہی ورد اپنا ہم اے دوست، صبح و شام رکھتے ہیں

نہ آتا ہے کوئی واں سے، نہ جاتا ہے کوئی یاں سے
عجب لیل و نہار اور زور صبح و شام رکھتے ہیں

ہمیں کیا راحت و آرام سے، یہ اُن سے کہہ ہمدم
جو الفت میں خیالِ راحت و آرام رکھتے ہیں

نہیں ملتے بتانِ بے مروت ہم سے اور اُلٹا
نہ ملنے کا ہمارے سر پہ نت الزام رکھتے ہیں

صفا سیمیں بتوں کے جسم کی میں کیا کہوں گویا
یہ کافر دودھ کے دھوئے ہوئے اندام رکھتے ہیں

نہیں دیدار بھی قسمت میں اپنی، وقت خوش اُن کا
جو اُس لب سے خیالِ بوسہ و دشنام رکھتے ہیں

نہ کھینچ اے ماہ، اتنا آپ کو تو دور، سنتا ہے
کہ ہم تجھ سے بھی اعلیٰ ایک ماہِ بام رکھتے ہیں

پیمبر اور امام اپنا تو روے خوش ہے، ہم کافر
اُسی کے کیش میں ہیں اور یہی اسلام رکھتے ہیں

تمھارے حسن کا عالم زمانے سے نرالا ہے
نہیں تو اور بھی یوں چہرۂ گلفام رکھتے ہیں

نہیں جمشید سے کم مصحفی کچھ مرتبہ اپنا
کہ ہم بھی روز و شب دل سا بغل میں جام رکھتے ہیں

329

جو جو ستم ہوئے ہیں مجھ پر میں جانتا ہوں — تجھ کو تو کیا خبر ہے دلبر، میں جانتا ہوں
دنیا میں مجھ سا ہوگا کم قدردان تیرا — پوچھ اپنی باتیں مجھ سے، کافر میں جانتا ہوں
جو جو نزاکتیں ہیں تیری ملایمت میں — حور و پری سے اُن کو بہتر میں جانتا ہوں
سب جانتے ہیں تجھ کو، شاہد تو ہے بلا شک — اُس سے بھی کچھ زیادہ اس پر میں جانتا ہوں
گھر جانے کا تم اپنے کرتے ہو ذکر ہر دم — اک دن کروگے مجھ کو بے گھر، میں جانتا ہوں
تو مجھ سے گو چھپاوے میری نظر میں سب ہے — واللہ تیری باتیں اکثر میں جانتا ہوں
وقتِ عتاب مجھ پر غصے سے جب پڑے ہے — نوکِ مژہ کو تیری نشتر میں جانتا ہوں

گر مصحفی یہی ہے رنگینیِ محبت
ڈوبے گا خوں میں اک دن دفتر میں جانتا ہوں

330

مہندی لگے میں دیکھے کس گل کے لال ناخن — جو دل پہ مارتے ہیں شکلِ ہلال ناخن

رکھواؤں نقش[1] پر میں اُنگلی گر اس صنم سے — رکھتا ہے ڈرتے ڈرتے ہنگامِ فال ناخن
کیا ماہِ نو کو نسبت ابرو سے اُس کی، توبہ — آنکھوں کے اپنی تو لے اے کج مثال ناخن[2]
جوں گل تمام سینہ مجروح کر گئے ہیں — مہندی لگے کسی کے صاحب جمال ناخن
داغِ جگر جو میرا کاوش طلب ہے اُس پر — کرتی ہے تیز اپنا خود دل کی ڈال ناخن
جن انگلیوں کے ہم تھے مشتاقِ دست بوسی — کر بیٹھے وہ حنائی شامِ وصال ناخن
از بہر دل خراشی دے بانٹ عاشقوں کو — حجام رستے میں تو اُس کے نہ ڈال ناخن
از بس گرہ کشائی اپنی ہوئی نہ اُس سے — اب تک ہے ماہِ نو کا پُر انفعال ناخن
گرمی سے دم کی میرے بن گئے ہیں وے پھپھولے — جب لب پہ میں رکھے ہیں وقتِ ملال ناخن

اے مصحفی بدن سے تو کیوں رہے ہے بے سُدھ
کچھ اب کے بڑھ گئے ہیں تیرے کمال ناخن

331

بوس و کنار و لطف و عطا اور کچھ نہیں — اک دیکھنا ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں
آ کر گلے سے لگ نہ گیا، مجھ کو یار سے — اتنا ہی بس گلہ ہے، گلا اور کچھ نہیں
اتنی ہی ہے کہ تو دمِ آخر ہو میرے پاس — بس دل میں میرے حرص و ہوا اور کچھ نہیں
کاغذ ہمارے خط کا نہیں برگِ گل سے کم — لے جا اسی کو بادِ صبا، اور کچھ نہیں
یوں نبض میری دیکھ کے کہنے لگا طبیب — جز مرگ اس مرض کی دوا اور کچھ نہیں
گر یار آوے سلکِ گہر کو نثار کر — اے گریہ، یہ تو ہو جو بھلا اور کچھ نہیں
مجھ کو شبِ فراق کے زنداں میں عشق نے — سونپا یہ کہہ کے، اس کی سزا اور کچھ نہیں
آتش میں پھونکتا ہے تو کیوں مجھ کو عشق کی — تقصیر میری رنگِ حنا اور کچھ نہیں
غیر از نیاز و بندگی و عجز و انکسار — نامے میں اُس کو ہم نے لکھا اور کچھ نہیں
آزردگی کا اُس کی سبب کیا بیاں کریں — خط لکھنے کے سوا تو خطا اور کچھ نہیں

1- نقش پر انگلی رکھوانا = فال دیکھنے کے لیے 2- ناخن لینا = خبر لینا

آزردہ ہو گیا ہے وہ بت یوں ہی مصحفی
جز آہ گرچہ ہم نے کہا اور کچھ نہیں

332

جن راتوں میں ملنے کی سو طرح کی تھیں گھاتیں — افسوس تمنا میں آخر ہوئیں وے راتیں
ٹک آنکھ ملا جی کو لے جاتے ہیں یہ کافر — ہم خوب سمجھتے ہیں خوباں کی اشاراتیں
قابو نہیں اتنا بھی جو اس بتِ کافر سے — ٹک آنکھ بچا سب کی کر لیجیے دو باتیں
لیلیٰ کا سیہ خیمہ لیلیٰ کو مبارک ہو — مجنوں کی تو گزریں ہیں اندھیارے میں برساتیں
اُس سحرِ مجسّم کا کیا ذکر کروں تم سے — جی لینے کی لاگو ہیں کم بخت کی حرکاتیں[1]
مے خانۂ الفت نے حد مست بنایا ہے — ہر چند میں دیکھی ہیں لاکھوں ہی خراباتیں
معلوم نہ تھا تب کچھ یاد آئیں ہیں اب مجھ کو — وے صحبتیں، وے چرچے، وے میٹھی ملاقاتیں
سر ہاے ملائک کو سجدے میں جھکاتا ہے — اس خاک کے پُتلے میں یہ کچھ ہیں کراماتیں
ہر موج کفِ افسوس ملتی ہے جو جمنا میں — ہندی صنموں کی کیا یاد آئیں اسے گاتیں؟

اے مصحفی جس دن سے عاشق میں ہوا اس کا
نت آتی رہیں مجھ پر آفاتوں پہ آفاتیں[2]

333

اتنی ہے کہاں طاقت جو یار کے گھر جاویں — اے بخت زبوں ہم کو کہہ تو ہی کدھر جاویں
تلوار کے ہم اُس کی منہ پر تو چڑھے ہیں لیک — یہ ڈر ہے کہ قاتل کے جی سے نہ اُتر جاویں
عشاق کا کچھ میں نے عالم ہی نیا دیکھا — اک آن میں جی اُٹھیں، اک آن میں مرجاویں
یا آکے تو مل جاوے بیتابی کی حالت میں — یا ڈھنگ ترے یارب جی ہی سے بسر جاویں
ہے جان جدائی سے ہونٹوں پہ ہماری تو ق — یارب کہیں جلدی سے یہ دن بھی گزر جاویں
آپس میں ملاقاتیں ہوں پھر اسی صورت سے — یار آوے ہمارے گھر، ہم یار کے گھر جاویں

1- حرکاتیں (حرکت کی جمع الجمع) بہ سکون دوم باندھا ہے (عوامی) 2- آفت کی جمع الجمع (عوامی)

عاشق تو ترے ہیں ہم پر خوف زدہ ایسے　جب چیں بہ جبیں دیکھیں صورت تری ڈر جاویں
گر ذبح تو کرتا ہے قاتل مجھے، میں خوش ہوں　یہ دستِ حنائی پر لوہو سے نہ بھر جاویں
عالم سے چھپانا اب اس گریے کا مشکل ہے　جوں ابر کدھر لے ہم یہ دیدۂ تر جاویں
مانا کہ نہیں تیری ہم بزم کے شایاں پر　اتنی تو اجازت ہو دو بات تو کر جاویں
اک پھول کی پتی بھی ہم کو نہ ملی کیا ہم　نومید ہی گلشن سے، اے بادِ سحر جاویں؟
یہ ایک چلن میں نے خوباں کا نیا دیکھا　جو کام کریں ظالم بس کر کے مُکر جاویں

اے مصحفی آتا ہے حالت پہ تری رونا
آنکھوں سے تری ہے ہے یوں لختِ جگر جاویں

334

رکھنے دیا نہ ہم کو قدم لالہ زار میں　اک پھول کو ترستے رہے ہم بہار میں
یک بار ووں ہی دن نکل آیا شبِ وصال　سوجھی نہ صبح لذتِ بوس و کنار میں
تو مجھ کو بھولتا نہ و لے سچ ہے کیا کرے　تیرا بھی دل نہیں ہے ترے اختیار میں
آوازِ پا پہ دھیان رہا بسکہ تا سحر　جھپکی ذرا نہ آنکھ شبِ انتظار میں
اُترا نہ رخشِ ناز سے تو، خاک ہو گئے　کیا کیا نیاز پیشہ تری رہ گذار میں
مانندِ نے نہ نالہ کروں میں تو کیا کروں؟　ناسور پڑ گیا ہے دلِ داغ دار میں
خوش طالعی سے قسمتِ دشمن ہوئے وہ ہائے　جو جو کہ چاؤ تھے دلِ امیدوار میں
ہرگز نہ مجھ سے صاف ہوا یار یا نصیب　خط بھی لکھا جو اُس نے تو خطِ غبار میں
خوبانِ روزگار نے چھریوں سے بینڈھ[1] کر　آنکھیں پروئیاں ترے نرگس کے ہار میں
کیا انس اب کسی سے کریں ہو چکے ہیں ہم　وہ انس ہی نہیں دل و جانِ فگار میں
مدفوں ہمارے ساتھ جو ہوویں تو خوب ہے　دو چار حسرتیں بھی ہمارے مزار میں
کاوش ہے اُس کے ساتھ عبث تجھ کو اے جنوں　باقی ہے کچھ بھی پیرہنِ تار تار میں؟

1- بینڈھنا = چبھو کر پرونا

ظالم خدا کے واسطے رہ جا ٹک اور بھی سدِّ رمق[1] سی ہے مری جانِ نزار میں
احسان ہے یہ مجھ پہ فلک کا کہ رات دن رکھتا تو ہے یہ مجھ کو تمنائے یار میں
بسمل یہی کہے تھا ترا زیرِ تیغِ ناز بس تھا یہ زندگی کا مزہ روزگار میں
رونق تھی لکھنؤ کی تو آصف سے مصحفی
اب کیا کرے گا رہ کے کوئی اس دیار میں

335

نیلم ہیں دھرے گویا طاقِ خم ابرو میں شوخی نہ یہ شہلا میں، نے دیدۂ آہو میں
خاک آپ کے اور میرے ملنے کی بہم ٹھہرے تم اور کے قابو میں، میں اور کے قابو میں
مردے کو جلا دینا، جیتے کو سُلا دینا معجز میں نیا دیکھا یہ لعلِ سخن گو میں
وزنِ دلِ عاشق میں، اے صاحبِ من تم کو گر شک ہے تو رکھ دیجے زلفوں کی ترازو میں
کب سروِ سہی اُس کے انداز کو پاتا ہے لاکھوں حرکاتیں ہیں اُس قامتِ دلجو میں
آئینے میں دیکھے تھا جس دم وہ بناؤ اپنا پھرتی تھی نظر اُس کی خود گلشنِ مینو[2] میں
پیکاں کو کوئی اس کے جا کر یہ خبر کر دے ہے دل کی جگہ خالی اب تک مرے پہلو میں
تن گھِس جو گیا ہے تو آتا ہے نظر مجھ کو عکسِ خطِ پیشانی آئینۂ زانو میں
شانے سے زیادہ بھی مت زلف کو رخصت دے ڈرتا ہوں لپٹ جاوے یہ سانپ نہ بازو میں
گنّوں کی جو پھاندی[3] کو تھالب سے ترے دعویٰ کر اُس کو قلم اب تک پلواتے ہیں کولھو میں
اس رنگ کی یک رنگی دیکھی نہ سنی ہم نے لوہو ہے ملا تیرا شاید مرے لوہو میں
گلزار سے عالم کے حسن اس کا نرالا ہے وہ گل نہ کسی گل میں وہ بو نہ کسی بو میں
اے مصحفی ڈھونڈے ہے کیا دل کو، وہ ہووے گا
یا حلقۂ بینی[4] میں یا حلقۂ گیسو میں

1- سدِّ رمق = سانس کا اٹکاؤ 2- مینو = جنت 3- گنّوں کی پھاندی = گنے کے گٹھے
4- حلقۂ بینی = نتھ

336

پیچہ بر پیچ جوانان سلح شور[1] ہوں میں　ناتواں سا نظر آتا ہوں و لے زور ہوں میں

کس کو پرواہ[2] مری، خواہ جلوں خواہ بجھوں　شمع مجلس نہیں کچھ، شمعِ سرِ گور ہوں میں

دل جو رہتا ہے مرا غرقہ بخوں، کہتا ہے　کیا کسی دستِ حنائی کی مگر پور ہوں میں

اور باتیں ہیں ملایم مری، پر وقتِ سخن　اتنا ہی عیب ہے اک مجھ میں کہ منھ زور ہوں میں

خواہ کر قتل مجھے، خواہ کر آزاد مجھے　ہوں ترے ہاتھ میں، مہندی کا ترے چور ہوں میں

کوئی چھٹتا ہے اب اُس کوچے کا آنا جانا　لال ڈوروں پہ تو آنکھوں کے تری ڈور[3] ہوں میں

لاکھ داغوں کی دکھاتا ہوں جو جلنے میں بہار
مصحفی بازیِ آتش کا مگر مور ہوں میں

337

اُٹھ کے کوچے سے ترے جان میں کیوں جاؤں کہیں　یہی خطرہ ہے کہ جاتے ہی نہ مر جاؤں کہیں

جی دھڑکتا ہے کہ کیا جانیے کیا صورت ہو　نام چاہت کا تری، منھ پہ اگر لاؤں کہیں

جی میں ارمان ہیں جو جو وہ نکل جائیں سبھی　دو گھڑی تجھ کو اکیلا میں اگر پاؤں کہیں

لے قسم مجھ سے، مرادونوں جہاں میں ہو برا　بھول کر بھی جو ترے سر کی قسم کھاؤں کہیں

کاوشِ ناخن ابرو سے ہے دل زیر و زبر　یہ خلش گو کہ میں ساتھ اپنے نہ لے جاؤں کہیں

باغ کو جاؤں ذرا سبزہ و صحرا دیکھوں　جوششِ غم سے بھلا دل کو تو بہلاؤں کہیں

مصحفی سچ تو ہے اس دل کا نکل جائے بخار
اک غزل اور بھی اس وقت جو کہہ جاؤں کہیں

338

اُس کے ملنے کی کوئی بات تو ٹھہراؤں کہیں　جی میں آتا ہے یہی اب کہ نکل جاؤں کہیں

1- سلح شور = سپاہی　2- پرواہ = بجائے پروا (غلط العام)

3- ڈور ہونا = فدا ہونا (روزمرہ)

پھر ہی ہووے گا میسر مجھے دیدار اُس کا اور کچھ ہو کہ نہ ہو فال تو دکھلاؤں کہیں

اس مرض نے تو بنایا خفقانی مجھ کو ہولِ[1] دل کا کوئی تعویذ تو لکھواؤں کہیں

اس تلک گو کہ نہ پہنچے غمِ دل کا احوال اس کے یاروں ہی کو خط ڈاک میں بھجواؤں کہیں

مصحفی حسن پرستی میں نہ ہو نام مرا
اب بھی خوباں کی محبت سے جو باز آؤں کہیں

339

بعد مدت کے جو آیا رات دلبر خواب میں خوب رویا میں گلے سے اُس کے لگ کر خواب میں

خواب کا دروازہ کوئی مسدود کر دیتا ہے روز پڑتے ہیں راتوں کو یاں ایسے ہی پتھر[2] خواب میں

جوں ہی ابرو کے تصور میں جھپک جاتی ہے آنکھ دیکھنے لگتا ہوں میں شمشیر و خنجر خواب میں

ہم فقیروں کی تو یارب یہ بھی قسمت میں نہیں وصل کی دولت سے ہو جاتا تونگر خواب میں

یہ تو کہیے آپ کی کیا شان میں جفتے پڑیں[3] آ و گر ہم پاس تم اپنوں سے چھپ کر خواب میں

پرورش منظور ہے مہجور کی اپنے اگر ٹک دکھا جایا کرو منھ، بندہ پرور خواب میں

سو گئے ہیں کچھ نصیب ایسے کہ راتوں کو بھی ہائے دیکھنا اُس کا نہیں ہوتا میسر خواب میں

شرم مانع ہے اگر مجھ پاس آنے کی تو شوخ کچھ تو کہہ جا میرے ہمسایے کے آکر خواب میں

مصحفی اب تک میں ہوں غش میں پڑا، شب شوخ نے
ہاتھ سے اپنے دیا تھا مے کا ساغر خواب میں

340

نہ یہ رنگیں بٹیریں ہیں پری زادوں کے پنجوں میں
اسیر آئے ہیں مرغِ سِدرہ صیّادوں کے پنجوں میں

1- ہَول دل = خفقان، گھبراہٹ 2- پتھر پڑنا = تباہی، بدشگونی

3- شان میں جفتے پڑنا = شان میں فرق آنا

ہوئے ناخن نہ اپنے تارِ سازِ عیش سے واقف
کہ تھے تارِ گریباں ہم سے ناشادوں کے پنجوں میں

نہ ہوں گے قتل جب تک کب رہائی ہووے گی اپنی
ہماری رسیاں محکم ہیں جلادوں کے پنجوں میں

نکل جاوے اگر دم، چھوٹ جاوے رنج سے یہ بھی
پھنسا ہے مرغِ دل بے طرح فریادوں کے پنجوں میں

طلا[1] کے مرغ کو ممکن ہے کوئی قید کر رکھے
وگر نہ پرفشاں رہتا ہے آزادوں کے پنجوں میں

کھرا کھوٹا پرکھ لیتے ہیں وہ اک آن میں اس کا
پڑا جس وقت نقدِ شعر نقادوں کے پنجوں میں

اگر اے مصحفی آ جائیں ہم خارا تراشی پر
رہے باقی نہ ہرگز زور استادوں کے پنجوں میں

341

وہی راتیں آئیں، وہی زاریاں　　وہی پھر سحر تک کی بیداریاں
پری، حور، انساں کسو میں نہیں　　جو دیکھی ہیں تجھ میں ادا داریاں
میں کافر ہوں پر دیکھ سکتا نہیں　　کمر سے تری ربطِ زناریاں
نہ تھے داغ سینے کے اتنے گھنے　　یہ ہیں دستِ قدرت کی گلکاریاں
ہم اک روز جی سے گزر جائیں گے　　رہیں یوں ہی گر نت کی بیزاریاں
بہاریں کہاں ابرِ گلنار کی　　کہاں میری مژگاں کی خوں باریاں
نہ سجدوں سے حاصل ہوا وصلِ یار　　میں کعبے میں بھی ٹکریں ماریاں

1- طلا کا مرغ = سونے کی چڑیا

موا قیس جس دم تو ثابت ہوئیں سوا عشق کے کتنی بیماریاں
تو کیسی بلا میں پھنسا مصحفی
ہوئیں کیا دوانے وہ ہشیاریاں؟

342

آنکھوں کو پھوڑ اڈالوں یا دل کو توڑ ڈالوں یا عشق کی پکڑ کر گردن مڑوڑ ڈالوں
یک قطرہ خوں بغل میں ہے دل مری سو اس کو پلکوں سے تیری خاطر کیونکر نچوڑ ڈالوں
وہ آہوے رمیدہ مل جائے تیرہ شب گر کتا بنوں شکاری اُس کو بھنبوڑ ڈالوں
خیّاط نے قضا کے جامہ سیا جو میرا آیا نہ جی میں اتنا کیا اس میں جوڑ ڈالوں
وہ سنگ دل ہوا ہے اک سنگ دل پہ عاشق آتا ہے جی میں سر کو پتھروں سے پھوڑ ڈالوں
بیٹھا ہوں خالی آخر اے آنسوؤ کروں کیا دو چار گوکھرو ہی لاؤ نہ موڑ ڈالوں
تقصیر مصحفی کی ہووے معاف صاحب
فرماؤ تو تمھارے لا اس کو گوڑ ڈالوں

343

جو پری بھی روبرو ہو تو پری کو میں نہ دیکھوں
مری آنکھیں بند کر دو کہ کسی کو میں نہ دیکھوں

دلِ گرم خونِ الفت مرے بر میں رکھ دیا ہے
سوے گل تو ملتفت ہوں جو کلی کو میں نہ دیکھوں

مرا دل لگا ہے جس سے، مرا جی گیا ہے جس پر
مری کیونکے زندگی ہو جو اُسی کو میں نہ دیکھوں

مری تجھ سے زندگی ہے، تو مرا جگر ہے، جی ہے
کسے دیکھ کر جیوں پھر جو تجھی کو میں نہ دیکھوں

مری کیونکے ہو تسلی تو ہی مصحفی بتا پھر
دلِ شب[1] بھی اس صنم کی جو گلی کو میں نہ دیکھوں

344

ہم جن کے در کے اوپر دھونی لگا رہے ہیں　　وے چھوڑ کر گھر اپنا ہمسایہ جا رہے ہیں
بدنامیوں سے میری رک رک[2] کے ہم سِنوں میں　　از بہرِ رفعِ تہمت باتیں بنا رہے ہیں
اتنے رمیدہ خو ہیں وے ہم سے، اور اُنھوں پر　　اس گھر کے بھی سجیلے آنکھیں جھکا رہے ہیں
میں ان سے مشقِ شیون کی ہے محرّموں میں　　اک عمر ہاتھ میرے صرفِ عزا رہے ہیں
بہرِ خدا کسی نے دیکھی ہے یہ درازی؟　　چوٹی کے بال اُس کے ایڑی پہ آ رہے ہیں
تم ڈھونڈتے پھرو ہو ناحق کو نفت، روغن　　یاں داغِ سینہ آپھی جی کو جلا رہے ہیں
آئینۂ جہاں میں اے مصحفی جو دیکھا
اپنے ہی عکس سے ہم آنکھیں لڑا رہے ہیں

345

کیا میں جاتا ہوں صنم چھٹ ترے در اور کہیں؟　　لے قسم مجھ سے جو میرا ہو گزر اور کہیں
رفتگی کا ہے یہ عالم کہ ترے وقتِ خرام　　پانو جاتے ہیں کہیں اور، کمر اور کہیں
صبح پر وصل کی ٹھہری ہے، شبِ ہجر ترے　　جاویں جلدی سے گزر چار پہر اور کہیں
وادیِ قیس میں جو لے گئی مجھ کو وحشت　　دل کے بہلانے کی جاتھی نہ مگر اور کہیں؟
اُس کے کوچے کو تو اے آہ غنیمت ہی سمجھ　　سچ تو یہ ہے نہیں اتنا بھی اثر اور کہیں
ہم ہیں اور خوشۂ پرویں کا تماشا ہمہ شب　　جا کے جھمکایئے یہ عقدِ گہر اور کہیں
یہ مقدر میں لکھا تھا کہ کبوتر کا مرے　　آہ سر اور کہیں ہووے گا، پر اور کہیں
لا ابالی مری دیکھے ہے تو آئینہ کہاں　　دل ترا اور کہیں ہے تو نظر اور کہیں

1- دلِ شب = آدھی رات　　2- رک رک کے = تنگ آ کر، ہم سِنوں میں = ہم عمروں میں

وعدۂ وصل دیا عید کی شب ہم کو صنم　اور تم جا کے ہوئے شیر و شکر اور کہیں
سامنے اس کے لگوں رونے تو جھنجلا کے کہے　یاں سے لے جایئے یہ دیدۂ تر اور کہیں
چمنِ لالہ ستاں میں مجھے جانے دے صبا　چنگے ہوں گے نہ مرے داغِ جگر اور کہیں
تفرقہ بادِ خزاں نے یہ چمن میں ڈالا　گل کہیں اور پڑا ہے تو ثمر اور کہیں
برگ و بر یہ ترے کوچے میں تو لاتا ہی نہیں　جا کے بٹھلاویں گے خواہش کا شجر اور کہیں
ایسے گھبرائے کہ حالت نہ رہی کچھ باقی　دیکھ آئے جو اسے شمس و قمر اور کہیں
گر میں بدنام ہوا اُس کی گلی میں تو ہوا　یارو، اب یاں سے نہ جاوے یہ خبر اور کہیں

مصحفی میں ہوں وہ سرگشتہ کہ خورشید کی طرح
شام گر اور کہیں کی تو سحر اور کہیں

346

پہلے جب شکووں کی دو باتیں ہوئیں　میری اس کی تب ملاقاتیں ہوئیں
نخلِ حرماں کو نہ تھی بالیدگی　گرچہ کتنی اس پہ برساتیں ہوئیں
آئے جب مجلس میں اُن کی شیخ جی　کیا ہی خوباں میں اشاراتیں ہوئیں
مجلسِ شادی میں دموں[1] لال کی　جلوہ گر کیا کیا طلسماتیں ہوئیں

مصحفی سونے دے آنکھوں کو ذرا
جاگتے ان کو کئی راتیں ہوئیں

347

واں لال پھڑکتا ہے امیروں کے قفس میں　یاں فاختہ حق گو ہے فقیروں کے قفس میں
تا چین سے یاں بھی نہ رہوں، مجھ کو رکھا ہے　بے مہریِ صیّاد نے تیروں کے قفس میں
جو موسمِ گل مر گئے یک بار پھڑک کر　رکھنا تھا ہمیں بھی اُن اسیروں کے قفس میں
دیکھو الفی[2] پوش کو مت دیدۂ کم سے　وہ شیر ہے گویا کہ لکیروں کے قفس میں

1- دموں لال= نام ہے۔ 2- الفی پوش = فقیرانہ لباس میں

گو طاقتِ پروازِ چمن کم ہے تو ہووے گلزار پرافشاں ہے حصیروں[1] کے قفس میں
جلسے میں ہمارے تو گر آوے، نظر آوے گلزار کھلا تازہ صفیروں کے قفس میں

اے مصحفی ہوں کاوشِ طفلاں سے میں حیراں
جوں صعوہ[2] کہ ہووے ہے شریروں کے قفس میں

348

کس دم مزاجِ نازِ بتاں خشمگیں نہیں؟ وہ کون سی گھڑی ہے کہ چیں بر جبیں نہیں؟
پوچھا جو میں دہان و کمر کا پتا، وہ شوخ کہنے لگا یہ ہنس کے، بتا دوں؟ نہیں نہیں
کھیتوں کی بالیں پاس ہیں کیوں آفتاب کے اُس حسنِ گندمی کا اگر خوشہ چیں نہیں
یاں چاکِ جیب تا سرِ دامن گزر گیا اور واں ہنوز جز نگہِ شرمگیں نہیں
نا اہل ہم ہیں ورنہ سراپا میں یار کے وہ عضو کون سا ہے کہ عشق آفریں نہیں
آخر کبھی تو نالۂ زار اس سے ہووے گا گو اپنے طور پر مری طبعِ حزیں نہیں
جب چاہے تو جلا دے مرے مشتِ استخواں کس دن کہا میں اے نفسِ آتشیں نہیں
کیونکر گریں نہ کوے محبت میں سر کے بل ہم پانْو واں دھریں ہیں کہ جس جا زمیں نہیں
ہوتا ہے اس سے منکشف احوالِ نُہ فلک دل صاف ہو ترا تو کم از دور بیں نہیں
کیا تفرقہ پڑا ہے جو ایسی بہار میں دستِ جنوں بہ چاکِ گریباں قریں نہیں
مجنوں فضاے عشق سے آگے نکل گیا اب دشتِ نجد میں بھی وہ صحرا نشیں نہیں
دیتی ہے طعنہ مجھ کو اسیری کا کیوں صبا کیا تو اسیرِ سلسلۂ عنبریں نہیں؟

زیبائی عاشقوں کی ہے رونے سے مصحفی
یاں غیرِ اشک تکمہ[3] سرِ آستیں نہیں

349

نہ چھوٹے قید سے ہم سیرِ لالہ زار کے دن ہزار حیف قفس میں گئے بہار کے دن

1- حصیر = چٹائی 2- صعوہ = ممولا 3- تکمہ = بٹن، گھنڈی

گیا ہے جب سے اُدھر، فرطِ شوق کے مارے — گنا کروں ہوں میں قاصد کے انتظار کے دن
لگے ہیں صیدِ حرم اس پہ پھر گلے رکھنے — پھرے ہیں پھر تری شمشیرِ آبدار کے دن
قریب اس کے جو رہتے تھے ہم تو کٹتے تھے — عجب مزے میں تمنّائے وصلِ یار کے دن
شکار بند لیے اس کا مہر و ماہ چلے — ہوا سوار جو گھوڑے پہ وہ شکار کے دن
رکھیں نہ آپ تو خس خانے سے قدم باہر — ہوا ہے گرم بہت اور ہیں یہ غبار کے دن
غبارِ خاطرِ آزردہ مت ہو، اے ہستی — رہے ہیں تھوڑے سے اب عمرِ مستعار کے دن
گلی میں اُس کی جو جاوے صبا، اُٹھا لانا — تو خاکِ نقشِ قدم اس کے ایتوار کے دن
اگر بہار کے عالم میں جاوے ہاتھ سے دل — تو جاوے، سچ ہے نہیں ہیں یہ اختیار کے دن
نمک فشارِ جراحت رہے زبس دل کے — مزے میں گزرے، ہمیں اُس کے خار خار کے دن
وہ نخلِ سوختۂ باغِ روزگار ہوں میں — کہ برقِ یاس پڑی جس پہ برگ و بار کے دن
ضعیفی آئی وہ تیرے بدن میں گس[1] نہ رہا — قریب پہنچے حواسوں کے انتشار کے دن

سنے ہے مصحفی اب تکیہ کر کے بر رزاق
تو بیٹھ رہ، کہ نہیں تیرے روزگار کے دن

350

عارض پہ ترے زلفیں یہ کالی کالیاں ہیں — دو ناگنیں یہ کافر یا تو نے پالیاں ہیں
نے چوبِ بید لچکے ایسی، نہ شاخِ گل ہی — نازک قدوں کی جو کچھ نازک نہالیاں ہیں
تیروں کے اُس کے پیکاں سینے پہ جو لگے تھے — گر دیکھیے تو اب تک چوٹیں وہ آلیاں[2] ہیں
شب ساکنِ چمن تھے ہم بھی و لے سحر تک — آوازیں بلبلوں کی چھاتی میں سالیاں[3] ہیں
کوچے میں اس کے کیونکر جاؤں میں اولِ شب — رسوائی کا ہے خطرہ راتیں اُجالیاں[4] ہیں
حسنِ قلم تو دیکھو نقاش نے ازل کے — اک مشتِ گل سے کیا کیا شکلیں نکالیاں ہیں

1- گس = طاقت 2- آلیاں (آلے کی جمع) تازہ 3- سالیان = جمع سال کی خلاف قیاس اور بمعنی ازمنہ اور اوقات 4- اُجالیاں = اُجلی (عوامی)

چاروں طرف پھرے ہے آنکھیں جو وہ لڑاتا　طرزِ نگہ کی اُس کے حیران جالیاں ہیں
دل اور جگر لہو ہے عاشق کا اُس کی شاہد　پانوؤں کی بیڑیاں یا ہونٹوں کی لالیاں ہیں
گو بحر میر کی ہے اے مصحفی پہ میں نے
دو چار بیتیں پھر بھی سانچے میں ڈھالیاں ہیں

351

طرزِ سخن میں اُس نے طرزیں نکالیاں ہیں　اک بات ہے تو اُس کے سو ہاتھ گالیاں ہیں
کانوں میں جب سے سینکیں[1] اُس گل نے ڈالیاں ہیں　خارِ الم سے زخمی سونے کی بالیاں ہیں
آ آ گئے ہیں غش میں آگے ہی ہجر کی شب　کیا حسرتیں دلوں کی ہم نے نکالیاں ہیں
چشمِ کبوتر[2] اس کی تھے تیغ کے نہ جوہر　یہ تازہ کشتگاں کے لوہو کی لالیاں ہیں
نے چرخ ہے نہ انجم، تا اُڑ نہ جاویں مردم　دیوار و دام روکیں، اُوپر سے جالیاں ہیں
جب موے سر میں اُس کے دھیان اپنا جا رہے ہے　ہم اور تیرہ شب اور نازک خیالیاں ہیں
اس شاخِ گل کو جس نے آغوش میں لیا ہے　پھولوں میں آستینیں اپنی بسالیاں ہیں
خونِ جگر ہی پی کر پاتے ہیں اک مزہ وہ　قسمت میں جن کی اُس کے غصے کی گالیاں ہیں
کیا ماہِ نو کی ہم کو اے مصحفی خوشی ہو
ہم تیرہ روزوں کی تو راتیں بھی کالیاں ہیں

و

352

کہے ہے کون فقط ایک مصحفی سے ملو　جگہ دو دل میں اُسے، اور یوں سبھی سے ملو
ملے ہو ہم سے، تو دیتے ہیں تم کو ہم سوگند　ہمارے سر کی قسم اب اگر کسی سے ملو

1- ناک کان چھیدنے کے بعد اُس میں نیم کی سینک ڈال لیتے تھے　2- کبوتر کی سرخ آنکھ جیسے۔

غرض سے ملتے ہو پیارے، یہ کون ملنا ہے		ہوئے ہو یار ہمارے تو ہم سے جی سے ملو
یہ اضطراب میں ملنے لگا تو اُس نے کہا		''ہمارے ساتھ نہ تم ایسی بیکلی سے ملو''
نہ مصحفی سے رہو اس قدر خفا پیارے
ہے روزِ عید، گلے آج تو خوشی سے ملو

353

پاس آ کر مرے پہلو سے الگ بیٹھتے ہو		خواب میں بھی جو تم آتے ہو الگ بیٹھتے ہو
کس مسافر کا تمھیں قتل ہے منظور، میاں		کئی دن سے سرِ رہ جیسے کہ ٹھگ بیٹھتے ہو
لختِ دل کس کی تمنا ہے، بساطی بن کر		تم جو اُس کو میں سدا بیچنے نگ بیٹھتے ہو
حضرتِ دل نہیں کچھ قدر تمھاری، واں تو		تم بھی اس کو میں، جہاں بیٹھے ہے سگ بیٹھتے ہو
یہ تو بتلاؤ میاں مصحفی کیا حالت ہے؟
تم جو اس کوچے میں چل چل کے دو ڈگ[1] بیٹھتے ہو

354

پردے پردے ہی میں کیا لطف جلانا ہم کو		جھانکنا پردے سے اور منھ نہ دکھانا ہم کو
مل گئے خاک میں جب ہم تو بنے تودۂ تیر[2]		بے نشاں کر کے کیا تم نے نشانا ہم کو
اسی صورت سے وہاں عمر بسر کی ہم نے		کہ کسی نے ترے کوچے میں نہ جانا ہم کو
گردشِ چشم تمھاری نہیں اُس ڈھب پہ رہی		نظر آتا ہے کچھ اب اور زمانا ہم کو
یہی خطرہ ہے کہ ناحق نہ گنہگار کرے		زیرِ شمشیرِ جفا سر کا ہلانا ہم کو
حشر کا دن ہو تو تربت سے تو اے دعویِ خوں		دست در دامنِ قاتل ہی اُٹھانا ہم کو
مصحفی جھپکی اگر آنکھ تو یوں کہہ دیں گے
اب کے یاروں سے کہ ''کوئی نہ جگانا ہم کو''

1- ڈگ (بہ فتح اول) استعمال کیا ہے   2- تودۂ تیر = مٹی کا ڈھیر جس پر تیر اندازی کی مشق کرتے ہیں

355

وعدوں ہی پہ ہر روز، مری جان نہ ٹالو ہے عید کا دن اب تو گلے ہم کو لگا لو

ہر وقت میاں خوب نہیں گالیاں دینی کیا بکتے ہو تم، یاوہ[1] زباں اپنی سنبھالو

پہنچے کو چھڑاؤگے، بڑے مرد ہو ایسے تم پہلے مرے ہاتھ سے دامن تو چھڑا لو

دیوانے کا ہے تیرے یہ عالم کہ پری بھی دیکھ اُس کو یہ کہتی ہے کوئی اِس کو بلا لو

اُس شوخ کی آنکھوں کے جو جاتا ہوں مقابل کہتی ہیں نگاہیں کہ اِسے مار ہی ڈالو

یوں پھرتے ہو مقتل پہ شہیدانِ وفا کے دامن تو ذرا ہاتھ میں تم اپنے اُٹھا لو

جاں ڈالتا ہے مصحفی قالب میں سخن کے ق مشکل ہے کہ تم اُس کی طرح شعر تو ڈھالو

گو زمزمۂ دہلی و گو لہجۂ پورب کیوں اس کی طرف ہوتے[2] ہو ناحق کو رزالو

356

ان کے کوچے ہی کی خوش آتی ہے جا کچھ ہم کو خوب رویوں سے محبت ہے بلا کچھ ہم کو

اس کے کوچے میں گئے ہم جو گدائی کرنے غیرِ دشنام کسی نے نہ دیا کچھ ہم کو

رات ہم بزمِ رقیباں میں گئے تھے تنہا تیری خاطر سے کسی نے نہ کہا کچھ ہم کو

شکر کرتے ہیں کہ یہ جان کے دشمن تو نہیں سچ تو یہ ہے نہیں یاروں سے گلا کچھ ہم کو

اس کے کوچے میں میاں مصحفی دل ڈھونڈتے ہو؟

ہم بتا دیویں اگر، دوگے بھلا کچھ ہم کو؟

357

پردے میں دیکھ ظالم مجھ کو، چھپا نہ کر تُو ہوں میں ترا تو خادم، مجھ سے حیا نہ کر تُو

بیمارِ غم کو تیرے منظور اب یہی ہے یعنی جو ہو سو ہو پر اپنی دوا نہ کر تُو

ہو جائے گا کسی دن تجھ کو پری کا سایہ سر کھولے کوٹھے پر یوں کافر پھرا نہ کر تُو

1- یاوہ = بیہودہ، فضول 2- طرف ہونا= مقابلہ کرنا

الفت میں اس کی کھپ جا، چاہت میں اس کی مر جا — سب کر، پر ایک اے دل ترکِ وفا نہ کر تُو
دو دن وہ لگ چلے تو ناز اُس کو یوں سکھاوے — یہ شخص بد نظر ہے اس سے ملا نہ کر تُو
گو مشتِ خاک میری کچھ کام کی نہیں ہے — یوں در بدر تو اس کو بادِ صبا نہ کر تُو
پیکانِ تیر اپنا مت کھینچ، مان کہنا — پہلو سے میرے دل کو ظالم جدا نہ کر تُو
کچھ رنجشوں کی باتیں نکلیں تو رک کے بولے — ''وہ آدمی نہیں میں، میرا گلا نہ کر تُو''
مت کہہ کہ ''تیری ضد پر میں غیر سے ملوں گا'' — ایسا تو کام ہرگز بہرِ خدا نہ کر تُو
معشوق تیرا تجھ سے اک روز آ ملے گا
سن مصحفی دوانے اتنا کڑھا نہ کر تُو

358

تم یہ اکڑ کسی سے اللہ کیوں رکھو ہو — رکھو ہو گر اکڑ تو، پھر راہ کیوں رکھو ہو
گر دردِ دل نہیں تو تیوری چڑھا کے پیارے — سینے پہ ہاتھ اپنے کر آہ، کیوں رکھو ہو
مانو نہ گر برا تو اک بات تم سے پوچھوں — عاصی سے اپنے اتنا اکراہ کیوں رکھو ہو
دیکھا جو ساتھ اس کے مجھ کو رقیب بولا — یہ روگ ساتھ اپنے توباہ[1] کیوں رکھو ہو
اے مصحفی سزا ہے گر جا کنویں میں ڈوبو
دل میں کسی کی اپنے تم چاہ کیوں رکھو ہو؟

359

کیا کیا بدنِ صاف نظر آتے ہیں ہم کو — کیا کیا شکم و ناف نظر آتے ہیں ہم کو
عالم کو انھی لوگوں نے تو صاف کیا ہے — جو پہنے سری صاف نظر آتے ہیں ہم کو
ہر چند ہے پردے میں نہاں وہ مہِ تاباں — پر اس کے سب اوصاف نظر آتے ہیں ہم کو
معجر[2] میں بتاں کے جو نظر کام کرے ہے — سو رنگ کے موباف نظر آتے ہیں ہم کو

1- توباہ = توبہ 2- معجر (بروزن بستر) = دوپٹہ

چوٹی کے ترے بال سب اے کبکِ خراماں عنقا ہی کے بس قاف نظر آتے ہیں ہم کو
دل سینے میں دُھنتے ہیں بتاں شکل روئی کی یہ قوم کے ندّاف[1] نظر آتے ہیں ہم کو
برسوں نہیں ملتے کبھی مشتاق سے اپنے طور آپ کے حرّاف[2] نظر آتے ہیں ہم کو
اے مصحفی اشراف کا تھا یا تو زمانہ
یا عرصے میں اجلاف[3] نظر آتے ہیں ہم کو

360

بے صرفہ جو آنکھوں سے چلے آتے ہیں آنسو کیا جانیے کیدھر کو بہے جاتے ہیں آنسو
تُو سامنے ہوتا ہے، مری جان جو بیٹھا ہم آنکھوں میں لا کر وہیں پی جاتے ہیں آنسو
کس طرح میں سوؤں کہ شبِ ہجر میں تیری پروین کا تماشا مجھے دکھلاتے ہیں آنسو
بادل سے امنڈتے ہیں کسی وقت تو پہروں طوفان مری آنکھوں سے برساتے ہیں آنسو
اے مصحفی دیکھوں ہوں میں اور بس نہیں چلتا
یوں لختِ جگر خاک میں ملواتے ہیں آنسو

361

کیا دخل کسی سے مرضِ عشق شفا ہو ممکن ہے کہ اس درد کی دنیا میں دوا ہو
بالوں کا گھر س رکھنا ہے پگڑی ہی میں بہتر کیا فائدہ اک خلق گرفتارِ بلا ہو
مغرور نہ رہ ہستیِ موہوم پہ، غافل یاں آنکھ جھپکتے ہی خدا جانیے کیا ہو
اے مشتِ غبار تنِ فرسودۂ عاشق اس کُو میں زمیں گیر ہے گو اب تو ہوا ہو
گر چرخ پہ جاوے تو شفق ہووے مرا خوں در خاک میں پنہاں ہو تو واں رنگِ حنا ہو
ہے صبح سے کچھ آج مرے دل کو بشاشت اس کوچے سے قاصد تو نہ خط لے کے چلا ہو
کیا دور ہے گر روح مری بعد فنا بھی پھرتی رہے کوچے میں ترے بادِ صبا ہو
پردہ میں اُٹھاتا نہیں زنہار کسی کا اس ڈر سے کہیں، تُو ہی نہ پردے میں چھپا ہو

1- ندّاف = روئی دُھننے والے 2- حرّاف = چالاک 3- اشراف کی ضد، کمینے

ہے آئینے میں عکس ترا تیری ہی صورت تو اس پہ فدا اور وہ تیرے پہ فدا ہو
چلتے ہی ترے بام پہ آیا ہے وہ کافر کیوں ا۔تنے قدم جلد اُٹھاتا ہے، کھڑا ہو
اے مصحفی اس کوچے سے تو سر کو جھکائے
کیا جاوے ہے کم بخت، ذرا رو بہ قفا[1] ہو

362

وہ نہیں آج صنم تیرے گریبان کی بُو سچ ہے یہ بات کہ چھپتی نہیں انسان کی بُو
غنچۂ دل جو ہوا تھا ہدفِ ناوکِ ناز اب تلک آتی ہے اُس سے ترے پیکان کی بُو
کس نے لے جا کے خدا جانیے یوں پھیلا دی دشتِ تبت میں تری زلفِ پریشان کی بُو
ہوں وہ دیوانۂ مشکین و خطِ زلفِ بتاں رنجہ کرتی ہے جسے سنبل و ریحان کی بُو
آج پھر عطر میں ڈوبا ہوا وہ آیا ہے وہی چولی کی مہک اور وہی دامان کی بُو
مر گئی سونگھ کے بلبل وہی پھل گلشن میں جس سے آتی تھی ترے سیبِ زنخدان کی بُو
کس سے اے گل تو شبِ دوش ہوا ہم بستر آج کچھ آتی ہے تجھ سے نئے مہمان کی بُو
گرسنہ چشموں[2] کی اوقات پہ مرتا ہوں کہ بس لگ چلے وو ہیں جہاں آئی اُنھیں خوان کی بُو
مصحفی کس لبِ پاں خوردہ کے بوسے میں لیے
منھ سے جاتی نہیں اب تک جو مرے پان کی بُو

363

تنہا نہ وہ ہاتھوں کی حنا لے گئی جی کو مکھڑے کے چھپانے کی ادا لے گئی جی کو
ہم ہو گئے ناچار بہت زلف سے اُس کی کیا کہیے اک ایسی ہی بلا لے گئی جی کو
کیا جانے وہ رفتار تھی یا کوئی بلا تھی جو جھونک میں دامن کی اُڑا لے گئی جی کو
یاں لعلِ فسوں ساز نے باتوں میں لگایا دے پیچ وہاں زلفِ دوتا لے گئی جی کو
میں اُس سے کہا، بہرِ خدا لے نہ مرا جی مسّی کی دھڑی بہرِ خدا لے گئی جی کو

1- رو بہ قفا ہو = پیچھے مڑ کر دیکھ 2- گرسنہ چشم = دیدار کے بھوکے

جاتے تو گئے سوے چمن اس کی گلی سے پر جاتے ہوئے بادِ صبا لے گئی جی کو

شب مصحفی میں رقص کی مجلس میں گیا تھا
اک شوخ کی واں جنبشِ پا لے گئی جی کو

364

جہانیاں کو ذرا بھی جب اپنا پاس نہ ہو جہاں کی وضع سے کیوں کر کہ دل اُداس نہ ہو

دل اپنا کھو کے میں مجلس میں خوب رویوں کی پھروں ہوں ڈھونڈتا شاید کسی کے پاس نہ ہو

جو ہم نے حادثہ دیکھا سو آشنائی سے کوئی کسی کا زمانے میں روشناس نہ ہو

خیالِ رخ میں ترے جس کو حسن دے مانی تو اس ورق کا کبھی خال و خط اداس نہ ہو

مزار کشتۂ گیسو پہ ہے یہ چرخ، روا کہ جاے سبزہ خدا آفریدہ[1] گھاس نہ ہو

تڑپ کے مرگئی بلبل قفس میں ہے ظالم کسی کو موسمِ گل میں کسو سے یاس نہ ہو

پری سی شکل پہ لٹو ہوا ہے دل میرا جیوں میں کیونکے جو ملنے کی اس کے آس نہ ہو

نہ جب تلک ہمیں ساقی تو دے پیاپے جام تسلی اپنی تو ہرگز بہ یک دو کاس[2] نہ ہو

اُگے جو تربتِ مقتولِ روے زیبا سے تو کیونکے صورتِ مردم گیاہ[3] گھاس نہ ہو

ترا خدنگِ نگہ یوں کہے ہے رستم سے ہے جنگ دور، ابھی سے تو بے حواس نہ ہو

غزل اک اور بھی لکھ مصحفی شگفتہ سی
ابھی تو شب بہت آئی نہیں، اُداس نہ ہو

365

ہمارے دل کی دوا جب مسیح پاس نہ ہو تو زندگی سے بھلا کیونکے جی اُداس نہ ہو

وہ آئینے سے بھی آنکھیں ملائے گر اپنی تو اس کی دید سے اتنی تو ہم کو یاس نہ ہو

گلی میں اُس کی رکھوں ہوں میں ڈرتے ڈرتے قدم دو چار واں کوئی تا شخص روشناس نہ ہو

کبھو نہ طرۂ سنبل کو میں لگاؤں منھ گر اس کے بالوں میں چوٹی کی تیری باس نہ ہو

1- خدا آفریدہ = خودرَو 2- کاس= پیالہ 3- مردم گیاہ = ایک قسم کی گھاس

لگائے ہاتھ کوئی اس بدن کو پھر کیونکر
نگاہ کو بھی جہاں رخصتِ مساس نہ ہو

لکھا تھا یوں ہی کہ دیوانگانِ الفت کا
بغیر جامۂ عریاں تنی لباس نہ ہو

اگر نہ وقتِ دِرَو[1] کشت عمر کا پہنچے
تو قد خمیدہ ہو پیری میں شکل داس[2] نہ ہو

ہزار رنگ کے آویں ملال دل پہ مرے
خدا کرے کہ ترا رنگِ رخ اداس نہ ہو

میں اس کے آتے ہی گم دست و پا کروں تو وہ شوخ
کہے ہے ہنس کے سنبھل، اتنا بدحواس نہ ہو

میں مر گیا تری دوری میں دی تھی کس نے دعا
کہ چاہنا تجھے روے نکو کا راس نہ ہو

وہ تشنہ حشر کا اُٹھتا نہیں شہیدوں میں
زلالِ[3] خنجرِ قاتل کی جس کو پیاس نہ ہو

یہ فیلِ مست سی سر پر چڑھی ہی آتی ہے
شبِ فراق سے کیونکر مجھے ہراس نہ ہو

موا ہو دیکھ کے کُرتا جو سبز لاہی کا
فلک، روا ہے یہ تربت پہ اُس کی گھاس نہ ہو

نظر پڑے ہے جو کچھ آتشِ فروزاں سی
خبر تو لیجیو پھولا یہاں پلاس[4] نہ ہو

سمجھ کے پڑھ غزلِ مصحفی ہے اے مطرب
یہ قول و زمزمہ و توڑی و بھاس[5] نہ ہو

366

ظلماتِ شبِ ہجر کی آفات ہے اور تُو
جو دم ہے غنیمت ہے کہ پھر رات ہے اور تُو

اک ہم سے ہی ملنے میں تامل ہے وگرنہ
غیروں سے وہی تیری ملاقات ہے اور تُو

یاں روزِ سیاہ و شبِ تاریک ہے اور ہم
واں آئینۂ باغِ طلسمات ہے اور تُو

مر جانے کی جا ہے کہ صنم دو دو پہر تک
ہر اک سے سرِ بام اشارات ہے اور تُو

سو باتیں ہوئیں تو نہ ملا اپنے سے اے دل
کیا بات ہے تیری کہ وہی بات ہے اور تُو

نے حور، نہ انساں، نہ پری اور نہ فرشتہ
جس حسن و صباحت میں تری گات ہے اور تُو

1- دِرَو= فصل کی کٹائی کا زمانہ، 2- داس= درانتی جس سے فصل کاٹتے ہیں
3- زُلال (بہ ضمِ اول) صاف میٹھا پانی 4- پلاس = ہتھیلی ہاتھ کی رنگین، دست حنابستہ
5- مختلف راگوں کے نام

زندانِ فراق و لبِ خاموش ہے اور ہم — سیرِ چمن و حرف و حکایات ہے اور تُو
ہووے گا نہ یہ ہستیِ فانی کا بکھیڑا — اک روز یہ ہوگا کہ تری ذات ہے اور تُو
نومید نہ ہو ہجر میں اے مصحفی اس سے — دو دن کو وہی لطف و عنایات ہے اور تُو
کڑھ مت کہ فراغت کی بھی آجائے ہے ساعت — پھر، مان دوانے وہی اوقات ہے اور تُو

367

گو خنجرِ بیدادِ فلک ریختہ[1] دم ہو — تو تیغ کو پتھر نہ چٹاوے[2] تو ستم ہو
تالاب ہیں پانی کے بھرے دل میں ہمارے — بہنے لگیں ندیاں ابھی گر یک مژہ نم ہو
اس رات کو اے دورِ فلک کچھ تو بڑھاوے — جس رات وہ اک دل کی ملاقات بہم ہو
ہر پور کے ناخن میں نہانی[3] ہیں خلیدہ — اس ہاتھ سے کس طرح بھلا نامہ رقم ہو
زندانِ جدائی میں رکھا ہم کو فلک نے — اس واسطے تا دل سے محبت تری کم ہو
تو باغ میں جاوے تو ابھی سروِ خراماں — مجرے کو ترے سروِ سہی دور سے خم ہو
یہ وادیِ مجنوں ہے ٹھہر جا کوئی ساعت — اے ناقہ، نہ اتنا بھی تو اب تیز قدم ہو
ہے مزرعِ امید مرا خشک، خدایا — اس پر بھی کبھی سایہ فگن ابرِ کرم ہو
ممکن نہیں جاوے وہ تری شست[4] سے بچ کر — گر طائرِ سدرہ ہو وگر صیدِ حرم ہو
قسمت میں لکھا تھا مرے قاصد کی، پہنچ کر — کوچے میں ترے، راہیِ صحرائے عدم ہو
قاصد اگر اس کوچے میں جانا بھی ہو تیرا — وہ بات نہ کہیو کہ مرے حق میں ہی سم ہو
اوقات فراغت سے کٹے ایک ہی جا کہ — اندیشۂ اغیار و نہ بدنامی کا غم ہو

اے مصحفی جی اب تو یہ چاہے ہے کہ چندے
مہتاب ہو اور بام ہو اور اپنا صنم ہو

1- چاہے فلک خنجر بیداد نے خون بہایا ہو 2- تیغ کو پتھر چٹانا= پتھر پر رگڑ کر دھار تیز کرنا
3- نہانی= نہرنی، ناخن کاٹنے کا آلہ 4- شست = چٹکی، نشانہ

368

اس بات کا کیونکر نہ رفیقوں کو الم ہو؟ 　 تم رحم کرو غیر پہ اور ہم پہ ستم ہو
کرنے کو پس از مرگ مری تعزیہ داری 　 کیا دور جو تربت کا ہر اک نخل علم ہو
کس طرح میں دیکھوں کہ مری آنکھوں کے آگے 　 آئینے میں اور تجھ میں اشارات بہم ہو
ساعد کو تری بھول کے بھی، اے بتِ کافر 　 گر میں نے چھوا ہو تو مرا ہاتھ قلم ہو
اک طرفہ مزہ یہ ہے کہ اس بے مزگی پر 　 نے چاہ گھٹے اُس کی، نہ الفت مری کم ہو
دن چھپ گیا اور طے نہ ہوئی منزلِ مقصود 　 ایسا بھی الٰہی نہ کوئی سست قدم ہو
جو فرش گدائی پہ ہیں جم بیٹھنے والے 　 تھوکیں نہ کبھی اُس پہ، اگر مسندِ جم ہو
طاقت ہے ہمیں جان کہاں چینِ جبیں کی 　 مر جائیں وہیں ہم تو جو بھوں بھی تری خم ہو
اک دن کو نہ پھر ہم ہیں نہ تم اور نہ یہ صحبت 　 ہم تم میں غنیمت ہے جو صحبت کوئی دم ہو
یہ سوچ کے میں غم زدہ مر بھی نہیں سکتا 　 ڈرتا ہوں نہ تجھ کو مرے مر جانے کا غم ہو
افسوس ہے اے شمع تو ساتھ اس کے نہ پھنک جائے 　 پروانۂ دل سوختہ یوں جل کے بھسم[1] ہو

اے مصحفی گر دیدۂ خواہش سے تو دیکھے
پھر اس کا عجب کیا ہے جو پتھر بھی صنم ہو

369

دم ناک میں آتا ہے تب تم کہیں آتے ہو 　 یہ بھی کوئی آنا ہے کیوں جی کو جلاتے ہو
سب شاعری اپنی کا سامان تمھیں سے ہے 　 اک حرف میں سو نکتے تم ہم کو سجھاتے ہو
مہندی لگے ہاتھ اپنے ٹک دور رکھو صاحب 　 بوئے گلِ رسوائی کیا مجھ کو سنگھاتے ہو
اللہ رے حیا کتنے خجلت زدہ ہو تم بھی 　 آئینے سے بھی اپنی اب آنکھ چُراتے ہو
ظاہر میں تمھیں ہم سے میاں وحشت و نفرت ہے 　 اور خواب میں آ آ کر نت چاہ جتاتے ہو
رستے پہ بٹھا مجھ کو ہو جاتے ہو تم غایب 　 ایسے کہ مجھے پہروں پھر راہ دکھاتے ہو

1- بھسم = بہ فتح اول باندھا ہے۔

میاں مصحفی میں وہ بھی دیتا ہوں سنا تم کو
گر اور غزل مجھ سے اِس وقت پڑھاتے[1] ہو

370

انداز میں ٹھوکر کے مُردوں کو جلاتے ہو
مرجاتے ہیں پھر وے جب دامن کو اُٹھاتے ہو

خورشید خجل ہو کر پھر جائے ہے مشرق کو
تم جب اسے غرفے سے منہ اپنا دکھاتے ہو

اے چارہ گراں سمجھو موسم یہ رفو کا ہے
ایامِ بہاراں میں کیا جیب سِلاتے ہو؟

شیوہ یہ نکالا ہے کچھ تم نے کہ عاشق کو
اک بات ہنسی کی کہہ پہروں ہی رُلاتے ہو

ظاہر کے نہ ملنے کا کیا تم سے گلہ کیجے
اتنا بھی غنیمت ہے جو خواب میں آتے ہو

یہ رشک کا عالم ہے مرجاتے ہیں ہم دو ہیں
گر غیر کو تم اپنی آواز سناتے ہو

مت گورِ غریباں پر گھوڑے کو کداؤ یوں
کیوں اپنے شہیدوں کے آثار مٹاتے ہو

خوں ریزیِ عاشق کو ہو تم بھی غضب کافر
مسّی کی دھڑی کیا ہے بیداد جماتے ہو

میاں مصحفی سوچو تو ہاتھ آئے ہے عنقا بھی؟
کس شخص کے پیچھے تم دوڑے ہوئے جاتے ہو

371

فکرِ خواری کشانِ چند کرو
ٹک تو کوٹھے سے سر بلند کرو

اس سے کیا کیا جوان مارا ہے
ہاتھ پر اپنے تم سپند[2] کرو

جان و دل نذر ہیں تمھاری میاں
جس کو چاہو اُسے پسند کرو

جلوہ گر ہے جمالِ شاہدِ غیب
نظر آوے جو چشم بند کرو

زلف کافی ہے صیدِ دل کے لیے
جَعدِ مشکیں کو مت کمند کرو

فائدہ کیا ہے نت کے بکنے کا
کہیں اپنی زبان کو بند کرو

1- سپند کرو = نظر اُتارو

مصحفی آدمی نہ ہووے گا
دوستاں ترک وعظ و پند کرو

372

مت طوقِ گریباں کو گلوگیر بناؤ زنجیر بہ گردن مری تصویر بناؤ
پانی کا ببولا جو کرے قصد تمھارا تم وے ہو وہیں موج کی شمشیر بناؤ
چبھتے ہیں مرے دل میں سراسر سرِ مژگاں کیا دخل ہے ایسا جو کوئی تیر بناؤ
ہندی صنمو جس سے خطِ صبر لپٹ جاوے ایسی کفکِ پا کی نہ تحریر بناؤ
کچھ بات بن آتی ہی نہیں سامنے اُس کے گو لاکھ طرح سے کوئی تقریر بناؤ
بالوں کو پریشاں نہ کرو اتنا جبیں پر مت صبحِ قیامت کو شبِ قیر[1] بناؤ
دو تین دمِ سرد بھرے میں، تو وہ بولے جاؤ مری مجلس کو نہ کشمیر بناؤ
اے چہرہ کشاں جس سے کہ تقدیر بھی مٹ جائے ایسا تو ورق کوئی بہ تدبیر بناؤ
میاں مصحفی گٹھری کو لگا پیٹھ سے اپنی
اب یاں سے چلو آپ کو رہ گیر بناؤ

ہ

373

دل میں چمک اُٹھتی ہے نصیحت سے زیادہ یہ عشق بھی ہوتا ہے ملامت سے زیادہ
کیا اُس سے کسی بات کے پھر ہو جیے سائل ناگفتہ جو پیش آئے مروت سے زیادہ
ہیں حادثے دنیا میں بہت، پر مرے نزدیک آفت ہی نہیں عشق کی آفت سے زیادہ
جوں جوں میں کیا منع اُسے، وہ مری ضد پر مالوف[2] ہوا غیر کی صحبت سے زیادہ

1- قیر (بروزن تیر) سیاہ، گھنگھور 2- مالوف = مانوس

میں بارِ غمِ عشق کو کس طرح اُٹھاؤں　یہ کوہِ گراں ہے مری طاقت سے زیادہ

اللہ رے نقشا، کوئی کیا خاک کرے گا　صنعت قلمِ صنع کی صنعت سے زیادہ

ہر چند کہ مدفون ہیں اُس تیغ کے کشتے　خوں اُبلے ہے لیکن مری تربت سے زیادہ

اب میں بھی منھ اپنے کو چھپا بیٹھ رہوں گا　بیزار ہے عالم مری صورت سے زیادہ

جب خامہ لیا ہاتھ میں نقاشِ ازل نے　صورت نہ بنائی تری صورت سے زیادہ

چاہوں گا میں تم کو جو مجھے چاہو گے تم بھی　ہوتی ہے محبت تو محبت سے زیادہ

معلوم ہوئی آج ہمیں اُس کی درازی　ہے ہجر کا دن روزِ قیامت سے زیادہ

جا کر کے کوئی حی[1] میں کہہ دیوے کہ ناقہ　جاتا ہے نکل وادیِ غربت سے زیادہ

کب سروِ سہی میں یہ پھبن نکلے ہے پیارے　دو مشت ہوا گو تری قامت سے زیادہ

سر بے طلبِ یار دیا راہِ وفا میں　یہ کام کیا ہم نے تو ہمّت سے زیادہ

اب تو بھی نہ رد کر ہمیں پیارے کہ جہاں میں　بدنام ہوئے ہیں تری چاہت سے زیادہ

ہر چند شبِ مرگ تھی تاریک و لیکن　تاریک نہ ہوگی شبِ فرقت سے زیادہ

اک پرزے پہ کیونکر میں لکھوں مصحفی اس کو
مضمونِ تمنّا ہے عبارت سے زیادہ

374

غیر سے تم راہ رکھو ہم کو دو چھچکار[2] واہ　اور تو کیا تم کو کہیے، ہو تو اچھے یار واہ

بدمزاجی، خشمگینی، زود رنجی اس قدر　بات کے کہتے ہی تم تو ہو گئے بیزار واہ

کر دیا افسانۂ بازار رازِ عشق کو　خوب گل تم سے کھلا اے دیدۂ خوں بار واہ

خاکساروں کے سروں کو نت لگیں ہیں ٹھوکریں　ان دنوں تم نے نکالی ہے عجب رفتار واہ

اشتیاق اپنے کا قصہ جھوٹ کہتا ہوں مگر　تم جو کر جاتے ہو میری بات پر ہر بار واہ

1- حی = محلّہ　2- چھچھکار = دھتکارنا

دیکھ کر حسن اُس کا پڑھتے ہیں ملائک بھی درود　　دیدنی ہے وہ جبیں، وہ چہرہ، وہ رخسار واہ

ہم تو سنتے تھے ابھی میاں مصحفی تم میں ہے ہوش
ہو گئے کافر ہی تم تو باندھ کر زنار واہ

375

نزدیک اس کے اے دلِ بے صبر جا تو بیٹھ　　اک روز حالِ زار اسے اپنا سنا تو بیٹھ

شاید وہ آوے بام پہ، کوچے میں یار کے　　ٹک سر کو اپنے زانوے غم سے اُٹھا تو بیٹھ

زاہد ممانعت نہیں رندوں کی بزم میں　　دو چار دھولیں اُن کی، خوشی سے جو کھا تو بیٹھ

شاید وہ اس گھڑی تجھے لے تھام مصحفی
بیمار ہے تو یار سے تکیہ لگا تو بیٹھ

376

بہت سے بحرِ محبت میں ہم نے مارے ہاتھ　　لگا نہ ساحلِ مقصود، پر ہمارے ہاتھ

شبِ وصال میسّر ہوئی تو ہم نے بھی　　لگائے آنکھوں سے اپنی وہ پیارے پیارے ہاتھ

ہمارے دل پہ لگا ہے اُنھی کا ناخنِ شوق　　رکھے ہیں ہاتھوں میں اپنے جو چاند تارے ہاتھ

جو کچھ کہ چاہو کرو، اختیار باقی ہے　　بکے ہیں اب تو مری جان ہم تمھارے ہاتھ

اُنھوں نے گرچہ گریبان سیکڑوں پھاڑے　　پہ تو بھی جامہ دری سے نہ میرے ہارے ہاتھ

تمھارے ہاتھ کو چھوڑوں ہوں میں کوئی صاحب　　لگے ہو آج بڑی محنتوں سے بارے ہاتھ

ادا کفک کی جو دیکھی تو مصحفی نے وہیں
تمھارے پانْو پہ حور و پری کے وارے ہاتھ

377

جس راہ سے وہ قاتل گزرا ہے تیغ بستہ　　اس راہ پر ہوئے ہیں مردم کھڑے دو[1] رستہ

تعلیق [2] پر ہوئی وہ زلفِ دراز مایل　　خط کے تئیں خوش آئی مشقِ خطِ شکستہ

1- دو رستہ = دونوں طرف　2- تعلیق = خوشنویسی کی اصطلاح

طولِ شبِ جدائی ہم کوئی لکھ سکیں ہیں؟　　جب تک نہ ہوویں کاغذ ہم پاس یک دو دستہ
واں کون پوچھتا ہے، کوچے میں اس صنم کے　　ہم سے پھرا کریں ہیں لاکھوں خراب و خستہ
کانِ حیا ہیں میرے دیوان مصحفی سب
شوخی کے میں کہے ہیں اشعار جستہ جستہ

378

گلشن میں ہوا سے جو کھلا یار کا سینہ　　حسرت سے گیا پھٹ گل و گلزار کا سینہ
ایسا ہی لگا ہاتھ کہ ہو جائے دو بخرے[1]　　مشتاق ہے کب سے تری تلوار کا سینہ
صیاد ترے ناوکِ مژگاں سے قفس میں　　غربال[2] ہوا مرغِ گرفتار کا سینہ
جس قید گہِ بے گنہاں میں ہوں میں قیدی　　بے شق نہیں واں کے در و دیوار کا سینہ
نیزوں سے مری آہ کے اک رات بھی یارب　　چھلنی نہ ہوا چرخِ ستم گار کا سینہ
بیتابی سے نالاں ہی رہا یہ، تو کسی دن　　پھٹ بھی نہ گیا مرغِ گرفتار کا سینہ
افسوس کہ جوں لالہ غمِ عشقِ بتاں میں
بے داغ نہیں مصحفی زار کا سینہ

379

شب کھل گئی جو طرّۂ دلدار کی گرہ　　وا ہو گئی وُہیں دلِ بیمار کی گرہ
شانے ہی کا گناہ ہے جو اس سے ہر گھڑی　　الجھے ہے تیری زلف کے ہر تار کی گرہ
بندِ قبائے گل جو نہ کھلتے تو عندلیب　　کھلتی نہ تیرے غنچۂ منقار کی گرہ
زاہد کا سر ہے اک تو گرہ خود غرور سے　　تس پر غضب ہے اور یہ دستار کی گرہ
چھٹتے ہی ہار میرے گلے کا وہ ہو گیا　　شب کھل گئی جو اس کے کہیں ہار کی گرہ
دستِ مجال اپنا پہنچتا ہے کب وہاں؟　　ہے زیرِ ناف اس کے اک اسرار کی گرہ
سو خطِ سر بمہر مرے، طاق پر رہے　　قاصد سے کھل سکی نہ دلِ یار کی گرہ

1- دو بخرے - دو ٹکڑے　2 غربال = چھلنی

کیا برہمن سے کیجے جدل[1] جس نے مصحفی
کھولی نہ اپنے رشتۂ زنّار کی گرہ

380

اُٹھتا ہے شاخِ گل سے کوئی آشیاں کا بوجھ　ہاں پھول سا ہی چاہیے نازک تناں کا بوجھ
ہے اک تو زلفِ کج ہی سے وہ شانہ زیر بار　تس پر غضب ہے اور یہ شاخِ کماں کا بوجھ
میں حاملانِ عرش کے پوجوں نہ کیونکے پانو　ایسوں ہی سے اُٹھے ہے بس ایسے مکاں کا بوجھ
کانٹا ہوا ہوں سوکھ کے یاں تک کہ اب سنار　کانٹے میں تولتے ہیں مرے استخواں کا بوجھ
چھوٹے نہ زیرِ خاک بھی محنت کشی سے ہم　سر پر رہا وہاں بھی یہ سنگِ گراں کا بوجھ
پانو اس کے لڑکھڑاتے ہیں چلنے میں اب، مگر　لے لیوے مرگ سر پہ ترے ناتواں کا بوجھ
اس فربہی پہ اُس نے بھی کیا مست دیا ہے ہار　اُٹھتا نہیں سُریں سے جو موے میاں کا بوجھ
مشہور ہے کہ عقل نخستیں سے مصحفی　ق　اُٹھا نہ اور کچھ مگر اک آسماں کا بوجھ
پر حوصلے پہ عقلِ دہم کے میں دنگ ہوں　سر پر لیا ہے جس نے یہ سارے جہاں کا بوجھ

381

حسنِ بدن ہے اُس کا جو مانوسِ آبلہ　سر تا قدم بنا ہے وہ طاؤسِ آبلہ
کعبے کو جب چلے تو رہا پھر کہاں کا دیر　یاں ہر قدم پہ ٹوٹے ہے ناقوسِ آبلہ
یوسف کو ننگے پانو نہ دوڑاؤ، بھائیو　یہ پانو ہیں سزاے قدم بوسِ آبلہ
تارے نہیں چمکتے ہیں یہ بن گیا ہے چرخ　گرمی سے شمعِ آہ کی فانوسِ آبلہ
ڈرتا ہوں رازِ عشق سے اُس کو خبر نہ ہو　جا ہی لگا ہے دل سے تو جاسوسِ آبلہ
اس دشت میں جو ہیں علم آراے عاشقی　باندھے پھریں ہیں پانو سے وہ کوسِ آبلہ
چھاتی پہ کس کا دستِ گہر پوش تھا کہ رات　ہوتا ہے مجھ کو خواب میں کابوس[2] آبلہ
کانٹے ہمارے پانو کے محرم ہوئے دریغ　کھودی جنوں نے حرمتِ ناموسِ آبلہ

1- جدل = جھگڑا، بحث　2- کابوس = خواب میں ڈرنا

پاؤں کو لتّے باندھ کے کرتے ہیں سیرِ دشت ہے جن کو پاسِ حرمتِ ناموسِ آبلہ
دل بت کدہ نہیں ہے تو رہتا ہے کس لیے ہر صبح دستِ نالہ میں ناقوسِ آبلہ
کس روے دل فروز کا ہے دیدباں فلک چھوڑے ہے اختروں سے جو جاسوسِ آبلہ
نشتر لگا جو دل پہ تو وہ بھی ٹپک پڑا یک قطرہ خونِ گرم تھا محبوس آبلہ
گو یہ زمیں ہے سخت بہت لیک مصحفی
پاے قلم کو کر نہ تو پا بوسِ آبلہ

382

ہے کس کی شمع حسن یہ مانوسِ آبلہ؟ دریا میں ہر حباب ہے فانوسِ آبلہ
باجے ہے ناؤں ان کا ہی ملکِ جنوں کے بیچ رکھتے ہیں دوشِ خار پہ جو کوسِ آبلہ
نازک مزاج عشق کو گلگشتِ باغ میں سبزے کی نوک ہووے ہے محسوسِ آبلہ
ہیرے کی اُربسی[1] ہے جو چھاتی پہ یار کی رکھتی ہے مجھ کو خستۂ کابوسِ آبلہ
منزل کو ہم جو پہنچے تو پہنچی نہ اپنے ساتھ غیر از متاعِ حسرت و افسوس آبلہ
اب اس غزل پہ دورِ سہ نوبت ہے مصحفی
ڈنکے سے تو قلم کے بجا کوسِ آبلہ

383

کعبہ کرے تھا جن کا قدم بوس آبلہ در در لیے پھریں ہیں وہ ناموسِ آبلہ
ہم دل کے بت کدے سے چلے لے کے ارمغاں زنّار آہ و شیشۂ ناقوسِ آبلہ
صحرائیانِ عشق کا عالم ہی اور ہے رکھتے ہیں پاے سعی کو پابوسِ آبلہ
اس پاے تختِ دل پہ کرے ہے سدا جلوس کے[2] داغ کا کبھی، کبھی کاؤسِ[3] آبلہ
یہ قافلہ کہ بت کدۂ چیں ہے، حاجیو جو دستِ ہر جرس میں ہے ناقوس آبلہ

1- اربسی = گلے میں پہننے کا زیور، ہنسلی 2- کے = کیقباد، ایرانی بادشاہ کا نام
3- کاؤس = قدیم بادشاہ کا نام

گر خسروِ جنوں میں سخت کی خو نہ ہو　　قلّاشِ[1] خار پائے نہ ملبوس آبلہ
وہ موتیا[2] انار ہے اس آہ گرم کا　　بنتا ہے جس کے دود سے طاؤسِ آبلہ
وہ دن گئے کہ دشت تھا اور نوکِ خار تھی　　اب سنگ رہ کریں ہیں زمیں بوسِ آبلہ
مشکل ہے وقفہ دم کا مسافر کو مصحفی
جس رہ میں پیش جائے نہ ساؤسِ آبلہ

384

جاؤ جی ہم کو آرزو نہیں کچھ　　تم سے زنہار گفتگو نہیں کچھ
دشمنی کا نہ کیجیے اس کی خیال　　دوست پھر دوست ہے عدو نہیں کچھ
جان بلبل کی عشقِ گل میں گئی　　آہ سودائے رنگ و بو نہیں کچھ
گر تو دے ڈالے ہم کو اک بوسہ　　چیز یہ تیرے رو برو نہیں کچھ
وصل کی شب نصیب ہووے کہیں　　اس سوا اور جستجو نہیں کچھ
طرفہ شورش کدہ ہے مے خانہ　　کہ جہاں غیرِ ہائے و ہو نہیں کچھ
مصحفی اب تو ترک سودا کر
کنج عزلت ہے، چار سو نہیں کچھ

385

نرگسِ باغ سے مانگے ہے گرو آپ کی آنکھ　　یہ وہی جا ہے کہ بیٹی پہ پڑے باپ کی آنکھ
نہ ستاروں سے ہے دعویٰ اسے ہم چشمی کا　　روکشِ ماہ ہے گھوڑے کی ترے ٹاپ کی آنکھ
خوں سے کس کشتے کے سرخ اس کو کیا تھا تو نے　　جو رہے ہے تری خنصر[3] ہی پہ اب جھانپ[4] کی آنکھ؟
تو نے گو غیر کے آنے کو چھپایا، پہ تری　　خود ہے غمّازِ شبِ وصل کی، چپ چاپ کی آنکھ

1- قلّاش = مفلس　2- موتیا انار = آتشبازی کی ایک قسم
3- خِنصر = ہاتھ کی چھوٹی انگلی　4- جھانپ = ایک سرخ رنگ کا پرندہ

مصحفی صوت[1] سے اپنی جسے ہو سرخیِ چشم
تاب پھر لاوے بھلا کیونکہ وہ اس تھاپ کی آنکھ

386

چستی سے تو کمر پئے رفعِ گزند باندھ
دیتے ہیں عضوِ مار گزیدہ پہ بند باندھ

بلبل سے کہہ صبا، کہ ہوا اس برس ہے بند
مت آشیانہ بر سرِ شاخِ بلند باندھ

قاتل سوار پھر کبھی مقتل سے کر گزر
خوں سے حنائے عیش بہ پائے سمند باندھ

موئے میاں پہ رحم کر آخر خدا سے ڈر
تیغا کمر سے اپنی، نہ اے خود پسند باندھ

گر شانہ کھول دیوے ہے اُس زلف کی گرہ
بالوں میں دل لپیٹے ہے وہ اور بند باندھ

تو اُس سپند سوز[2] کے قابل بھی ہے بھلا
پرویں گرہ میں اپنی نہ مشتِ سپند باندھ

شیریں تر اس سے بھی غزل اک اور مصحفی
لکھ جا تو، اور پارۂ کاغذ میں قند باندھ

387

زیں چرمِ شیر کا تو بہ پشتِ سمند[3] باندھ
جائے زمام[4] زلفِ پری کی کمند باندھ

جلاد آسماں نے دیے کاٹ کاٹ کر
سر سیکڑوں، بہ کنگرِ قصرِ بلند باندھ

کب خون روئے ہجر میں ہم اُس نگار کے
یہ باندھنو[5] تو ہم پہ نہ دستار بند باندھ

برباد دے نہ تجھ کو کہیں تیری یہ ہنسی
اے گل ٹک اس چمن میں لب ہرزہ خند[6] باندھ

صحرائے چیں میں جا کے لے آیا وہ شہ سوار
صد ناقہ ہائے چیں بہ عیالِ سمند باندھ

دیکھے جو آنکھ اُٹھا کے تو کیا دور گروہ شوخ
تارِ نظر سے رکھے ہوا میں پرند باندھ

کس آتشیں جمال کا رمّال[7] کو ہے دھیان
کاغذ میں نقطوں کے جو رکھے ہے سپند باندھ

1- صوت = آواز 2- سپند سوز = نظر اُتارنے والا 3- سَمند = گھوڑا 4- زمام = لگام
5- باندھنو = الزام، تہمت 6- ہرزہ خندہ = ٹھٹھول کرنے والا 7- رمّال = فال دیکھنے والا

اب تیسری غزل بھی لکھ اور اس میں مصحفی
مضمون تازہ مثل کمالِ خجند [1] باندھ

388

اے آہ دستِ بدعتِ چرخِ پرند باندھ — دے نالہ جا گلوے زحل میں کمند باندھ
گلیوں میں سارے شہر کی پھیرا، [2] جفا تو دیکھ — لاشے کو میرے اس نے بہ پاے سمند باندھ
گلشن میں برق دستۂ سنبل پہ جا پڑی — جوڑا دیا جو اس نے بہ زینِ کمند باندھ
اے آہ ناتواں شرر افروزِ نالہ ہو — عقدِ [3] بر آوری نہ بہ دودِ سپند باندھ
گر شیخ جی اُٹھیں تو تماشا ہو، فرش سے — دامن گیا ہے اُن کا وہ طفلِ لوند [4] باندھ
خسرو کا دل چلا ہے نہانے کو آب میں — شیریں کمر سے تو بھی تو کچلی پرند باندھ

رہنا بھلا نہیں ترا اس کو میں مصحفی
رختِ سفر تو یاں سے اب اے دردمند باندھ

389

ہم قلہ ہے ہم سمند ہے یہ — ہم شعلہ ہے ہم سپند ہے یہ
کیا تجھ سے کہوں میں اس کی قیمت — خود قیمت نہ کمند ہے یہ
ہے ہر کفل [5] اس کا قلّۂ [6] کوہ — قامت کا زبس بلند ہے یہ
جوزا کو کہیں ہیں اہلِ معنی — اس رخش کا پیش بند ہے یہ
دیکھ اس کی شرارتیں کہے ہے — بجلی کہ بڑا لوند ہے یہ
دیکھے ہے صبا جو اس کی سر پٹ — کہتی ہے کہ دکھ دھند ہے یہ

کیا مصحفی لکھے وصف اس کا
نوّاب کی خود پسند ہے یہ

1- کمال خجند = فارسی کا شاعر 2- پھیرا = پھرایا، گشت کرایا 3- امید پوری ہونے کی گرہ، جیسے مزاروں پر مراد کا دھاگا باندھ دیتے ہیں۔ 4- طفلِ لوند = آوارہ، شریر لڑکا 5- کفل = سُرین
6- قلّہ = چوٹی

ی

390

میلانِ طبیعت نہ مرا گل کی طرف ہے — اور ہے بھی تو ہاں نالۂ بلبل کی طرف ہے
ہو عہدہ برآ کیونکے صبا دیکھیے اس سے — کہتے ہیں تری زلف بھی سنبل کی طرف ہے
ہر بات ہے بے ساختہ اُس شوخ کی، وہ تو — نے لطف کی جانب نہ تغافل کی طرف ہے
آئینے میں دیکھے تو ہے وہ سبزۂ خط کو — لیکن نگہِ کج خمِ کاکل کی طرف ہے

اے مصحفی کیا چاہی ہے دیکھیں تو خدا نے
ان روزوں مزاج اپنا توکل کی طرف ہے

391

گر پاس مرا کچھ بھی ہو محبوب کو میرے — پرزے نہ کرے پڑھ کے وہ مکتوب کو میرے
گلشن میں کبھی آؤ تو ہم کو بھی بلاؤ — کہہ دیجو، صبا سرو خوش اسلوب کو میرے
یوسف نے کہا مجھ پہ جو کچھ دشت میں گزری — یہ بات نہ کہیو کوئی یعقوب کو میرے
صابر مجھے دیکھا جو بلاؤں میں تو بولا — کوئی جا کے بلا لائیو ایوب کو میرے
واں مردمِ سالک اسے سمجھیں ہیں دوانا — یاں جذب ہے کچھ اور ہی مجذوب کو میرے
کیا کیا نہیں ہنگامہ ہر اک شعر میں برپا — ٹک دیکھ تو دیوانِ پُر آشوب کو میرے
میں آپ ہی مطلوب ہوں اور آپ ہی طالب — کیا سمجھے کوئی طالب و مطلوب کو میرے

کیا کام تجھے مصحفی میں خوب ہوں یا بد
وہ خوب سمجھتا ہے بد و خوب کو میرے

392

آپ جب ترکِ محبت کیجیے — طالعوں کی کیا شکایت کیجیے

آشِ[1] رنگینِ فقیراں ہے یہی خونِ دل پر ہی قناعت کیجیے
دل لگانے کی نہ کہیے، دوستو دل چھڑانے کی حکایت کیجیے
آپ ہی کر دیجیے اس کو خفا تس پہ پھر آپھی سماجت کیجیے
پیچھے پیچھے آیئے گھر تک مرے اک دن اتنی تو مروت کیجیے
جب تلک بیٹھے رہیں گے در پہ ہم آپ غیروں سے فراغت کیجیے
چھوڑ دیجے بت پرستی مصحفی
اب تو چندے حق کی طاعت کیجیے

393

لکنت کرے ہے ہر دم منھ میں زباں جرس کی کس طرح با اثر ہو، یارو فغاں جرس کی
محمل نشیں سے تیرے، ہے قیس وہ بھی نالاں فریاد کیوں نہ جاوے تا آسماں جرس کی
کی قافلے نے شاید رستے ہی میں فروکش[2] آواز آج گم ہے اے ہم رہاں جرس کی
اس قافلے سے شاید کوئی پیچھے رہ گیا ہے ہر دم ہے یوں الولک[3] جو سر زناں جرس کی
ہے ہوش و گوش تجھ کو محمل نشیں تو اک دم نالے کے ساتھ میرے کر امتحاں[4] جرس کی
جانے دو قافلے کو، ہم رہ کے ٹک چلیں گے آواز اب لگے ہے دل پر گراں جرس کی
کوئی دہاں دریدہ گو ہم فغاں ہو میرا
اے مصحفی ہے اتنی طاقت کہاں جرس کی

394

تم اس سے خوش ہو جس سے تمھاری بنی رہے کیا اس کا تم کو غم جو مجھے جاں کنی رہے
موبافِ سرخ جعد سے کھولو کہاں تلک پیچھے پڑی ہی سانپ کے یہ بامنی[5] رہے

1- آش = شوربا 2- فروکش = پڑاو 3- الولک = جرس کی خاص آواز
4- امتحاں کو مونث باندھا ہے 5- بامنی = سانپ کے خاندان کا چھوٹا سا جانور

یوں گردِ چشم تو مرے لختِ جگر ہیں جمع — ایسن پہ جوں مدار کے آمیدنی رہے

قاتل خدا کے واسطے اُٹھوا ہماری لاش — مٹی میں اور لہو میں کہاں تک سنی رہے

وہ چار چند حسن میں گر ہے تو چاہیے — چاہ اُس کی اپنے دل میں بھی نت چوگنی رہے

جیسا یہ نخلِ قد ترا نازک نہال ہے — ایسی ہی یہ کمر بھی تری کامنی[1] رہے

اتنا تو چاہیے کہ ہر اک شوخ چشم سے — مجلس میں میرے آگے نہ چشمک زنی رہے

آزادگانِ کوچۂ جاناں سے یہ کہو — ایسے مقام میں نہ فنا و فنی رہے

وے شہ سوار ہم نہیں اے ابلقِ[2] سپہر — ہرگز ہمارے ساتھ نہ یہ توَسنی[3] رہے

ہم فن ہی جب حریف ہو ہم فن کا مصحفی
باہم کہاں سے رابطۂ ہم فنی رہے

395

جو دیکھ کے صورت کو تری جی سے گزر جائے — افسوس ہے پُرسے[4] کو بھی تو اُس کے نہ گھر جائے

ایامِ جدائی ہی میں اے شدّتِ گریہ — ایسا نہ ہو پیمانہ مری عمر کا بھر جائے

کیا کہیے جو قسمت کی بدی اُس کو نہ کہیے — قاتل مری چھاتی پہ چڑھے اور اُتر جائے

کس طرح سے دیکھوں کہ تری زلفِ پریشاں — گہ دوش پر آکر گرے گہ تا بہ کمر جائے

اے بختِ سیہ، سیر تو تب ہے جو کسی طرح — اُس تک بھی مرے راتوں کے رونے کی خبر جائے

مجھ سا ہی جو آوارہ و سرگشتہ ہو تیرا — نکلے ترے کوچے سے تو پھر آہ کدھر جائے؟

کوچے میں ترے خونِ شہیدانِ وفا سے — ہے تختۂ گلزار جہاں تک کہ نظر جائے

ہم ہیں وہ بلا دوست کہ ہم بے خطروں کی — کشتی بھی ادھر جائے جدھر موجِ خطر جائے

اے مصحفی اچھا تو ہے اس بحر میں گر تو
ایسی ہی غزل ایک رقم اور بھی کر جائے

1- کامنی = نازک 2- ابلق = سفید و سیاہ داغ والا گھوڑا 3- توَسنی = گھوڑے کا بچہ جو تند خو اور شوخ اور سرکش ہو 4- پُرسے = تعزیت

396

یاں مجھ پہ جدائی میں جو گزرے سو گزر جائے
پر یہ نہ ہو اُس تک مرے مرنے کی خبر جائے

ہیں آبِ حیات اس کے لبِ لعل ولیکن
گر خضر بھی دیکھے انھیں اک بار تو مر جائے

اے کاشکے رستے کے تئیں چھوڑ کے ناقہ
مجنوں ہے جدھر چشم بِرہ اس کا، ادھر جائے

کیونکر نہ ثریا کی وہاں گرد ہوں آنکھیں
جوڑے سے لپیٹے وہ جہاں سلکِ گہر جائے

آئینہ نہ رکھ سامنے میں کیونکے یہ دیکھوں
سینے کی صفائی پہ تری میری نظر جائے

ہے جی میں، کروں ہدیہ گل مشتِ پر اپنے
گر اب کے گلستاں کی طرف بادِ سحر جائے

جاتا ہے پسِ قافلہ کہتا ہوا مجنوں
یا رب یہ کہیں ناقہ مغیلاں[1] میں ٹھہر جائے

کیا شانۂ یک دست کو مشکل ہے کہ مشکیں
بالوں کو اگر جمع کرے زلف بکھر جائے

تنہائی میں گزرے ہے قلق کاش وہ دن ہو
یا رب کوئی دل لے کے مرا مجھ سے مکر جائے

ہے آہوئے دل صید ترا، ہٹ کے لگا ہاتھ
دامن کا ترے پاٹ کوئی خوں سے نہ بھر جائے

کرتا ہے خلش پہلو میں دل، کاشکے کوئی
اس دل کے عوض ریزۂ الماس کو دھر جائے

افسوس تو یوں غیر سے ہو گرمِ محبت
اور مصحفیِ خستہ ترے جی سے بسر جائے!

397

داد خواہوں کی ترے کو میں دُہائی کب تھی
واں تلک اُن کو مری جان رسائی کب تھی

تھا جدائی میں بھی دن رات ترا محوِ خیال
سچ تو یہ ہے کہ مجھے تابِ جدائی کب تھی

ناز سے وہ سرِ خنصر کو ڈبویا تھا کبھو
پور پور اس کی مرے خوں میں حنائی کب تھی

مجھ سے بیزار تھے تم اور میں تم سے لیکن
میرے اور آپ کے یہ بچ[2] یہ لڑائی کب تھی

تیرے بیمار کو یاں تک تو غشی تھی، اس نے
یہ نہ جانا کہ شبِ غم اجل آئی کب تھی

اب تو ٹکراتی ہے جا جا کے فلک پر مری آہ
یوں ستاروں کے مقابل یہ ہوائی[3] کب تھی؟

1- مغیلاں = کیکر کے درخت 2- بچ = جھڑپ، نوک جھونک (روزمرہ)

3- ہوائی = آتشبازی، نری

چھوٹ کر دام قفس سے جو چمن تک پہنچی　　بولی بلبل مجھے امیدِ رہائی کب تھی

مصحفی صیقلِ بیداریِ شب کا ہے یہ فیض
ورنہ آئینۂ دل میں یہ صفائی کب تھی

398

شب وہ آیا تھا لگا کر کے دوا آنکھوں سے　　شاید اب تک نہیں آشوب گیا آنکھوں سے
آج پہلو نظر آتا ہے مجھے خالی ہائے　　سیلِ خوں ہو کے مگر دل بھی بہا آنکھوں سے
حسن پر اپنے یہ مفتوں ہے کہ آئینے کو　　نہیں کرتا ہے وہ اک لحظہ جدا آنکھوں سے
وہ بھی کیا دن تھے کہ ہم راتوں کو چوری چوری　　اُس کے پاؤں کی چھڑاتے تھے حنا آنکھوں سے
جس کو چاہا اُسے اس شوخ نے اک آن کے بیچ　　زلف سے باندھ لیا قتل کیا آنکھوں سے
جب تلک آنکھیں ہیں، ہے حسن پرستی کا مزہ　　اس کو کیا لطف جو معذور ہوا آنکھوں سے
گرچہ سو بار میں دیکھا ہے اُنھیں پر اس کی　　اب تلک ٹپکی ہی پڑتی ہے حیا آنکھوں سے
سامنے آکے نہ صید اس کے گیا پھر جیتا　　صفِ مژگاں میں گھرا وہ جو بچا آنکھوں سے

مصحفی دیکھ سکوں ان کو مرا کیا مقدور
الاماں مانگے ہے جس بت کی قضا آنکھوں سے

399

کل اُس کے ہاتھ میں جو عنانِ سمند تھی　　تا اوج چرخ آہِ سواراں بلند تھی
کیا جانے ہو گیا تھا مجھے فصلِ گل میں کیا　　ان روزوں خود بہ خودمری وحشت دوچند تھی
یہ تو نے کس کو قتل کیا تھا کہ ساری رات　　فریادِ الاماں تری کو سے بلند تھی
تھا اُس کی جعد میں جو مبافِ زری لگا　　بس اُس مباف ہی سے وہ زریں کمند تھی
لیلیٰ تباہ ہو گئی مجنوں کے عشق میں　　سچ پوچھیے تو وہ بھی عجب دردمند تھی
شکوہ ہمیں نت اُس کے نہ ملنے ہی کا رہا　　از بس مزاج[1] حسن کی خود دکھ دھند تھی

1- مزاج کو مونث باندھا ہے

بالیں پہ مصحفی کے گیا میں جو وقتِ نزع
آنکھوں سے کچھ کہے تھا زباں اُس کی بند تھی

400

جن دنوں خونِ جگر ہی پہ معاش اپنی تھی — غیر ڈھونڈیں تھے اُسے، ہم کو تلاش اپنی تھی
کر کے چورنگ[1] مجھے یاروں سے بولا قاتل — تم نے کچھ غور سے دیکھا یہ تراش اپنی تھی
ساری لاشوں سے جدا کر کے جو پھنکوائی ہے آہ — یارو تم جانو یقیں اُس کو، یہ لاش اپنی تھی
خونِ دل کھائیں تھے فرقت میں کئی رنگ سے ہم — یعنی شش رنگیِ صورت یہی آش اپنی تھی
نزع کے وقت تو آ تا مری بالیں پہ وہ شوخ — یہ ہوس، اے نفسِ سینہ خراش اپنی تھی

غیر رہتا ہے پڑا اس کی گلی میں جس جا
مصحفی یاں بھی کبھی جائے فراش اپنی تھی

401

جو بام سے وہ پری رُو نہ سر بلند کرے — بھلا یہ روزنِ دیوار تو نہ بند کرے
کرے ہے خاک مری ذرہ ذرہ جورِ فلک — کہ آگ پر انھیں ذروں کو پھر سپند کرے
فغاں ہے شب کو تو ہے دن کو گریہ و زاری — خدا کسی کو نہ ایسا بھی دردمند کرے
بڑھاؤ اتنی بھی داڑھی نہ شیخ صاحب تم — کہ شانہ دیکھتے ہی جس کو ریش خند[2] کرے
ترانۂ گل و مُل مجھ کو مت سنا مطرب — مباد پھر مری وحشت کہیں دوچند کرے
یہ سرنوشت میں لکھا تھا میری، اے صیاد — کہ لا کے تو مجھے کنجِ قفس میں بند کرے

غزل اک اور بھی اے مصحفی سناؤں تجھے
بشرط آنکہ تو سن کر اسے پسند کرے

402

فرشتہ دیکھ کے تجھ کو نہ چشم بند کرے — تو منھ کو کھولے تو تجھ پر پری سپند کرے

1- چورنگ = چار ٹکڑے 2- ریش خند = مذاق اڑانا، ٹھٹھا

میں اس امید پہ بیٹھا ہوں کوئے خوباں میں — کہ بام سے کوئی مہ پارہ سر بلند کرے
پیارے اس لبِ شیریں کا گر میں بوسہ لوں — تو غیر دیکھ طرف میری زہر خند[1] کرے
یہ آرزو ہے بناوے مجھے کمالِ خجند — اگر خدا تجھے شہزادۂ خجند[2] کرے
عجب نہیں ہے درازی سے ان کی گروہ پری — ہر ایک موے سر اپنے کو لے کمند کرے
مصاحبوں کو بٹھاوے ہے دائیں بائیں یار — کہ درد و رشک کو دل میں مرے دوچند کرے

میں جانوں جب تجھے اے مصحفی جو پھر اب کے
اسی زمین میں جولاں[3] ترا سمند کرے

403

فغاں کروں تو کوئی میرے منھ کو بند کرے — بھلا بتاؤ تو پھر کیا یہ دردمند کرے
حجابِ عشق کا مارا ہوا ترے آگے — نہ سر اُٹھاوے نہ گردن ذرا بلند کرے
نقاب اُٹھاوے جو مکھڑے سے اپنے تو شب ماہ — تو چرخ خوشۂ پرویں کو لا سپند کرے
یہ دار پر سرِ منصور رکھ کے بولی قضا — خدا ہمیں بھی تری طرح سر بلند کرے
گر اپنی جعد کو بل دیوے وہ بہ ناز و ادا — تو قصد گردنِ رستم کا یہ کمند کرے
کماں کی طرح گرا ہو کوئی تو آخرکار — زمانہ زخم نصیب اُس کا بند بند کرے
دکھاؤں میں تری تصویر پیرِ کنعاں[4] کو — پہ ڈر ہے یہ نہ کہیں اس کو وہ پسند کرے

نہ ناصحو کہو کچھ اس کو مصحفی وہ نہیں
کہ ترکِ الفتِ خوباں بہ وعظ و پند کرے

404

مسی نہیں وہ دانتوں پر انگشت کے تلے — نیلم سے ہے نہاں گہر انگشت کے تلے
انگشت سے اس آبلۂ دل کو میں نے رات — دابا تو آ گئے شرر انگشت کے تلے

1- زہر خند = حقارت کی ہنسی 2- خجند = ایران کا ایک شہر 3- جولاں = رفتار، گھومنا
4- پیرِ کنعاں = مراد حضرت یعقوب علیہ السلام

طغیانِ گریہ سے مرے دریائے خوں رواں کف الخضیب[1] کے ہے ہر انگشت کے تلے
مت کہکشاں کے نیچے رہ اس لاغری پہ تو ہے جسمِ مور کو خطر انگشت کے تلے
سبابہ[2] اس نے رکھی تھی جس شب عذار پر اُس شب دو نیم تھا قمر انگشت کے تلے
پنجے میں جن کے زور ہے کیا ان سے دور ہے گر توڑ ڈالیں رکھ سپر انگشت کے تلے
پوچھا جو جبہۂ عرق آگین یار نے لاکھوں ہی پس گئے گہر انگشت کے تلے
انگلی رکھی دہن پہ جو اُس نے تو آ گیا چشمہ حیات کا نظر انگشت کے تلے
دیکھی جو نبض میں ترے محرورِ[3] عشق کی رکھے تھی آگ کا اثر انگشت کے تلے

میل[4] قلم کو اور دبا مصحفی کہ آج
آیا ہے بارِ غم کا سر انگشت کے تلے

405

جس رستے سے وہ رشک پری ہو کے چلے ہے ہر نقشِ قدم کبک دری ہو کے چلے ہے
خس پوش ہیں اس رہ میں کنویں اور تو غافل نت مستِ مے بے خبری ہو کے چلے ہے
کم لختِ جگر سے نہ سمجھ خون کے آنسو مونگا یہ عقیقِ جگری[5] ہو کے چلے ہے
آوے ہے ترے کوچے میں جو چشمِ کرم رکھ آخر وہ وہاں سے نظری[6] ہو کے چلے ہے
اے بادِ سحر غنچے سے کہہ دیجیو اتنا چلنا ہے تو کل گل سفری ہو کے چلے ہے
شانہ اسے کج رہنے میں کرلیوے ہے سیدھا زلف اس کی جو کج اس سے ذری ہو کے چلے ہے

جب باغ میں جاتا ہوں تو اے مصحفی یہ آہ
ہم دوشِ نسیمِ سحری ہو کے چلے ہے

406

اس سے جب وقتِ ملاقات بگڑ جاتی ہے کیا کہوں بن کے مری بات بگڑ جاتی ہے

1- کف الخضیب = دست حنابستہ 2- سَبّابہ = ہاتھ کی چوتھی انگلی 3- محرور = تپ زدہ، جسے حرارت ہو
4- میل (بروزن نیل) سَلائی 5- عقیقِ جگری = سرخ رنگ کا عقیق 6- نظری = نظر انداز کیا ہوا

چشمِ گریاں سے مری گل گئے مزرع[1] لاکھوں　　یہی ہوتا ہے جو برسات بگڑ جاتی ہے
دن کو ہو جاوے ہے کیا جلوہ گری انجم کی　　یک بیک کیوں یہ طلسمات بگڑ جاتی ہے؟
تھی تری زلف کل آشفتہ بہت شانے پر　　ایک دن دیکھیو یہ رات بگر جاتی ہے
مجھ پہ کیونکر نہ ہنسے خلق کہ ہوتا ہے یہی　　جب کسی شخص کی اوقات بگڑ جاتی ہے
مصحفی کیوں نہیں کھاتا ہے تو اس کی دشنام
گالیاں کھانے سے کیا ذات بگڑ جاتی ہے؟

407

میری سی تو نے گل سے نہ گرا ے صبا کہی　　میں بھی لگا دوں آگ گلستاں کو تو سہی
گو صبح دور ہے شبِ ہجراں کی لیک تو　　اپنی طرف سے تو نہ کر اے نالہ کوتہی
ظالم پھرا مزاج نہ تیرا غرور سے　　انصاف کر تو میں تری کیا کیا جفا سہی
لطموں[2] سے بحرِ حسن کے ہے زلف کا یہ رنگ　　لہروں میں جیسے پھرتی ہو ناگن بہی بہی
اللہ رے رعبِ حسن کہ اس بت کے سامنے　　آئی جو بات دل سے زباں پر وہیں رہی
ہم اس فریق میں نہیں، وہ اور لوگ ہیں　　دنیا کے نیک و بد سے جو رکھتے ہیں آگہی
صد آفریں کہ بحر میں سودا کی مصحفی
اک تو نے آب دار غزل اور بھی کہی

408

سیرِ چمن میں تم سے کرے غیر ہم رہی　　یوں آپ کے مزاج میں آیا تو یوں سہی
دریائے حسنِ گل نے یہ مارا ہے اب کے جوش　　موجِ نسیم پھرتی ہے جس میں بہی بہی
آتا ہے دید میں بدن اس گل کا بے حجاب　　چسپاں ہے بسکہ نیمۂ شبنم کی یک تہی
ہم جی ہی جی میں جل کے ہوئے ڈھیر خاک کا　　تو بھی تو جی کی اپنے کسی سے نہ کچھ کہی

1- گل گئے مزرع = کھیتیاں خراب ہو گئیں　2- لطمہ = تھپیڑے

آیا نہ وقتِ نزع بھی وہ بے وفا دریغ — ہر چند میرے حال سے رکھتا تھا آگہی
صیّاد سے کہو کہ ذرا ہم کو چھوڑ دے — کرنے لگی ہے طاقتِ پرواز کوتہی
کیا کیا شبِ وصال میں لایا ہے مجھ پہ ظلم — کہنا وہ اس کا اُٹھ کے کہ اب رات کم رہی
میں ہوں گدائے کوے بتاں مجھ کو مصحفی
نے مال و جاہ چاہیے، نے منصبِ شہی

409

شب ہم کو جو اُس کی دھن رہی ہے — کیا جی میں اُدھیڑ بن رہی ہے
مجنوں سے کہو کہ "ماں کے لیلیٰ — خاطر تری طعنے سن رہی ہے"
پروانہ تو جل چکا ولے شمع — سر اپنا ہنوز دھن رہی ہے
پہلو سے اُٹھا مرے نہ غبغب — یہ پوٹلی درد چُن رہی ہے
یہ آہ پہ لختِ دل جلے ہیں — یا سیخ کباب بھن رہی ہے
رکھوں نہ عزیز داغِ دل کو — پاس اپنے یہی تو ہُن[1] رہی ہے
اے مینھ نہ برس کہ مصحفی کی
چھت گھر کی تمام گُھن رہی ہے

410

جب آگ محبت کی دل و جان میں پھونکے — یہ عشق ہے چاہے جسے اک آن میں پھونکے
صیّاد سے کہہ دو کہ یہ بلبل کا قفس ہے — پھونکے تو اسے گل کے خیابان میں پھونکے
لے جاتی ہے پروانے کو ہر دم کششِ عشق — لے جا کے اسے تا کہ چراغان میں پھونکے
سینے کی صفائی کو اگر دیکھے تو وہ گل — پڑھ پڑھ کے درود اپنے گریبان میں پھونکے
سرگوشی کی رخصت تو نہ دے غیر کو، ناداں — کچھ پڑھ کے فسوں تا نہ ترے کان میں پھونکے

1- ہُن (سونا) دولت = اسے مونث باندھا ہے

ممنونِ ہوا داریِ صیاد ہو بلبل یہ مشتِ پراس کے جو گلستان میں پھونکے
کیا خلق سے پنہاں ہے مری آہ کی گرمی گھر لاکھوں کے اُس نے شبِ ہجران میں پھونکے
وہ کشتۂ بے کس ہوں، کوئی لاش کو جس کی بستی میں جلاوے نہ بیابان میں پھونکے
اے مصحفی اک ریختہ لکھ اور تو ایسا
جو لکھتے ہی آتش ترے دیوان میں پھونکے

411

مطرب بچہ گر لب کا فسوں تان میں پھونکے کیا جانیے کیا آگ مری جان میں پھونکے
اس عشق کی آتش کا برا ہووے کہ جس نے زندانیِ الفت سبھی زندان میں پھونکے
کیا دور جو ہونٹوں کی ترے پان کی سرخی آتش جگرِ لعلِ بدخشان میں پھونکے
گذرے جو مری لاش سے وہ رشکِ مسیحا اک روح نئی قالبِ بے جان میں پھونکے
روشن ہو اگر عشق کی آتش کا فتیلہ سو دیو پری بس وہیں اک آن میں پھونکے
دم دیوے جسے وصل کا تو پھر وہ دوانا گھر بار سب اپنا ترے ارمان میں پھونکے
شاعر وہی اے مصحفی جو مرغِ معانی
پھڑکانے کو یوں عشق کے میدان میں پھونکے

412

گرے جو اس کی نظر سے تو پھر کہاں کے ہوئے نہ ہم زمیں کے ہوئے اور نہ آسماں کے ہوئے
قفس سے جھانک ہی لیویں گے گل کو اب کے برس جو رخنے بند نہ دیوارِ گلستاں کے ہوئے
ہے جائے شکر کہ اس ناکسی پہ ہم سے لوگ تری گلی میں سزاوار امتحاں کے ہوئے
عجب نہیں ہے کہ بلبل کی ہووے نشو و نما کہ اس ہوا میں ہرے خار آشیاں کے ہوئے
نظر سے ناقۂ لیلیٰ یہ ہو گیا غایب کہ لوگ ہر طرف آوارہ کارواں کے ہوئے
متاعِ حسن کے تودے لگے جہاں دیکھے ہم ایک بار خریدار اُس دکاں کے ہوئے

ہزار شکر کہ ان گل رخوں کی مجلس میں — گئے تو ہم پہ نہ شرمندہ برگِ پاں کے ہوئے
گلی میں اُس کی جو ہم مر گئے تو بعد از مرگ — سگ و ہُما میں کئی حصے استخواں کے ہوئے
بلیغِ دہر ہے اے مصحفی تو لاشک و ریب
جو تھے فصیح وہ بندے تری زباں کے ہوئے

413

اگرچہ تجھ سا زمانے میں دلربا کم ہے — یہی ہے عیب، کہ تجھ میں میاں وفا کم ہے
لباسِ سرخ کا رکھتے ہو تم جو شوق، میاں — ہمارے قتل کو کیا سرخیِ حنا کم ہے؟
سلوک سب سے بظاہر ہیں آشنائی کے — ولیک دل سے کسی کا وہ آشنا کم ہے
میں اِس ادا کا ہوں کشتہ کہ جب وہ آئے بہ بام — کہے ہے ناز سے یاں آج کچھ ہوا کم ہے
کسی کو چاہو نہ کوئی کہ حد برا ہے یہ درد — دیارِ عشق میں اس درد کی دوا کم ہے
مجھے یہ ڈر ہے کہ باہم بگڑ نہ جائے کہیں — وہ شوخ چشم ہے اور مجھ میں بھی حیا کم ہے
کہے ہے کشتے سے اپنے وہ وقتِ خوں طلبی — کھڑا ہوں سر پہ میں تیرے، یہ خوں بہا کم ہے؟
ز بسکہ کہ جی پہ گوارا کیا ہے زہرِ فراق — ہمیں بھی اس کے نہ ملنے کا اب گلا کم ہے
ادا میں ہنسنے کی تیرے ہے لاکھ طرح کا ناز — ہنسی ہے گل کی، ولے اس میں یہ ادا کم ہے
ہر ایک پارے میں اس کے ہے جامِ جم کا ظہور — دلِ شکستہ بھی میرا کسی سے کیا کم ہے
میں مصحفی نہ کروں کیونکے اپنی مدح و ثنا
کہ فنِ شعر میں کوئی مجھ سا دوسرا کم ہے

414

تو جو کہتا ہے "میں گھر جاؤں" یہ گھر کس کا ہے؟ — جائیو صبح کے ہوتے، تجھے ڈر کس کا ہے؟
گرچہ ہے رہ گزرِ خلق وہ کوچہ اس میں — کوئی پوچھے تو سوا میرے گزر کس کا ہے
اور بھی آتے ہیں مقتل سے ہزاروں قاتل — دامن اس طرح بھلا خون میں تر کس کا ہے

تیر میں اپنے پرو کر وہ جگر کو میرے مجھ سے کہتا ہے "بتا تو یہ جگر کس کا ہے؟"
میں ہی جھیلوں ہوں سدا ابرو کی تلواروں کو اور یاں میرے سوا سینہ سپر کس کا ہے؟
بھولا بھٹکا کوئی آ نکلے ہے ہمسایے کبھی کوچۂ عشق میں سچ ہے کہ گزر کس کا ہے؟
سوتے سے چونک پڑا مصحفی میں اس کو میں
شب جو ٹھکرا کے کہا اُس نے "یہ سر کس کا ہے؟"

415

شاد کس روز ترے حلقۂ زنجیر میں تھے ہم تو نت اس سے نکل جانے کی تدبیر میں تھے
آنکھ تا دیر لگائے میں رہا کاغذ سے بسکہ باریک دقیقے تری تصویر میں تھے
دیکھ کر تیغ قضا نے مجھے منہ موڑ لیا کہ مرے قتل کے جوہر تری شمشیر میں تھے
پھول سا دل میں لگا آن کے اُس کا پیکاں بسکہ انداز نزاکت کے ترے تیر میں تھے
اُس کی تصویر جو مانی نے لکھی کاغذ پر کچھ عجب طرح کے جلوے ترے نخچیر میں تھے
وامق و کوہ کن و قیس کا غم مت پوچھو داغ ان یاروں کے یعنی مری تقدیر میں تھے
مصحفی سر سے جو اپنے نہ ٹلی ذلتِ عشق
ہم بھی ماخوذ مگر اک قہر خدا گیر میں تھے

416

ابرو کے ترے خم سے ہے کیلے کی زندگی جس طرح بوے زلف سے بیلے کی زندگی
آبِ حیات ہے بدن اس رشکِ ماہ کا اس کی صفاے تن سے ہے سیلے کی زندگی
میلے سے جب مدار[1] کے گھر کو چلا وہ شوخ اُس دم ہی تلخ ہوگئی میلے کی زندگی
شاعر پرست تھا پسرِ مستقیم خاں چاہی نہ حق نے ایسے روہیلے کی زندگی
جب کوڑیوں پہ فال کی ملاّ کی ہو معاش کیوں آ رہے نہ دمڑی و دھیلے کی زندگی

1- مدار = شاہ بدیع الدین مدار جن کی درگاہ مکن پور میں ہے اور اُن کا میلہ بہت سے شہروں میں لگتا تھا۔

جیتا تو ہوں میں اب تئیں ہاں مصحفی و لے
کیا زندگی ہے خاک اکیلے کی زندگی

417

کبریائی کی ادا تجھ میں ہے — گرچہ تو بت ہے، خدا تجھ میں ہے
شوخی و ناز و ادا تجھ میں ہے — یا یہ اک قہرِ خدا تجھ میں ہے
منھ چھپاتا ہے تو آئینے سے — کس قدر شرم و حیا تجھ میں ہے
خیر باشد کہ مرے خون کی سی — سرخی، اے رنگِ حنا تجھ میں ہے
پوچھ لیتا ہے تو اوروں سے مجھے — بارے اتنی تو وفا تجھ میں ہے
گل ہے بے حال، یہ کس گیسو کی — نکہت، اے بادِ صبا تجھ میں ہے
دل کو کھینچے ہے تری زلفِ سیاہ — سحر جادو کی بلا تجھ میں ہے
ہو نہ اے خاک کے پتلے مغرور — اس پہ تو، یہ جو ہوا تجھ میں ہے
سب یہ نقشہ ہے ترا عاریتی[1] — اک ذرا سوچ تو، کیا تجھ میں ہے
تو جو یوں گل کو بنا دیتی ہے — کچھ تو، اے بادِ صبا تجھ میں ہے

مصحفی سے تو ملا دے اُس کو
یہ اثر دستِ دعا تجھ میں ہے

418

کیا قتل اک جہاں چینِ جبیں سے — نہ نکلا ہاتھ باہر آستیں سے
جہاں مدفن ہے تیرے دل جلے کا — وہاں نت شعلہ اُٹھتا ہے زمیں سے
ہماری لاش تک قاتل نہ آیا — جو دیکھا بھی تو اُس کو دوربیں سے
شبِ ہجراں ہے یہ، اے ناوکِ آہ — گزر جا آج تو چرخِ بریں سے
اُٹھا روزِ قیامت بھی وہ غم ناک — جسے مارا نگاہِ سُرمگیں سے

1- عاریتی = عارضی، مانگا ہوا

نگاہِ لطف پر میں لگ چلا تو لہو ٹپکا نگاہِ خشمگیں سے
تمھارا ہر کسی کے گھر گزر ہے ق نہیں ملتے ہو صاحب اک ہمیں سے
اگر یوں تم نے ٹھانی ہے تو ہم بھی گئے ہیں اب گزر دنیا و دیں سے
خدا جیتا رکھے تم کو جہاں ہو رہو گو دور اس عزلت گزیں سے
وہی پھر مصحفی ہے اور تم ہو
کشود کار اگر ہووے کہیں سے

419

چاہیے یوں، کہ میاں مجھ کو دلاسا دیجے نہ کہ دل لیجیے اور گالیِ[1] بے جا دیجے
بزم سے مجھ کو اُٹھایا تو میں بیٹھا در پر تب میں جانوں جو مجھے یاں سے بھی اُٹھوا دیجے
گرچہ سو بار ملے لیک تمھارے جی میں یہ نہ آیا اسے مقصود کو پہنچا دیجے
اور ہیں وے جنھیں ہر بات میں دھمکاتے ہو ہم سے بولو تو تماشا تمھیں دکھلا دیجے
پاسِ ناموسِ محبت ہے وگرنہ، اے گل ابرِ مژگاں سے ابھی خون ہی برسا دیجے
ہم سے وہ برسرِ کاوش ہیں کچھ اچھا نہیں یہ اپنی مژگاں کو ذرا آپ ہی سمجھا دیجے
مصحفی دفن کے قابل نہیں، اے ہم سفرو
اس کے لاشے کو کسی غار میں پھنکوا دیجے

420

کب کرنے دے ہے گردشِ افلاک زندگی اس خاک داں میں کیجیے کیا خاک زندگی
کیا کیجیے کہ اس بتِ شیریں سخن بغیر ہے تلخ اب تو، اے دلِ غم ناک زندگی
مانند برق آنکھوں سے غایب جو ہوگئی کیا تھی سوار توسنِ چالاک زندگی
تو ذبح کر کے جس کے تئیں اس سے باندھ لے بخشے پھر اس کو حلقۂ فتراک زندگی
خاکِ چمن میں جیسے رگ و ریشہ بند ہے کرنی پڑی ہے جوں شجرِ تاک زندگی

1- گالیِ بے جا = اضافت غور طلب ہے

نکلے نہیں ہیں گوشۂ عزلت سے مصحفی
یوں کر گئے ہیں صاحبِ ادراک زندگی

421

ذرۂ خاک آفتابِ آسماں ہو جائے ہے
جب لگیں ہیں لینے ہم سودا گراں ہوجائے ہے

جس کو ہم چاہیں ہیں نظروں میں رکھیں مانندِ اشک
بات کہتے ہی وہ آنکھوں سے نہاں ہوجائے ہے

کچھ تو سمجھا ہے بڑائی اس میں اپنی جس سے شوخ
مہرباں ہو کر جو پھر نا مہرباں ہو جائے ہے

یاد آجائے ہے جب رنگینیِ رفتارِ یار
یک بیک آنکھوں سے میری خوں رَواں ہوجائے ہیں

اے گل اپنے رنگ و بو پر ہو نہ مغرور اس قدر
یاں بہارِ حسن اک دم میں خزاں ہو جائے ہے

چشمِ خواہش سے جو میں دیکھوں ہوں ٹک اُس کی طرف
اپنی رعنائی کا گل خود باغباں ہو جائے ہے

عشق کو کوئی چھپاوے کیونکے ہے ہے مصحفی
بن کہے یہ لوگوں کے اوپر عیاں ہوجائے ہے

422

گر مجھ کو شکارِ وصل کیجے تو مجھ سے قرارِ وصل کیجے
گپ چپ کا مزہ تھا، آہ کس سے ذکرِ شبِ تارِ وصل کیجے
میں وصل سے خوب سا جھگڑ لوں گر مجھ کو دوچارِ وصل کیجے

کیا قہر ہے گر پڑیں جھٹ آنسو جب یادِ دیار وصل کیجے
کیوں ہیں، نہیں وصل کی ٹھہرتی کیا دارومدارِ وصل کیجے
ملیے ہر اک سے یہ غضب ہے اک مجھ سے ہی عارِ وصل کیجے
جی جائے ہے نت رُندھا کہاں تک اندیشۂ کار وصل کیجے
کہنے کی نہیں کسی سے یہ بات یارب کسے یارِ وصل کیجے
گر وصل ہو مصحفی میسر
جی اپنا نثارِ وصل کیجے

423

پہلو میں جیسے دل کو کوئی مسل گیا ہے دیکھا ہے جب سے تجھ کو دم ہی نکل گیا ہے
آتش کا وہ بھبوکا آیا ہے میرے گھر میں آتے ہی جس کے سارا اسباب جل گیا ہے
بجلی سی کوند گئی ہے، وقتِ خرام اس کا ٹھوکر کے ساتھ جس دم دامن اچھل گیا ہے
جوڑے سے اس کے یارو مشکل ہے جی کا بچنا کتنوں کے تئیں یہ اژدر دم میں نگل گیا ہے
میں اشک گود میں سے کیونکر بھلا اُٹھاؤں یہ طفل چلتے چلتے ناحق مچل گیا ہے
کیا جانے کس کے غم کی آتش بھری ہے دل میں سینہ جو آبلوں سے یک لخت پھل گیا ہے
سوداگروں نے تجھ سے گر کی ہے عشق بازی دو دن ہی میں دوالا ان کا نکل گیا ہے
بالیں پہ مصحفی کی اک دم تو اور بھی بیٹھ
آنے سے تیرے اس کا ٹک جی سنبھل گیا ہے

424

ہم لوگ کہ امیدِ وفا رکھتے ہیں تجھ سے کس واسطے پھر دل کو چھپا رکھتے ہیں تجھ سے
تو بات بھی کرنے کو نہ آیا دمِ آخر اس بات کا البتہ گلا رکھتے ہیں تجھ سے
اس پر بھی جدائی کا گلہ ہم نہیں کرتے یہ بختِ زبوں گو کہ جدا رکھتے ہیں تجھ سے

کر ایک نظر نرگسِ بیمار کا صدقہ　　یہ جاں بہ لب امیدِ شفا رکھتے ہیں تجھ سے
ہر چند طبیعت میں تو ہے سرد پہ ہم تو　　آتش بہ دل، اے رنگِ حنا رکھتے ہیں تجھ سے
دیکھیں بھی ہیں تجھ کو تو چرائے ہوئے آنکھیں　　تھوڑی سی جو آنکھوں میں حیا رکھتے ہیں تجھ سے
کرنا نہ نظر ان کے گناہوں پہ، جو یا رب　　چشمِ کرم و لطف و عطا رکھتے ہیں تجھ سے
اک دن تو گل افشاں ہو اسیرانِ قفس پر　　وہ یہ ہوس، اے بادِ صبا رکھتے ہیں تجھ سے

مرتے ہیں میاں مصحفی ہر بات پہ تیری
دیکھا میں تو الفت وہ بلا رکھتے ہیں تجھ سے

425

دل تو کنارہ کر گیا آرزوے وصال سے
جس سے تو چاہے مل کہ میں خوش ہوں ترے خیال سے

سوتے میں منھ کھلا ہوا دیکھے جب اُس کا اس طرح
کیونکے لگا نہ دے پری گال کو اُس کے گال سے

قطرۂ خے[1] نہ جان یہ گوہرِ جانِ عاشقاں
مل کے ہوئے ہیں منعقد زلف کے بال بال سے

راتیں وہ خلطے کی تھیں کیا جو مجھے تم کبھی کبھی
کرتے تھے سرفراز آپ، ہو کے خوشی اُگال[2] سے

کام دہی پہ تھا مزاج یار کا آپ، کیا کہیں
شرم نے اپنی وا نہ کی مہر لب سوال سے

رمل کا ربط میں کیا بس یہ سمجھ کے، ہووے ہے
شوق زنوں کو بیشتر قرعے سے اور فال سے

رات رہے تھے کس کے ہاں یہ تو بتاؤ، مہرباں
ہووے ہے اور کچھ عیاں چہرۂ انفعال سے

1- خے = پسینہ　　2- اُگال = چبایا ہوا پان

بزمِ جہاں میں مصحفی کس کی بنی رہی سدا
دوری کا اس کی غم نہ کھا فائدہ کیا ملال ہے

426

نہ دوں جان کیونکر میں چاہت پر اُس کی | مرا دم نکلتا ہے صورت پر اُس کی
مرے دل میں ممکن نہیں جانشیں ہو | محبت کسی کی محبت پر اُس کی
نہ کی تم نے پرواہ کشتے کی اپنے | کوئی پھول رکھنا تھا تربت پہ اُس کی
جو کچھ منہ میں آیا سو بکتا گیا میں | زباں کھل گئی تھی شکایت پر اُس کی
کہاں ہم کہاں وہ بس اب آکے ٹھہری | ملاقات روزِ قیامت پر اُس کی
نہ کی تھی کمی بھی تو کچھ کوہکن نے | نظر کرتی شیریں جو محنت پر اُس کی

ترے مصحفی نے شبِ وصل جاں دی
مجھے گریہ آتا ہے حسرت پر اُس کی

427

مطبخِ عشق میں آگ آٹھ پہر جلتی ہے | پیشتر خشک سے، یاں ہیزمِ تر جلتی ہے
کون اس بزم میں رقصاں ہے کہ شب جس کے حضور | صبح تک مشعلِ سیمینِ قمر جلتی ہے
یار، کیا جانیے ہے سینہ بہ سینہ کس سے | آج چھاتی مری، اے داغِ جگر جلتی ہے
آگ بن جاتی ہے یوں رخ سے ترے مردمِ چشم | تابِ خورشید سے جس طرح سپر جلتی ہے
ہجرِ پروانہ سے کڑھتا نہیں دل اُس کا تو پھر | شمع کچھ پھیکی سی کیوں وقتِ سحر جلتی ہے
لبِ شیریں کی ترے گرمیِ بازار کو دیکھ | منہ سے کہتی نہیں پر چینِ شکر جلتی ہے
صبح دریا سے دھواں سا نہیں اُٹھتا بے جا | اس میں کشتے کی ترے لاش مگر جلتی ہے
ہے بڑا مرد جو بے پردہ اُسے دیکھ سکے | شعلۂ حسن سے تو اپنی نظر جلتی ہے

مصحفی حسن کا اُس گل کے وہ عالم ہے کہ واں
پتی پھولوں کی سدا جیسے اگر جلتی ہے

428

گر بچ بھی رہا کوئی چتون کے اشارے سے — تو اس نے اُسے مارا گردن کے اشارے سے
یک جنبشِ مژگاں میں دل برسرِ رہ آیا — یہ آگ بھڑک اُٹھی دامن کے اشارے سے
کیا آبلۂ دل کو درکار ہے نشتر کی — یہ پھوٹ بہے گا اک سوزن کے اشارے سے
کیوں چشمکِ گل کا ہو وارفتہ وہ سودائی — ہو آنکھ لڑی جس کی روزن کے اشارے سے

اے مصحفی جو ہردم دکھلائے سر و سینہ
محفوظ رکھے اللہ اُس زن کے اشارے سے

429

نہ وہ وعدۂ سرِ راہ ہے، نہ وہ دوستی نہ نباہ ہے
نہ وہ دل فریبی کے ہیں چلن نہ وہ پیاری پیاری نگاہ ہے

ترے ہجر میں، مہِ سیم بر، کوئی غور سے جو کرے نظر
مری صبح شام سے ہے بتر، مرا روز شب سے سیاہ ہے

ہے ہر ایک بات میں اب کجی کہ چلن نکالے ہیں اور ہی
نہ وہ ربط ہے نہ وہ دوستی، نہ وہ رسم ہے نہ وہ راہ ہے

کوئی زہرِ غم پیے تا بہ کے، ہوئی صرف ساغرِ غیر مے
نہ وہ جوششِ سرِ شام ہے نہ وہ وعدۂ شبِ ماہ ہے

بنے کیونکے پھر مری اُس کی اب کہ یہ تفرقہ ہے بڑا غضب
مجھے اُس سے اچھے کی ہے طلب اُسے مجھ سے اچھے کی چاہ ہے

کبھی سامنے سے جو وہ جائے ہے کبھی پھیر منھ کو دکھائے ہے
مجھے دردِ رشک ستائے ہے کہ یہی وہ غیرتِ ماہ ہے

تھی نگاہ پہلے تو اُس کی ووں کہیں دوستی میں ہوا ہے یوں
دیا اُس نے دل کہیں اور کیوں یہی مصحفی کا گناہ ہے

430

سراسر خجلت و شرمندگی ہے ہماری بھی بھلا کیا زندگی ہے
سدا کوئی رہا ہے، نے رہے گا اُسی کی ذات کو پایندگی ہے
خیالِ خوب رویاں کیونکے چھوٹے طبیعت میں مری خواہندگی ہے
نظر اپنی بھی واں جا ہی پڑے ہے جہاں آرایش و زیبندگی ہے
غزل خوانی کر اب اے مصحفی ترک
ہوا قد خم یہ وقتِ بندگی ہے

431

بس دیکھتے ہی ہم تری صورت کو مر گئے ہوش و حواس یہ بھی نہ جانا کدھر گئے
وعدہ کیا نہ تم نے وفا وصل کا کبھو اس آرزو میں ہم کو مہینے گزر گئے
مجھ کو کیا تو ذبح ولے پیار سے کہا کم بخت کے لہو سے مرے ہاتھ بھر گئے
اُٹھتے ہوئے یہ چھیڑ تو تم ان کی دیکھیو کاندھے پہ کس ادا سے مرے ہاتھ دھر گئے
کوٹھے پہ شب چڑھے جو وہ، جوڑے کے ان کے بال لگتے ہی ایک باؤ کا جھونکا بکھر گئے
اتنے میں اُن کی بو جو پراگندہ ہوگئی دامانِ دشت عنبر سارا سے بھر گئے
ایّامِ ہجر کا نہ کر اب ذکر مصحفی
وہ دن بھی جس طرح سے کہ گزرے گزر گئے

432

آئے جب اک نئی ہی ادا تم دکھا گئے ہر لحظہ تازہ عشق کی چیٹک لگا گئے
کیا وہ بھی ربط تھے کہ کھنکھارے جو ہم، تو تم آواز اپنی در تلک آ کر سنا گئے
آتی ہے کیوں تو کوچۂ جاناں سے دوڑ دوڑ ہم بھی کسی کے باغ میں بادِ صبا گئے
اُن کشتگانِ تیغِ محبت کو عشق ہے جو اس گلی میں خون کے نالے بہا گئے

دیکھے کوئی جو خاک کے پردے کو کھول کر　　کیا کیا نہ ماہ پارے منھ اس میں چھپا گئے
میں اُن کے دیکھنے کو جو دیکھا تو وو ہیں وہ　　نیچی نگاہ کرتے ہی آنکھیں چُرا گئے
اُگلی جو ٹک میان سے وہ تیغِ خوش غلاف　　دریائے خوں میں ہم سے ہزاروں نہا گئے

ان کے چلن کا کیا میں کروں ذکر مصحفی
یہ خوش خرام خاک میں مجھ کو ملا گئے

433

تنہا نہ تابِ زلفِ دوتا جی کو بھا گئی　　برگشتہ[1] دیکھنے کی ادا جی کو بھا گئی
کج کج چمن میں اپنا جو دھرنے لگی قدم　　طرزِ خرامِ موجِ صبا جی کو بھا گئی
صحرا کو جائے کس کی بلا ہر دم، اے نسیم　　چل اب تو اس چمن کی ہوا جی کو بھا گئی
زلفِ سیہ کا اس کی میں دیوانہ ہو گیا　　کیا کہیے بے طرح یہ بلا جی کو بھا گئی
رنگِ کفک تو گرچہ ترا قہر تھا ولے　　ان سرخ فندقوں کی حنا جی کو بھا گئی
محجوب وضع پر تری صدقے کیا میں جان　　آنکھوں کی تیری شرم و حیا جی کو بھا گئی
اے دل میں دیکھ لوں گا تری لن ترانیاں　　جس دم کسی کی وضع ذرا جی کو بھا گئی

میں کس ادا کا شیفتہ ہوں اس کی مصحفی
کوئی بھی جانتا ہے کہ کیا جی کو بھا گئی؟

434

مری الفت ہے اُس کے دل میں، اُس کی میرے دل میں ہے
محبت بھی عجب شے ہے کہ دونوں آب و گل میں ہے

نہ ہو جاوے کوئی کیونکر کہ اس کو دیکھ دیوانہ
سویدائے دلِ لیلیٰ تری ٹھوری کے تل میں ہے

1- پلٹ کر دیکھنے کی

ترے ہی حسن کا ہے خلخ و نوشاد میں چرچا
ترے ہی زلف و رخ کا ماجرا چین و چگل[1] میں ہے

نہیں منصور وش ہم کو جو خطرہ دار کا شاید
ہمارا خون بھی داخل اسی خونِ بحل[2] میں ہے

رکھا تھا مصحفی کی قبر پر جو سنگ کا تختہ
جدھر دیکھو اُدھر اک رخنۂ نو اُس کی سل میں ہے

435

پانو میں قیس کے زنجیر بھلی لگتی ہے
یوں ہی دیوانے کی تصویر بھلی لگتی ہے

اپنی کیا تجھ سے کہوں تو ہی کہہ اپنی مجھ سے
کہ مجھے تیری ہی تقریر بھلی لگتی ہے

خوش نما ہے ترے عارض پہ یہ خط یوں، جس طرح
گرد قرآن کے تفسیر بھلی لگتی ہے

جب مرے خون میں ہوتی ہے وہ رنگیں، قاتل
اُس گھڑی کیا تری شمشیر بھلی لگتی ہے

ہوتی ہے عاشق و معشوق کی جس میں تصویر
اپنی آنکھوں میں وہ تعمیر بھلی لگتی ہے

میری تصویر کو غم ناک تو کھینچ، اے مانی
شکل عشاق کی دل گیر بھلی لگتی ہے

مصحفی باجے ہے نوبت تو درِ آصف پر
کیا ہی آواز بم و زیر بھلی لگتی ہے

436

دیکھو ہی مت ادھر کو ایسی ہی گر حیا ہے
کج کج نگاہ کرنا یہ کون سی ادا ہے

جوڑے کا تیرے عالم بندھنے میں یوں میں دیکھا
گویا کہ کنڈلی مارے بیٹھا اک اژدہا ہے

مہندی کے دھوکے مت رہ، ظالم نگاہ کر تو
خوں میرا دست و پا سے تیرے لپٹ رہا ہے

جب تو ہوا ہے غصے، کرنے مری شفاعت
قد کا ترے ہی سایہ پانو پہ آ رہا ہے

ہم گاہ گاہ اس سے رستے میں مل رہے ہیں
ملنے کا اب تو بارے اک ڈول بندھ گیا ہے

1- روایتی شہروں کے نام 2- خونِ بحل = وہ خون جو معاف ہو

ملتی نہیں کلی کو یاں جاے یک تبسم باغِ زمانہ یارو، یاں تک تو کم فضا ہے

اے مصحفی سنے تو گر اس کو گوش جاں سے
اک بار ریختہ میں اب اور بھی کہا ہے

437

آیا ہے دیرواں سے، خط لے کے جب گیا ہے پیغامبر کے ہاتھوں جی اپنا پک گیا ہے
دولاب[1] وشمع کی سی حالت مری بنی ہے اب رات دن کا رونا میرے گلے پڑا ہے
آتا ہے طعنِ راحت دینے تصور اُس کا بھولے سے گر میں سر کو زانو پہ بھی دھرا ہے
پامال ہیں کہیں گل، سبزہ کہیں رُندھے ہے رفتار کا بتاں کی کچھ ڈھنگ ہی جدا ہے
عاشق فنا کو اپنی رکھتا ہے دوست، سچ ہے جب آگ پر گرا ہے پروانہ جل بجھا ہے
کیونکر اُڑی اُڑی پھر بیٹھے نہ طاق پر بات ان ابرواں کی جانب پیغامبر صبا ہے

میں چاہتا ہوں اس کو وہ غیر پر ہے مایل
اے مصحفی کہوں کیا اک طرفہ ماجرا ہے

438

تسلی ہووے گی، قاتل تری کیا اک دو چلّو سے کیا ہے قتل گر مجھ کو تو بھر لے جام لوہو سے
خدا جانے وہ کون آیا تھا پہنے ہار پھولوں کا چمن مہکا ہوا ہے اب تلک جو ناز کی بو سے
کہیں رسوا نہ ہو تم مجھ کو یہ ڈر ہے کہ راتوں کو کمند اندازیاں کرتے پھرو ہو جعد و گیسو سے
کسی نے کچھ نہ جانا اور یہاں اک بات کے کرتے قیامت ہو گئی ہم پر ادائے گردشِ رو سے
رُکاوٹ دیکھیو اُس کی کہ باوصفِ ہم آغوشی چرائے ہی رکھا پہلو کو میرے اُس نے پہلو سے
خدا جانے کہ وہ آرامِ جاں تھا کس کے پہلو میں نہ آئی نیند ساری رات مجھ کو دردِ پہلو سے
ہم آغوشی کی حسرت رہ گئی دل میں وہ جب سویا کہ اُس کے سر کا سرکانا مناسب تھا نہ زانو سے
طبیبِ مہرباں بہرِ خدا لکھ اور ہی نسخہ تپِ الفت نہیں جاتی خیاریں[2] اور کاہو سے

1- دولاب = پانی کھینچنے کی چرخی، رہٹ 2- خیارین اور کاہو یونانی مفرد دواؤں کے نام

دل اُس کا تو بہت چاہے ہے مجھ پر مہربانی کو
و لے ناچار ہے وہ بھی مزاجِ نار کی خو سے

صفا تو دیکھیو پنڈے کی جب میں باندھ دیتا ہوں
ڈھلک جاتا ہے اُس کا نورتن پھر وو ہیں بازو سے

نہ آئی ٹوٹنے کی ایک کے، ان سے صدا ہرگز
گرے سو شیشۂ دل گرچہ اُس کے طاقِ ابرو سے

سمجھنے والے ہی سمجھیں گے قدر اشک بر مژگاں
کہ کم ہوتے نہ دیکھی قیمتِ در نجف مو سے

غزل کو مصحفی کس واسطے تو طول دیتا ہے
ترے یہ شعر تو کچھ کم نہیں ہیں سحر و جادو سے

439

اول تو فقط شرمگیں صورت نظر آئی
پردہ جو گیا کھل تو قیامت نظر آئی

جب کھینچ چکا اُس کے سراپا کو مصور
ہر عضو میں اللہ کی قدرت نظر آئی

بے طاقتیِ دل نے کیا کام ہی آخر
دو دن ہی میں اپنی ہمیں طاقت نظر آئی

سنکار [1] دیا غمزۂ سفاک کو مجھ پر
آخر تری آنکھوں کی شرارت نظر آئی

پائی نہ تصور سے ترے میں نے رہائی
جب آنکھ مُندی تب وہی صورت نظر آئی

جانے تو گیا اس کے میں کوچے کی طرف لیک
ہر گام پہ اک تازہ مصیبت نظر آئی

بس تیغ کے ہوتے ہی علم سب وہیں سٹکے [2]
یاروں کی مجھے اپنے رفاقت نظر آئی

میں جی میں یہ سمجھا تھا کہ کل وصل کا دن ہے
یاں آنکھ کے کھلتے شب فرقت نظر آئی

غش کر کے پھر اک آہ گرا بس وہیں مجنوں
لیلیٰ کی جوں ہی دور سے تربت نظر آئی

اس منزلِ ہستی سے شب مرگ میں میں نے
آگے جو دھرا پانو تو حیرت نظر آئی

لکھا ورقِ گل پہ کلک کا ترے نقشا
بہزاد کو جب اُس کی نزاکت نظر آئی

غصہ تو ہوا مجھ پہ وہ بت پر مجھے اُس کی
ہر چینِ جبیں آیۂ رحمت نظر آئی

ہم مر چلے اور تم نے کبھی آ کے نہ پوچھا
بس بس نہ بکو آپ کی سنگت نظر آئی

گزرا جو کبھی سامنے سے میرے وہ کافر
ق میں کیا کہوں، مجھ کو تو اک آفت نظر آئی

1- سنکارنا = کسی کو مخالفت پر اُبھار دینا 2- سٹکنا = خاموشی سے الگ ہو جانا

اس دھج سے دھرا پانو کہ دل پس گیا میرا — اس ڈھب سے پڑی آنکھ کہ چاہت نظر آئی

اے مصحفی یوں ترک کیا اُس نے جو ملنا
کیا جانیے کیا اُس کو قباحت نظر آئی

440

گر سیرِ گلستاں کو وہ رشکِ قمر آوے — گل سامنے اُس کے نہ کبھی شاخ پر آوے
کیا بید سے نسبت مجھے گلزارِ جہاں میں — وہ نخل ہوں میں جس میں نہ گل نے ثمر آوے
از بہرِ اسیرانِ قفس کاش چمن سے — جھولی میں لیے پھول نسیمِ سحر آوے
دیتا ہے کفِ غیر میں تو دستِ حنائی — کس طرح نہ آنکھوں سے مری خوں اُتر آوے
گریے کا مرے سلسلہ برہم نہیں ہوتا — تھم جاوے اگر اشک تو لختِ جگر آوے
صیاد روا ہے یہ، نکل کنجِ قفس سے — خنجر کے تلے طائرِ بے بال و پر آوے
خوں ریزی کا عالم ہے تصور میں بھی اس کے — جب آئے تو وہ باندھ کے تیغ و سپر آوے
بن ٹھن کے وہ نکلے ہے تو مشتاقِ تماشا — کہتے ہیں یہی جی میں یہ آفت ادھر آوے
پردے کو اُٹھا دے جو وہ مہ روز قیامت — خورشیدِ قیامت نہ کبھی بام پر آوے

اے مصحفی لکھ جا غزل اک اور بھی اس میں
تو زورِ طبیعت تو ترا کچھ نظر آوے

441

دل سمجھے نہ وہ چاند سی صورت نظر آوے — چاہت ہے نئی اس سے کوئی کیونکے بر آوے
بیتابی سے جاتا ہوں جو ہر دم تو کہے ہے — اوروں کو سنا کر نہ کوئی میرے گھر آوے
دھڑکا رہے درباں کی رقابت کا، وہ شب کو — گھر والوں سے چھپ کر جو کبھی بام پر آوے
گر تجھ کو حیا اتنی بھی رخصت نہیں دیتی — اے کاش تصور ہی ترا بام پر آوے
جی دھڑکے ہے میرا کہ اسے دیر ہوئی ہے — کچھ اور خبر لے نہ مرا نامہ بر آوے
کھل جائے جو جوڑے کا ترے رشتۂ زریں — اک کوندسی بجلی کی لٹک تا کمر آوے

میں ملتفت بوس و کنار اور وہ شب وصل ترساں کہ نہ آواز خروسِ سحر آوے
تاثیر ہو پیدا مرے نالے کو الٰہی یہ تیرِ ہوائی بھی کبھی کارگر آوے
مژگاں پہ مری رحم کر اے شورشِ گریہ آنسو کی جگہ چشم سے کب تک شرر آوے

کیا مصحفیِ خستہ کے طالع ہیں کہ توباہ
اس کوچے میں جب جائے یہ با چشمِ تر آوے

442

اس عشق وجنوں میں نہ گریبان کا ڈر ہے یہ عشق وہ ہے جس میں ہمیں جان کا ڈر ہے
آساں نہیں دریاے محبت سے گزرنا یاں نوح کی کشتی کو بھی طوفان کا ڈر ہے
بازار سے گزرے ہے وہ بے پردہ کہ اُس کو ہندو کا نہ خطرہ نہ مسلمان کا ڈر ہے
دل خون میں تڑپے ہے ترے تیرِ نگہ سے پر اس پہ بھی ظالم ترے پیکان کا ڈر ہے
دربان بھی یاں کچے گھڑے [1] پانی بھرے ہے وہ ہیں ہمیں یاں جن کو کہ دربان کا ڈر ہے

وہ شوخ کہیں وقتِ نماز آن نہ نکلے
اے مصحفی مجھ کو اسی شیطان کا ڈر ہے

443

اجی چپ جانے والے تم ہمارے گھر نہیں آتے
ہمیں کچھ تم سے کہنا ہے ذرا، ادھر نہیں آتے

اگرچہ خار صحراے الم سر تیز ہیں لیکن
تری مژگاں کی سوزن کاریوں سے بر نہیں آتے

سمائے ہیں کچھ ایسی طرح میرے دل میں بھال اس کے
کہ جوں جوں کھینچتا ہوں اُن کو وے باہر نہیں آتے

ہمیں کیا جامِ عشرت سے ہمارے شیشۂ دل پر
بھلا کس روز بامِ چرخ سے پتھر نہیں آتے

1- کچے گھڑے پانی بھرنا= ہمت سے، بے خوف ہوکر

یہ دھڑکا ہو گیا ہے ان کو کچھ مجھ سے کہ گھر میرے
جو آتے ہیں کبھی اب وہ تو بے خنجر نہیں آتے

بہانے کرتے ہی گزری تمھیں تو، عمر جاوے ہے
جو آنے والے ہیں راتوں کو کیا چھپ کر نہیں آتے؟

خدا جانے بتاں کو شرم ہے کس بات کی ہم سے
ہمارے سامنے جو پہن کر زیور نہیں آتے

ہمارا چاکِ دل پاتا ہے کب پیوند ناصح سے
رفو کو اُس کے تا ادریس پیغمبر نہیں آتے

لگا میں مصحفی پاس اُن کے کل جانے تو یہ بولے
اجی اندھے ہو کیا تم یوں چڑھے سر پر نہیں آتے

444

بارہ سے دو غائب ہوئے وہ ماہ کی ٹھہری
فاقوں سے لگے مرنے تو تنخواہ کی ٹھہری

اب دیوے ہے یاں کون مہینے کے مہینے
تقسیم یہی بس گہہ و بیگاہ کی ٹھہری

جس دن سے ہوئے مہدی علی خاں کے حوالے
اُس دن سے سدا نالۂ جانکاہ کی ٹھہری

اب چھاونی گویا کہ ہے اک تعزیہ خانہ
نالے کی اِدھر سے تو اُدھر آہ کی ٹھہری

لشکر کا وہ جانا ہے نہ وہ جی کا جلانا
ٹھہری بھی سواری تو سرِ راہ کی ٹھہری

تھا فکر میں اُن کی بھی تفضّل تو ولیکن
غم کھا کے یہ فوج آصفِ جمجاہ کی ٹھہری

فراش جو پاتا ہے سو پاتے ہیں چڑھیتے[1]
گھوڑوں کی تو کیا نوکری خرگاہ[2] کی ٹھہری

جب بٹ چکی تنخواہ رسالے کی بہ ذلت
تب پیچھے کہیں بندۂ درگاہ کی ٹھہری

اے مصحفی یہ فرقہ کہاں اور کہاں میں
کیا کیجے جو یوں قسمتِ کوتاہ کی ٹھہری

1- چڑھیت (بروزن ڈکیت) سامان لدوانے والے، ڈھونے والے 2- خرگاہ = خیمہ

445

کاش اس دوری سے تو کچھ کھا کے مرجاوے کوئی
لالہ وگل ساتھ کب تک جی کو بہلاوے کوئی

یہ ستم کس طرح سے سہیے کہ مرے شوق میں
اور اس مرنے پہ برسوں منہ نہ دکھلاوے کوئی

ربط ہی جاتا رہا ہو جب بہم ملنے کا آہ
کس کو چھیڑے اور کس کی گالیاں کھاوے کوئی

ہم تو کر رہتے بلا سے صبر ہی، پر کیا کریں
گر نہ سمجھے دل تو کیونکر اس کو سمجھاوے کوئی

چاہنا ہے یا ستم ہے، دوستی ہے یا غضب
مجھ کو حیرت ہے کہ کیونکے اس سے باز آوے کوئی

پیچ پر پیچ اور گرہ پر ہے گرہ مانندِ زلف
ایسے الجھے دل کو یارب کیونکہ سلجھاوے کوئی

اے گل اک دن آنکل ہنستا، کہاں تک ہجر میں
روز و شب آنکھوں سے اپنی خون برساوے کوئی

ہائے بس چلتا نہیں اے مصحفی کیا کیجیے
سامنے پھرتا ہو، اور یوں جی کو ترساوے کوئی

446

گئے وے دن کہ دروازے پہ ہم آ کر نکل بیٹھے
کبھی اب جی جو گھبرایا تو ٹک باہر نکل بیٹھے

کہیں جانے کی اُن کے گرسنی ہم نے تو مضطر ہو
کبھی کوٹھے پہ آئے اور کبھی در پر نکل بیٹھے

سواری عید کے دن جب لگی اس شاہ خوباں کی
تو نظارے کو اس کے صاحب افسر نکل بیٹھے

بتانِ ماہ سیما نے دکھایا اور ہی عالم
شب مہ میں جو مہتابی پہ وہ کافر نکل بیٹھے

ابھی تو مانعِ رفتار تھی زنجیرِ پا اُن کی
درِ زنداں پہ زندانی ترے کیونکر نکل بیٹھے

بھلا کس دیکھنے والے کا اُس پر جی نہ للچاوے
جو تجھ سا خوب رو پہنے ہوئے زیور نکل بیٹھے

کبھی جو بیٹھے بیٹھے گھر میں جی گھبرا چلا اپنا
تو ہم اے مصحفی در پر خفا ششدر نکل بیٹھے

447

اک خوشۂ پرویں سا بہ روئے شفق آوے
تب دیکھیے چہرے پہ ترے جب عرق آوے

لگ جائے گلے اُٹھ کے وہ کس طرح نہ یارب　　معشوق کسی کا جو بوقتِ قلق آوے

طالع کی یہ خوبی ہے کہ ہو صبح اور اب تک　　منھ پر نہ شبِ ہجر کے رنگ فلق آوے

سمجھے ہے وہ ننگ اوج تنزہ[1] سے اُترنا　　تصویر تری کیونکے بہ روے ورق آوے

جس شکل پہ مرتا ہوں میں اے کاش کہ ناگاہ　　نقاش لیے ہاتھ میں اُس کا ورق آوے

عاشق کے گلے دوڑ کے لگ جا، یہ بتاؤں　　گر پوچھنے مجھ سے وہ علاجِ بہق[2] آوے

جی چاہے ہے دیکھوں وہ رسالہ میں کہ جس میں　　مذکور محبت ہی رہے جو سبق آوے

حق پوشی یہاں تک ہے کہ اب چاہیے ہرگز　　مُلّا کی زباں پر نہ کبھی نامِ حق آوے

تو باغ میں جاوے تو تری نذر کی خاطر　　پُر زر کیے گل ہاتھ میں لے کر طبق آوے

تالیفِ محبت میں مری عقل ہے حیراں　　جو مسئلہ پیش آئے سو لاحل ادق[3] آوے

اے مصحفی یوں چاک ہوا گریہ سے سینہ
دیوار میں جوں موسمِ باراں میں شق آوے

448

رکھا نہ مرے داغ پہ کافور کسی نے　　پونچھا نہ مری چشم کا ناسور کسی نے

ہے عرش پہ پرواز مرے طائرِ دل کی　　پہنچایا ہے رتبے کو مرے دور کسی نے

کاوش سے طبیبوں کی رہا سینہ جراحت　　بندھنے نہ دیا زخم کا انگور کسی نے

عاشق ترے ہرگز نہ ترے سامنے آئے　　اتنا بھی نہ پایا کبھی مقدور کسی نے

آزردہ ہے کس واسطے تو یہ تو بتا دے؟　　کچھ تجھ سے کہا اے بتِ مغرور کسی نے

خوبانِ جہاں سب ہیں بنے نور کے لیکن　　پایا نہیں چہرے کا ترے نور کسی نے

حق میٹے سے مٹتا ہے کوئی، باہمہ شدت　　باطل نہ کیا دعویِ منصور کسی نے

1- تنزہ (بروزن توجہ) عالم تنزیہہ، ہر اضافت سے پاک ہونا۔ 2- بہق = چھیپ جو اکثر نوجوانوں کے منھ پر اور جسم پر ہو جاتی ہے۔ 3- لاحل ادق = جس کا حل نہ ہو، بہت پیچیدہ، باریک مسئلہ

کب آئینے کا منھ ہے ترے رخ کی صفا پر　زنگی[1] کو تو ہرگز نہ کہا حور کسی نے
تو تھام نہ لے ہاتھ تو اک دم میں کیا تھا　پیمانہ کسی شخص کا معمور کسی نے
اے مصحفی سن یہ بھی کہ اس بحر میں ہرگز
کی ہوگی غزل ایسی نہ مسطور کسی نے

449

کیا کام کیا، اے بتِ مغرور کسی نے　پھینکا ترے کوچے سے ہمیں دور کسی نے
تھے رخنوں میں جالی کے نہاں نشترِ مژگاں　سمجھا نہ اُنھیں خانۂ زنبور کسی نے
گو تو نہ کہے، پر ہے تری وضع سے ظاہر　پھر مجھ سے کیا ہے تجھے مغرور کسی نے
پا زیبِ زمرد ہے ترے پانو میں کافر　یا باندھ دیا دانۂ انگور کسی نے
اک وضع پہ ٹھہرا نہ ترے حسن کا عالم　سمجھا کوئی غلماں تو کہا حور کسی نے
یاں پہلے چھری دیتے ہیں عاشق کے گلے کو　رکھا ہے عجب طرح کا دستور کسی نے
اتنا تو نہ بیمار تھا، یہ مجھ کو یقیں ہے　کچھ تجھ پہ کیا[2]، اے دلِ رنجور کسی نے
بازارِ محبت میں جو میں اُس کو نکالا　واں بھی نہ خریدا دلِ رنجور کسی نے
کہتا تھا میں خوباں سے کہ ہر اک سے نہ بولو　رکھا نہ مری بات کو منظور کسی نے
عاشق ترے صد شکر موے تیرے ہی آگے　دیکھی نہ شب ہجر کی دیجور[3] کسی نے
جاتی ہے لگاوٹ کوئی، مانا کہ میں رکھا　سو پردوں میں کر کے تجھے مستور کسی نے
نقاش بھی بھولے کہ لکھا اور ہی نقشا　دیکھی نہ تری نرگسِ مخمور کسی نے
اے مصحفی یہ غم کدہ ہے جاے ملالت
یاں دل نہ کیا ہو(وے) گا مسرور کسی نے

450

دکھلا کے فقط نرگسِ مخمور کسی نے　کی دل سے مرے حبِّ چمن دور کسی نے

1- زنگی = حبشی، سیاہ فام　2- یعنی جادو ٹونا کر دینا　3- دَیجور = اندھیاری

جھلکیں ہیں پڑے آبلۂ دل کہ رکھا ہے پہلو میں مرے خوشۂ انگور کسی نے
مٹی سے جما گل تو اُگا سنگ سے لالہ ہرگز نہ کیا حسن کو مستور کسی نے
دل کیوں نہ نظر آئے کہ تیروں سے کیا ہے سینے کو مرے مخزنِ ناسور کسی نے
ہے خالِ سیہ اس کی بُنا گوش[1] پہ یا رب یا رکھ دیا فلفل کو بہ کافور کسی نے
ہرچند کہ خود نور ہے تو ارض و سما کا پر آنکھوں سے دیکھا نہ ترا نور کسی نے
سمجھے وہ ضعیفوں کے ستانے کی اذیت توڑا ہو اگر خانۂ زنبور کسی نے
پھر چاہ کی باتیں جو اُڑا دی تھیں نکالیں ق پھر ربط کیا ہم سے بہ دستور کسی نے
معلوم ہوا یہ کہ نہ تھی اُس کی خطا کچھ جی دے کے کیا تھا اُسے مغرور کسی نے

اے مصحفی لازم ہے غزل اور بھی کہنی
آخر تو کیا ہے ہمیں مامور کسی نے

451

سینے کو کیا خانۂ زنبور کسی نے پلکوں کو دیے خوشۂ انگور کسی نے
تصویر سے بیٹھے ہیں ترے سامنے خوباں کیا بولیں یہ پایا نہیں مقدور کسی نے
پیچھے تو چلے سایہ صفت اُس کے پر اُس سے دو چار قدم ہم کو رکھا دور کسی نے
تصویر جو کھینچی تری لکھ کر کے لگا دی چہرے کی جگہ سورۂ و النور کسی نے
پروانے موے سیکڑوں، پر غسل کو اُن کے مانگا نہ کبھی شمع سے کافور کسی نے
پتلے کو بنا کر کے ترے، اے بتِ کافر لا نصب کیا اُس پہ رخِ حور کسی نے
تم آئے گئے غیر کے گھر اور نہ کیا ہائے ہم سے کبھی اس بات کا مذکور کسی نے
یہ کیا ہے جو لاتی ہی نہیں رو بہ سحر تو ق یا تجھ کو کیا چلنے سے معذور کسی نے
یا دی ہے لگا اپنے نصیبوں کی سیاہی چہرے سے ترے، اے شبِ دیجور کسی نے

اے مصحفی میں تھا وہ گنہگار کہ جس کو
ہرگز نہ لکھا نامے میں مغفور کسی نے

1- بُنا گوش = کان کی لَو

452

دیتا ہے گلے سب کے یہ پیرِ فلک پھانسی
اس ٹھگ کی بغل میں ہے یک دستہ سرک[1] پھانسی

موئے کمر اس کے کی خود ناف ہی پھندا ہے
ایسی تو نہ دیکھی تھی میں آج تلک پھانسی

کب مائدہ خوار اس کا ہوتا ہے رہا آساں
ہے اُس کی تو گردن پر خود حقِ نمک پھانسی

آ ہوے رمال اس کا کس زلف سے چھوٹا ہے
جو حوروں کے بالوں کی بٹتے ہیں ملک پھانسی

مے پی کے جو میں اس بن کھاتا ہوں کبابِ[2] تیر
دیتی ہے گلے میں آ نُقل الفور گزک[3] پھانسی

مت خون کا عاشق کے منکر ہو کہ شاہد ہے
لوہو میں بھری تیری یہ رنگِ کفک پھانسی

کیونکر نہ پھنسیں مردم جب ہو مرے قاتل کی
ہر چشمِ سیہ پھندا ہر ایک پلک پھانسی

چھریاں نہ بھلا ماریں کس طرح سے وہ مژگاں
جب میرے گلے میں دے سرے کی دھسک[4] پھانسی

آنکھوں کا کساؤ[5] اس کے کردے ہے خفا دم کو
گر زلف کے حلقے کی ڈھیلی ہو تنک[6] پھانسی

کوئی کیوں نہ پھنسے یارب اس حسن و شمائل پر
برقعے میں سے چھنکے ہے عارض کی جھلک پھانسی

اے مصحفی وحشت پر تو اپنی نہ بھول اتنا
یاں صید کو لاسا[7] ہے جاتی ہے چپک پھانسی

453

فرصت ملے جو تم کو کسی رات دو گھڑی
کر جایئے کسی سے ملاقات دو گھڑی

عاصی کا بندہ خانہ بھی نزدیک ہے، میاں
کیجے کبھی کبھی جو عنایات دو گھڑی

درویش ہیں کچھ اپنی نہیں اس میں کسرِ شاں
کرتے ہیں ہر کسی کی مدارات دو گھڑی

تھا دل میں یہ کہ جاگیں گے ہم وقتِ نیم شب
پر آنکھ جب کھلی کہ رہی رات دو گھڑی

حسرت یہ رہ گئی کہ شبِ وصل بھی صنم
بیٹھا نہ میرے پاس تو ہیہات دو گھڑی

1- ہاتھ بھر کا پھندا 2- کباب کی ایک قسم 3- شراب کے ساتھ کھانے کا شغل
4- سرے کی دھسک، پھندا 5- آنکھیں چڑھا کر دیکھنا 6- تنک = ذرا
7- لاسا = شکار کو پھانسنے کے لیے لگاوٹ

ہمدم ہی اپنے آہ وہ ہم سے بچھڑ گئے — کرتے تھے جن سے حرف و حکایات دو گھڑی
غافل سے شب کہے ہے یہ وقتِ طلوعِ صبح — ٹک جاگ لے کہ ہے یہ طلسمات دو گھڑی
زیرِ فلک بس اس کو غنیمت ہی جانیے — یارو کٹے جو چین سے اوقات دو گھڑی
گر جیب پھٹ چکا تو لگا سینہ نوچنے — خالی رہا مرا نہ کبھی ہات دو گھڑی
یا تھے کبھی وہ ربط کہ باہم ہم اور تم — ق — مل بیٹھتے تھے موسمِ برسات دو گھڑی
یا اب یہ تفرقہ ہے کہ مقدور ہی نہیں — اتنا ہمیں کہ تم سے کریں بات دو گھڑی

ہیں آہ و زاریاں یہی دل کی تو مصحفی
سونے نہ دے گا مجھ کو یہ بدذات دو گھڑی

454

حق نے کیا اُس کو نازکی دی ہے — ہر بنا گوش گل کی پتی ہے
ہے مری آہ صبح گاہی گرم — نسبت اُس کی نسیم ٹھنڈی ہے
کیا کرے دل میں اُس کے نالہ اثر — کہیں پتھر میں جونک لگتی ہے
حق میں مجنوں کے گو ہو لاکھوں کوس — آفتِ جاں نگاہِ لیلیٰ ہے
مصحفی سے جو تو رہے ہے خفا — ق — کیا تری اُس نے کچھ خطا کی ہے
چاہنے والوں میں ترے، اے شوخ — جو ہیں سو اور، ایک یہ بھی ہے

455

کب خوش آوے ہے یہ ہجراں کی شبِ تار مجھے — کاٹنے دوڑیں ہیں تجھ بن در و دیوار مجھے
مجھ پہ صیاد نے میرے یہ ستم تازہ کیا — دام میں چھوڑ گیا کر کے گرفتار مجھے
پاس بدنامی کا تیری ہے ترے سر کی قسم — ورنہ کچھ جان کا دینا نہیں دشوار مجھے
میں بھی بے حوصلہ اتنا نہیں اے بختِ زبوں — جس قدر چاہے تو دے حسرتِ دیدار مجھے
اِس نہ ملنے پہ بھی جاتا ہی نہیں دل کا لگاؤ — کیونکہ کہیے کہ نہیں اُس سے سروکار مجھے
خواب میں اُس کا تصور ہے مقابل میرے — شورِ محشر ابھی مت کیجیو بیدار مجھے

یہ بھی خوبی ہے نصیبوں کی کہ اس چاہت پر — تم سمجھتے ہی نہیں اپنا خریدار مجھے
فرق اتنا ہی ہے باہم کہ ملا، اے مجنوں — سایۂ بید تجھے، سایۂ دیوار مجھے
رحم کھا کر مری پرسش کے لیے آیا یار — جب کہ مطلق نہ رہی طاقتِ گفتار مجھے
دیکھ کر کبک نے اس سروِ خراماں سے کہا — "کر گئی خاک سے یکساں تری رفتار مجھے"
اس تمنا میں مری جان لبوں پر آئی — لیک تو نے نہ دیا بوسۂ رخسار مجھے
اک تو بیمار تھا آگے ہی میں فرقت میں تری — ناشکیبی نے کیا اور بھی بیمار مجھے
یہ بھی رونے کا ہے اسلوب کوئی، مان کہا — نہ کر، اے گریہ بہت زیست سے بیزار مجھے

مصحفی اور بھی اک تازہ غزل لکھتا ہوں
پھیر لاتا ہے قلم برسرِ گفتار مجھے

456

شب ہجراں میں ملے دیدۂ بیدار مجھے — نہ رہا خوابِ فراغت سے سروکار مجھے
میں ہوں وہ جنس کہ جب عیب سے واقف ہووے — پھر لگے بیچنے پچھتا کے خریدار مجھے
سر میں پتھروں سے تو پٹکوں گا بھلا واں جا کر — لے چل اے جوشِ جنوں جانبِ کہسار مجھے
گرمیِ روزِ قیامت نہ ہوئی کچھ معلوم — مل گیا واں جو ترا سایۂ دیوار مجھے
سرد رکھتے ہیں دل ایام یہ بے عشقی کے — تو ہی آ گرم کر اے آرزوے یار مجھے
مژدہ طفلاں کو یہ پہنچے کہ ابھی صحرا سے — کھینچ لایا ہے جنوں برسرِ بازار مجھے
زندگی کیونکے کروں میں کہ تغافل نے ترے — روزِ محشر پہ دیا وعدۂ دیدار مجھے

مصحفی رنگ مرا کیونکے نہ ہو جاوے زرد
مثلِ نرگس جو ملیں دیدۂ بیدار مجھے

457

دیکھ اُس نے گھٹا کالی جانے میں شتابی کی — بجلی کی چمک نے بھی کیا خانہ خرابی کی

نالے کا سرود اک دن میں اُس کو سنایا تھا　　موقوف ہے اُس دن سے تعظیم ربابی[1] کی
ہے ابرِ سیہ جھوما اور برق بھی چمکی ہے　　ساقی تو خبر لیجو ایسے میں گلابی کی
شانے نے کھسوٹ اس کا کیا رنگ کیا، زاہد　　دیکھی، جو ہوئی عزت اس ریشِ خضابی کی
ہے بادہ کشی کا اب یہ رتبہ کہ دیکھوں ہوں　　دروازے پہ مسجد کے دوکان کبابی کی
جب خیمۂ گردوں کو استاد[2] لگے کرنے　　نالوں کی لگیں چوبیں اشکوں نے طنابی کی
گردن پہ مری بارِ احسان رہا اُس کا　　جو خنجرِ قاتل نے برّش میں خوش آبی کی
مذہب کا تو غم کھانا کیا چاہیے غم یہ ہے　　یاں نوکری بھی آ کر ٹھہری ہے رکابی[3] کی
پھر مصحفی میں اس میں لکھی غزل تازہ
جب کشتِ معانی کی خامہ نے سحابی[4] کی

458

آتے ہی بہار اُس نے پوشاک گلابی کی　　پھر شکل نظر آئی یاں خون خرابی[5] کی
برگِ گل نیلوفر ہر چند کہ ہے شستہ　　پاتا ہے صفا کوئی اس جامۂ آبی کی
کم بخت کی ٹُن ٹُن نے سونے نہ دیا مجھ کو　　اک پل نہ رہی دیشب انگشت ربابی کی
قیمت سے وہ کیوں گرتا، ارژنگ[6] میں تو مانی　　تصویر اگر لکھتا اس روے کتابی کی
کافر نے دو بخرے ہی شب مجھ کو کیا ہوتا　　گر باڑھ نہ گر جاتی[7] اس تیغ دو نابی[8] کی
ہیں بیندھے ہوئے اس پر جو لختِ جگر پیہم　　ہر ایک مژہ میری ہے سیخ کبابی کی
خورشید فلک پر سے غش کر کے گرے دو ہیں　　گر ایک جھلک دیکھے اس روے کتابی کی
اے مصحفی آنکھوں سے اس بت کی حذر کر تو
وضع اس میں نکلتی ہے بدمست شرابی کی

1- ربابی = موسیقار　2- اِستاد (بہ کسرِ اول) = خیمہ کھڑا کرنے لگے　3- رکابی مذہب محاورے کی طرف اشارہ ہے۔　4- سحابی = بہ معنی سیرابی　5- خون خرابی بجائے خون خرابہ
6- ارژنگ = تصویروں کا البم　7- باڑھ گرنا = دھار کا کند ہو جانا　8- دونابی = دودھاری

459

نیشِ مژگاں سے ترے ازبس چمن معمور ہے
پھول جو گیندے کا ہے سو خانۂ زنبور ہے

دیکھیے حسن اُس کا تب، جب منھ سے وہ کھولے نقاب
غنچہ سبزی میں ابھی جوں دانۂ انگور ہے

دل لگانے کا مزہ اس باغ میں کیا ہے کہ یاں
آہ جو گل ہے سو اپنے حسن پر مغرور ہے

کب فروغِ گل لگے ہے اس کے حسنِ شوخ کو
برق کے آگے بھلا شعلے کا کیا مذکور ہے؟

فعل مختار[1] آدمی کو گرچہ کہتے تو ہیں لیک
میں نے جو دیکھا یہ مختاری میں بھی مجبور ہے

کیوں لیا ہے ڈال منھ پر پردۂ شرم و حیا
کچھ تو ان روزوں نگاہِ ناز کو منظور ہے

شیشۂ دل کو ہمارے طاقِ ابرو پر نہ رکھ
کیونکہ گرواں سے گرا یہ شیشہ چکنا چور ہے

سرد مہری ہم سے کی یاروں نے بعد از مرگ بھی
نے اگر کی بتیاں، نے پنبۂ کافور ہے

بدر پور[2] تک مصحفی تو آن پہنچا ہے تو کیا
بیٹھ مت رہیو ابھی، اے یار دلی دور ہے

460

نامہ آتا ہے نہ قاصد نہ خبر آتی ہے
بات بگڑی ہوئی کچھ مجھ کو نظر آتی ہے

ٹھیڑا[3] کیا یہ نکالا ہے اجل نے مجھ سے
دشمنِ جاں کہیں آوے بھی اگر آتی ہے

چوٹ جو دل میں محبت کی لگی تھی میرے
موسمِ گل میں وہ ہر سال ابھر آتی ہے

جعد تیری جو بڑھے اور تو کیا قہر کرے
اس درازی پہ تو وہ تا بہ کمر آتی ہے

کمیِ گریہ یہاں تک ہے کہ اب مژگاں پر
بوند اک آدھ بہ صد خونِ جگر آتی ہے

کیسی ہو جاتی ہے اس غنچۂ دل کو واشد
کوچۂ یار سے جب بادِ سحر آتی ہے

مصحفی اتنا یہ دعوائے فصاحت ہے عبث
سامنے اُس کے تجھے بات بھی کر آتی ہے؟

1- فعل مختار = یعنی فاعلِ مختار 2- بدر پور = دہلی کے جنوب میں ایک بستی ہے

3- ٹھیڑا = چُہل، چھیڑ خانی

461

وہ شرگیں ہے کوئی غرفے سے جھانکتا ہے
عالم گلی میں اُس کی کیوں خاک پھانکتا[1] ہے

بازارِ عاشقی میں لے جاؤں ہوں جو دل کو
ہر کوئی اُس کی قیمت دو بوسے آنکتا[2] ہے

زیرِ نگیں ہی اُس کے ہوتا ہے ماہ و انجم
ٹوپی اپنی جس دم وہ ڈانک[3] ٹانکتا ہے

پستے کی ہم گزک کے محتاج کب ہیں، ساقی
کھیرے کی تشتری میں اک آدھ پھانک تا ہے

جاتا ہے جب چمن میں وہ گلبدن تو گل بھی
ہو کر خجل منھ اپنا پتوں میں ڈھانکتا ہے

باتوں سے مصحفی کی تم مت خفا ہو، پیارے
شاعر فضول گو ہے نت ڈینگیں ہانکتا ہے

462

عرق سے چہرہ جب اُس کا زلال میں ڈوبے
نہ کیونکے گل عرقِ انفعال میں ڈوبے

شناوری بھی نہ کام آئی اپنی ماہی وار
غضب تو یہ ہے کہ ہم پھنس کے جال میں ڈوبے

یہ کس سے کھیلی ہے ہولی صنم کہ آتے ہو
تم آج رنگِ عبیر و گلال میں ڈوبے

بھنور سے کم نہیں طوقِ ہلال غبغبِ دوست
نہ کیونکے زورقِ بدر[4] اس ہلال میں ڈوبے

سوالِ بوسہ میں ان سے کیا تو ہو کے خجل
ؤ ہیں وہ فکرِ جوابِ سوال میں ڈوبے

لگی جو اُن پہ صنم تیغِ آب دار تری
سب استخواں مرے آبِ زلال میں ڈوبے

ترے خدنگِ نگہ کا ہو کیونکے سینہ سپر
یہ تیر وہ ہے تُو اتو ڑے ڈھال میں ڈوبے

بھنور سے ناف کے نکلے گی کیونکے زورقِ دل
رہیں ہیں ہم شب و روز اس خیال میں ڈوبے

کیا ستارۂ زیرِ شفق میں اُن کو خیال
ہیں خالِ رخ جو ترے رنگ لال میں ڈوبے

ہر ایک نقشِ قدم تھا جو صورتِ گرداب
ہزار کبک دری اس کی چال میں ڈوبے

اُٹھائے منھ سے تو پردہ جو اپنے وقتِ خسوف[5]
نہ آفتاب کی کشتی زوال میں ڈوبے

1- خاک پھانکنا = بے نتیجہ کام کرنا 2- آنکنا = قیمت کا اندازہ کرنا 3- ڈانک = چمکیلے ستارے
4- زَورق = کشتی 5- خسوف = سورج گہن

جو بحرِ حسن کے غواص ہیں اُنھوں کی نگاہ عجب نہیں جو ترے بال بال میں ڈوبے
ہمارے دیدۂ گریاں سے یہ ہوئی بارش کہ سیکڑوں کے گھر اس برشگال میں ڈوبے
ہوا نہ بوسۂ چاہِ ذقن کسی کو نصیب ہزار یوسفِ دل اس ملال میں ڈوبے
جو ڈوبنا ہو تو یوں ڈوب جائے کشتیِ عمر پہ جی کسی کا نہ روزِ وصال میں ڈوبے
الٰہی یوں ہی رہے آفتابِ جام طلوع نہ یہ ستارہ تو شامِ وصال میں ڈوبے
پڑے نہ ساحل و خورشید و مہ پہ اُن کی نگاہ جو تیرے لجۂ[1] حسن و جمال میں ڈوبے
ہے یہ بھی نوکری کچھ مصحفی کہ یاں تنخواہ
گر ایک سال ملے ایک سال میں ڈوبے

463

کیا صفِ مژگاں ہی نے برہم کئی دنگل کیے اُس کے اندازِ نگہ نے گھر کئی فیصل کیے
اُس کی بیماری کی دی قاصد نے جو آ کر خبر اُس خبر نے تو حواس اپنے بہت مختل کیے
زلف و کاکل کی گرہ کھولی، قبا کے بلکہ بند وصل کی اک شب میں میں نے کتنے عقدے حل کیے
تھے گلے میں اُس کے جو تعویذ چو پہلو[2] کئی جمع کر اُس نے وہی آخر کو سب ہیکل[3] کیے
فوجِ مژگاں ملکِ دل پر جب صف آرا ہو چلی میرے اشک و آہ نے بھی جمع دل[4] بادل کیے
کھیلے گہ چھلا چھپّول[5] ہم سے وہ گہ طاق جفت دل کے لینے میں بتوں نے کس قدر چھل بل کیے
کہہ دو قاتل سے کہ اب کر رکھے تیغ اپنی غلاف خونِ یک کشتہ نے یاں رنگیں کئی مقتل کیے
داؤ پر اپنے چڑھی اک شب نہ یہ کافر کبھو دخترِ رز نے یوں ہی یاروں کے کوڑی تل[6] کیے
اک تو تھی تابِ کمر ہی آفتِ جاں تس پہ آہ شور نے ہیکل کے تیری اور جی بیکل کیے
ہاتھ سے گوروں[7] کے جاں بر ہوویں کیونکر اہلِ ہند کام کرتے ہی نہیں ہرگز یہ بن کونسل[8] کیے

1- لجۂ = بھنور 2- چو پہلو = چو کھونٹے 3- ہیکل = گلے کا زیور 4- دَل بادل = گھنے بادل
5- چھلا چھپّول، طاق جفت، گھریلو کھیلوں کے نام ہیں۔ 6- کوڑی تل کرنا = کوڑیوں کے مول گنوانا
7- گوروں = انگریزوں 8- کونسل = Council

شکوۂ داغِ جگر بیجا ہے اس سے مصحفی
عشق کی آتش نے سینے سیکڑوں متقل کیے

464

چلے لے کے سر پر گناہوں کی گٹھری سفر میں یہ ہے روسیاہوں کی گٹھری
پڑی روزِ محشر وہیں برق آ کر جہاں تھی ترے دادخواہوں کی گٹھری
مسافر میں اس دشت کا ہوں کہ جس میں لٹی کتنے گم کردہ راہوں کی گٹھری
جہاں سوس[1] نے بحر سے سر نکالا میں سمجھا ہے کشتی تباہوں کی گٹھری
کلاہِ زری ماہِ نو نے اُڑا لی کھلی تھی کہیں کج کلاہوں کی گٹھری

هم ان سرقہ والوں میں اے مصحفی ہیں
چُراتے ہیں جو بادشاہوں کی گٹھری

465

شوخی کے جو صدقے کوئی ہو جائے کسی کے پھر کیونکے نہ لالے پڑیں اس شخص کو جی کے
کیا عمر تو جاتی ہے قدم جلد اُٹھائے قربان ہیں ظالم تری اس تیز روی کے
ہیں طوق کے قابل یہ کہ ہاتھوں نے ہمارے لوٹے ہیں محرّم میں مزے سینہ زنی کے
یاد آتی ہیں مجھ کو وہ تری پیار کی نظریں کرتا ہے مروّت جو کوئی ساتھ کسی کے
ایسا نہ ہو پہنچے دلِ معشوق کو صدمہ ہیں ڈھنگ برے اس قلقِ نیم شبی کے
ہم رشک سے کس کس کے مریں ہم کو یقیں ہے تجھ سے نہیں چھٹنے کے یہ اطوار ہنسی کے

اے مصحفی ہم جائیں کہاں، ہائے رے ظالم
مارے ہوئے ہیں اس بتِ کافر کی ''اجی'' کے

466

چونکا جو شب میں سن کر آوازِ پا کسی کی اتنے میں آکے لوٹی[2] سر پر قضا کسی کی

1- سُوس = مگرمچھ 2- لوٹی (بروزن چوٹی) سر پر پھری

ہر اک سخن میں کیوں پھر خاطر تری رکھیں ہم رکھتا ہے تو بھی خاطر، اے بے وفا کسی کی؟
کیا پوچھتے ہو مجھ سے تم میرا حال یارو خوں میں لٹا گئی ہے مجھ کو حنا کسی کی
مت حسنِ عارضی پر اے گل تو پھول اتنا رہتی نہیں ہمیشہ یکساں ہوا کسی کی
بیمارِ غم نے تیرے دی جاں بہ نا امیدی آخر نہ راس آئی اُس کو دوا کسی کی
رخسارِ گل کو رکھ کر تلووں تلے ملوں ہوں آتی ہے یاد مجھ کو جب پشتِ پا کسی کی
اُس کے نہ بولنے پر مرتے ہیں مصحفی ہم
کیا جانے کیا کرے گی شرم و حیا کسی کی

467

گو نہ صورت تو دکھا او بتِ طنّاز اپنی خواب میں آکے سنا جا مجھے آواز اپنی
گر یہی منھ کا چھپانا ہے تو آ در پہ ترے جان دیوے گا کوئی عاشقِ جاں باز اپنی
آ گیا اُس کو بھی غش میری طرح، آئینے میں جوں ہی دیکھی نگہِ حوصلہ پرواز اپنی
کر کے پر بستہ رکھے گو کہ قفس میں صیّاد بہ تصوّر ہے وہی شوخیِ پرواز اپنی
میں نے جو بات بنائی وہ بگڑتی ہی گئی ساز داری کہوں کیا، طالعِ ناساز اپنی
جی ہی جی میں میں تصوّر سے کروں ہوں باتیں تا نہ سن لیوے حکایت کوئی غمّاز اپنی
چہرۂ غیر کی اب وقف ہوئی یا قسمت نگہِ یار کہ تھی محرمِ ہمراز اپنی
مصحفی شب جو تصوّر میں ترے تھا دمِ نزع
اُس نے اک بات پہ دی جان بہ صد ناز اپنی

468

آدمیت سے بھرا ہو جو سراپا آدمی یوں بچھڑ جاوے یکایک ہائے ایسا آدمی
خوب رو دیکھے ہزاروں گرچہ اپنی عمر میں آج تک ہم نے و لے تجھ سا نہ دیکھا آدمی
منھ سے جب اُلٹا نقاب اُس حسنِ شہر آشوب نے ہو گئے اُس وقت لاکھوں جا سے بے جا آدمی

عشق کا کوچہ وہ کوچہ ہے کہ جس میں ہم نشیں بات کہتے وو ہیں ہو جاتا ہے رُسوا آدمی
اے زلیخا جان اس سودے کو تو سودائے مفت چرخ نے یوسف سا تیرے ہاتھ بیچا آدمی
کون محرم تھا کہ کچھ اس بت کو ہم کہہ بھیجتے؟ یہ سمجھ کر ہم نے واں آپھی نہ بھیجا آدمی
پھبتیاں دو چار جو میں نے کسیں ہنس کر کہا خوش نہیں آتا مجھے ایسا نرالا آدمی
خاک کو میری بھی گر چاہے کرے باغ و بہار وہ جو مشتِ خاک سے کرتا ہے پیدا آدمی

تو گیا اودھر کیا یاں مصحفی نے اپنا خوں
سچ ہے پیارے، کیا کرے جی کر اکیلا آدمی

469

تو ہی اے شمع کچھ اب فکر کر اٹھوانے کی ہے پڑی لاش لگن میں ترے پروانے کی
نیند کھو دیوے ہے افسانۂ شوریدہ سراں خاصیت اُلٹی ہے کہتے ہیں اس افسانے کی
کوئی ثالث تو نہ تھا، یہ نہیں معلوم ہمیں دوستی کیونکے ہوئی شمع سے پروانے کی
کچھ تو ہے عالمِ صحرا میں کہ ہر مرغِ اسیر راہ لیتا ہے وہیں چھٹتے ہی ویرانے کی
گوجری سے یہ تری شکل کا عالم ہے کہ بس جیسے تصویر ہو گجرات کے بت خانے کی
زیب دیتا ہے جنھیں عالمِ بے ساختگی قدر و قیمت نہیں واں آئینہ و شانے کی
داغ سینے کے مرے دیکھ کے خاموش ہوئے تھی ہوس جن کو ترے عشق میں گل کھانے کی

مصحفی ہے ابھی اس بحر میں خامے کو مرے
اور بھی حرص کئی شعر کے لکھوانے کی

470

کیا کہوں ہائے میں اُس شوخ کے شرمانے کی جو ادا ہے سو مرے خاک میں مل جانے کی
آدمی دیکھ کے جیتا اُسے پھر کیونکے رہے آرزو جس پہ فرشتے کو ہو مر جانے کی
واں سرِ چاکِ جگر طول کیے جاتا ہے یار ہیں فکر میں یاں جیب کے سلوانے کی
ہوں وہ آوارۂ صحرائے محبت میں جسے راہ ہے یاد نہ کعبے کی نہ بت خانے کی

باغ میں طرّۂ سنبل نے مچائیں دھومیں وضع دیکھی جو تری زلف کے بل کھانے کی
دل تو کیا چیز ہے، ہے جان بھی حاضر صاحب بات یہ کون سی ہے آپ کے فرمانے کی
تو نے کس آنکھ سے دیکھا تھا خدا جانے اُسے وحشت اب تک نہیں جاتی ترے دیوانے کی
مصحفی شمع نے کی تب کہیں دھیا کی تلاش
جب لگن میں نہ رہی خاک بھی پروانے کی

471

دلبر کی تمنائے برو دوش میں مرجائے کیا یوں ہی کوئی حسرتِ آغوش میں مرجائے
قبر اُس کی پہ لازم ہے خُمِ مے کا چڑھانا جو مست کہ عشقِ بتِ مے نوش میں مرجائے
ہے طرفہ اذیّت، کوئی کس طرح خدایا یادِ صنم وعدہ فراموش میں مر جائے
سرگوشی کی رخصت نہ کبھی غیر کو دینا گر وہ ہوسِ زلف و بنا گوش میں مرجائے
گر غنچۂ مجوب تری وضع کو دیکھے اندازِ حیائے لب خاموش میں مر جائے
اللہ رے برقع ترا اور اُس کے یہ روزن دیکھے جو چھپا یوں تجھے روپوش میں مرجائے
کیا فائدہ پھولوں کی چھڑی اُس پہ لگانا؟ اے گل، جو تری ایک ہی پاپوش میں مرجائے
یارب نہ وہ دن اُس کے تو عاشق کو دکھانا معشوق کے آتے ہی جو آ جوش میں مرجائے
آتا ہے مجھے مصحفی دل اپنے پہ رونا
افسوس ہے یوں غش سے وہ آ ہوش میں مرجائے

472

بجا ہے کہیے موجِ آب کو گر آب کی لکڑی وگرنہ قافیہ یہ بھی ہے جوں سیماب کی لکڑی
کبھی نیرنگ ہیں، ہیں اس غزل میں قافیے جتنے کوئی لکڑی نہیں رنگین جز عناب کی لکڑی
تخیّل میں مگر اپنے کوئی باندھا کرے مہمل کبھی قندیل مسجد کی، کبھی محراب کی لکڑی
یہ جتنی لکڑیاں ہیں قابلِ آتش ہیں جوں ہیزم اگر گوے فلک کے ہو در اصطرلاب کی لکڑی

کرخت اس طرح کے مضموں کوئی نجّار[1] ہی باندھے کہ خاقانی بنے گھڑ معنیِ نایاب کی لکڑی

ملایم گفتگو اپنی ہے ہم تو مصحفی گا ہے

جو باندھیں بھی تو پھر اس طرح باندھیں، آب کی لکڑی

473

نہ ہو آتش کے قابل کشتیِ غرقاب کی لکڑی

غذائے آب ہی ہوتی ہے آخر آب کی لکڑی

یہ نسبت نتھ کے حلقے سے ہے اب اُس گُل کی پتّی کو

کہ جیسے ساتھ ہو قلّاب کے قلّاب[2] کی لکڑی

رکھی کل لب پر انگشتِ حنائی اُس نے اس ڈھب سے

کہ جس کو دیکھ تپ کرنے لگی عناب کی لکڑی

جہاں سرمہ دیا آنکھوں میں اُس نے سو رہا جا کر

بجا ہے کہیے میلِ سرمہ[3] کو گر خواب کی لکڑی

گئے وے دن کہ سیرابی کرے تھی موجِ اشک اُن کی

ہر اک مژگاں ہے اب اس دیدۂ بے خواب کی لکڑی

نہ ہووے عالمِ بالا میں کیونکر روشنی ہر سو

بنے جب آہ اپنی مشعلِ مہتاب کی لکڑی

نہ نکلا اشک کے ورطے سے باہر یہ تنِ لاغر

بنایا ناتوانی نے اسے گرداب کی لکڑی

نہ چھوڑا بعدِ مردن بھی مجھے سرگشتگی تو نے

بنائے استخوانِ تن مرے دولاب کی لکڑی

1- نجّار = بڑھئی 2- قلّاب= (قلّہ + آب) ڈولچی 3- میلِ سرمہ = سرمے کی سلائی

عصائے آہ لے دروازے تک گاہے وہ آتا ہے
یہی بیمار کو تیرے ہے حق الباب کی لکڑی

مجھے وضعِ شلائینِ دلِ شوریدہ بھاتی ہے
فقیروں پاس کم ہے ایسی پیچ و تاب کی لکڑی

اگر اس در پہ گستاخانہ میں گاہے قدم رکھا
تو میرے سر پہ توڑی چرخ نے محراب کی لکڑی

غزل کہہ کر خیالی مصحفی صد آفریں تو نے
نہالِ عشق کی ہے پھر یہ آب و تاب کی لکڑی

474

تہ پٹی[1] سیروے ہیں صندل شاداب کی لکڑی
ہوئی ہے صرف پایوں میں وہاں عناب کی لکڑی

ستم لایا ہے مجھ پر انگلیوں کا اس کی چٹکانا
نہ ٹوٹی ہوگی یوں شاخِ گلِ سیراب کی لکڑی

ہروتی[2] اُس کی ہے یہ سرخ خونِ بے گناہاں سے
نہیں لگتی ہے جس کو مسلخِ قصاب کی لکڑی

تہِ دل سے مرے آگاہ ہے مدِّ نگاہ اُس کی
خبر مینا کو جوں دیتی ہے عمقِ آب کی لکڑی

ڈسا ہو جس کو مارِ فندقِ انگشت نے اُس کی
بجائے زہر مہرہ گھس کے دیں عناب کی لکڑی

چوایا اک دو چمچہ منہ میں شربت اُس کے تب تو نے
ہوئی جیب اینٹھ کر جب عاشقِ بیتاب کی لکڑی

کھڑاویں پہن کر مرجاں کی وہ پائے نگاریں میں
کہے ہے، ہے یہ پروردہ کسی خوں ناب کی لکڑی

طبیبِ مہرباں نے فصد کو اُس وقت فرمایا
ہوئی جب سوکھ کر رگ رگ دلِ بیتاب کی لکڑی

پلنگ اے دوستاں جو چہچہاتا ہے رنگت میں
یہ کس کے خون نے اس نخل کی سیراب کی لکڑی

در اس کے پر قدم کیوں کر رکھوں جس دم نظر آوے
مجھے مرغول اینٹی اور پھرے محراب کی لکڑی

نظارہ تو کیا اُس مہ کا میں در کھولتے لیکن
ذرا اک بھوں کی حایل ہوگئی محراب کی لکڑی

1- پلنگ کے طول و عرض کے ڈنڈے 2- ہروتی = چھوٹے ہتھیار کا نام

پھنکیتی[1] میں اسے پہنچے ہے کب اے مصحفی کوئی
یہاں پانی بھرے ہے رستم و سہراب کی لکڑی

475

مجھے نت کر کے بسمل ہی وہ قاتل چھوڑ جاتا ہے
کوئی بھی خاک و خوں میں اپنا بسمل چھوڑ جاتا ہے

اثر یہ طرفہ میں اس خاکِ دامن گیر میں دیکھا
جو جاتا ہے ترے کوچے سے وہ دل چھوڑ جاتا ہے

کیا منعم نے گر اسباب دنیا جمع کیا حاصل
کہ جب جانے لگے ہے سب وہ حاصل چھوڑ جاتا ہے

کہیں رُسوا نہ ہو نالوں سے بہر رفعِ بدنامی
وہ گل مجھ پاس ہی ہر شب حمایل چھوڑ جاتا ہے

اس آتش باز کے لڑکے کا آنا یاں نہیں بہتر
چھچھوندر[2] نت نئی آکر بہ محفل چھوڑ جاتا ہے

جو جاتا ہے بدن کو چھوڑ کر دنیاے فانی سے
وہ جاتے وقت گویا نقشِ باطل چھوڑ جاتا ہے

اسیرِ چاہِ زنداں جب سے ہیں، سنگِ ملامت کے
جو جاتا ہے ہمارے سر پہ اک سل چھوڑ جاتا ہے

مرے شورِ جنوں سے نام مجنوں ہوگیا روشن
پدر ناخواندہ جوں فرزندِ قابل چھوڑ جاتا ہے

چلے ہے کارواں اشکوں کا جب آہوں کی آتش سے
نشانِ داغِ دل منزل بہ منزل چھوڑ جاتا ہے

1- پھنکیت = چالباز، عیار 2- چھچھوندر = آتشبازی کی ایک قسم

گرا کر، پھینک کر، ہوتی ہے جس کو عشق کی مستی
وہ ناقہ وادیِ مجنوں میں محمل چھوڑ جاتا ہے

نگاہیں سینکڑوں ماریں ہیں جا کر آب میں غوطہ
وہ پوشاک اپنی جب بر روے ساحل چھوڑ جاتا ہے

نہ بھولوں تا کہ میں فرقت میں ہے جو زیب و رعنائی
تصوّر اپنا وہ میرے مقابل چھوڑ جاتا ہے

کرے ہے مصحفی جس جا کہ اصلاحِ سخن سنجاں
کتاب اپنی وہاں سحبان وائل [1] چھوڑ جاتا ہے

476

بوسہ نہ ایک لب کا لیا مصحفی نے ہائے
کس کس طرح سے تجھ کو نہ مسلا کسی نے ہائے

عالم یہ حسن کا ہے کہ بے اختیار ہو
صورت کو اُس کی دیکھ کہا آرسی نے ہائے

بن ٹھن کے جس گھڑی تو بنا تھا پری کی شکل
دیکھا نہ اُس گھڑی تجھے، کافر پری نے ہائے

کچھ مجھ سے ہو گئی جو خطا لگ گیا یہ سوچ
یہ کیا کیا اس ایسے بھلے آدمی نے ہائے

تیرے گلے میں پڑتے ہی پہنچا دیے، میاں
کتنوں کے دم گلے میں تری دھکدھکی [2] نے ہائے

کرتا میں تیری چاہ کی نازش پہ کیا کروں
ظالم مری طرح تجھے چاہا سبھی نے ہائے

اُس گل کی یاد میں یہ قلق تھا کہ تا بہ صبح
سونے دیا نہ رات مجھے بیکلی نے ہائے

ہونٹوں کو اُس کے دیکھ کے مر مر گئی ہے خلق
کیا کیا سمیں دکھائے ہیں پان اور مسی نے ہائے

یوں بے گناہ خاک میں ہم کو ملا دیا
اے سروِ خوش خرام تری کج روی نے ہائے

کیا تجھ سے اب گلہ میں کروں، مجھ غریب کو
رُسوا کیا جہاں میں تری دوستی نے ہائے

اک خندہ رو پہ دیتے ہیں ہم جان مصحفی
رکھا ہے مار ہم کو تو اس کی ہنسی نے ہائے

1- سحبان وائل: قدیم عرب کا ایک زبان داں اور خطیب　2- دھکدھکی = گلے میں پہننے کا زیور

477

گلبدن پوشوں سے میرا دل سراپا داغ ہے — یار سمجھیں ہیں نشاط افزا یہ پائیں باغ ہے
قاصدا احوالِ غریباں واجب الابلاغ[1] ہے — پر غضب ہے یہ کہ تو سمجھا لہو ولاغ[2] ہے
اک طرف داغوں کے لالے، اک طرف آہوں کی دوب — سطح سینے کا مرے ہم باغ ہے ہم راغ ہے
سر سے اپنی تیرہ بختی آہ ٹل سکتی نہیں — اُس میں اور اس میں مگر ربطِ جہاز و زاغ[3] ہے

رکھ کے خط میں گھونگچی بھجوا دی اُس کو مصحفی
تا وہ سمجھے اس کا دل کچھ خوں ہے اور کچھ داغ ہے

478

ترے چاہت بھرے سینے کے صدقے — ترے الفت بھرے کینے کے صدقے
جب آئینے میں منھ دیکھے ہے اپنا — وہ خود ہوتا ہے آئینے کے صدقے
تری مہندی کے اور پوروں کے قرباں — ترے چھلّوں کے اور مینے کے صدقے
شب آدینہ گر ساقی تو دے جام — میں ہوں شوخی سے آدینے کے صدقے
تصوّر کو نہیں جس جا رسائی — میں اُس پوشیدہ گنجینے کے صدقے
جدائی میں ہمیں جینا پڑا ہے — عجب جینا ہے، اس جینے کے صدقے
دوشالے پر اگر منعم ہے نازاں — گدا ہے اپنے پشمینے کے صدقے
قدم رکھے تو جس زینے پر، اے ماہ — فلک ہو کیوں نہ اس زینے کے صدقے

قیامت مصحفی تو ہے بلا نوش
ترے بھر بھر قدح پینے کے صدقے

479

گردش میں جو ہے کاسۂ افلاک کی مٹّی — مٹّی میں ملی اُس کی ہے کیا خاک کی مٹّی

1- واجب الابلاغ = جس کا پہنچانا ضروری ہو 2- لہو ولاغ = کھیل، فضول
3- یعنی: جیسے اُڑے جہاج کا پنچھی پھر جہاج پر آوے

پامالِ حوادث ہے یہاں تک وہ، کہ گویا روندے ہے کوئی عاشقِ غم ناک کی مٹّی
دامن تو بہت گرد سے جھاڑا میں ولیکن ہرگز نہ جھڑی پیرہنِ چاک کی مٹّی
ڈرتا ہوں کہ میری ہی طرح اور بھی سیانا منگوائے نہ پائے بتِ چالاک کی مٹّی[1]
اس گل کی ہوا داری کہاں اور بگولا برباد ہے ناحق خس و خاشاک کی مٹّی
تربت سے مری نکلیں ہیں پر پیچ جو آہیں کیا اس میں ملی تھی شجرِ تاک کی مٹّی؟
تیروں کے نشاں لاکھوں ہیں اس پر نہیں کھدتی کیا سخت ہے اِس تودۂ افلاک کی مٹّی
ہم خاک میں جاتے تھے ملے جب کہ ملائک کرتے تھے خمیر اُس کے تنِ پاک کی مٹّی

یوں مصحفی گریہ سے بہی دل کی کدورت
برسات میں جوں خانۂ نمناک کی مٹّی

480

ملادے اس بتِ کافر کو تک کہ جی سنبھلے الٰہی یوں ہو تو تیرا یہ مصحفی سنبھلے
دماغ ناز اُٹھانے کا اب رہا ہے کسے بھویں تن اس پہ میاں، جس سے یہ کجی سنبھلے
زبسکہ مست کیا ہے چمن نگہ نے تری نہ گل ہی ہوش میں آوے نہ اب کلی سنبھلے
کرے تھا جس کی نزاکت پہ سوگرانی گل بڑا ستم ہے گر اس ہاتھ سے کلی سنبھلے
بناؤ اپنا جو دیکھے وہ میری آنکھوں سے نہ اُس کے دستِ حنائی میں آرسی سنبھلے
وہ گل جو دیکھے مرے رنگِ زعفرانی کو یہ رنگ ہو کہ نہ پھر ایک دم ہنسی سنبھلے
صفائے رخ پہ ترے حور کو بھی ہو لغزش جو دیکھے گات کو تیری نہ پھر پری سنبھلے
گرا دیا ہے اسے تو نے اپنی نظروں سے ترا مریض میں لکھ دوں اگر کبھی سنبھلے
ابھی تو قہر کا دریا ہے جوشِ طوفاں میں مزاج اُس کا اگر بعدِ آشتی سنبھلے
شراب خانۂ الفت میں ہیں ہزار مزے ولیک تب جو ذرا اس میں آدمی سنبھلے

بہ روے بسترِ غم مصحفی پڑا ہے نڈھال
گر اُس کو تیری مدد ہو تو یا علی سنبھلے

1- سفلی عمل کرنے والے سیانے کسی کے پیروں تلے کی مٹی منگوا کر اُس پر اپنا عمل کرتے تھے

481

بے اختیار دل کو کھینچے ہے الفت اُس کی
کیا جانے کیا کرے گی کم بخت چاہت اُس کی

پردے سے منھ دکھانا، غرفے سے جھانک جانا
ہے اس قدر تو بارے اب بھی مروّت اُس کی

دل میں تو لاکھ باتیں گزریں ہیں پر یہ ڈر ہے
اس منھ سے ہم کریں گے کیونکر شکایت اُس کی

حالت کو دیکھ اپنی مرتے ہیں رشک سے ہم
کس کس کے دل میں ہوگی یوں ہی محبت اُس کی

کشتے کا اپنے آئے تب تم طواف کرنے
برباد ہوگئی جب سب خاکِ تربت اُس کی

کچھ مجھ سے اور اُس سے ہونے لگا جو قصہ
کیا کیا نہ لوگ آئے کرنے حمایت اُس کی

نامہ لکھا ہے اُس نے مجھ کو بہ خطِ کوفی
آتی نہیں سمجھ میں ہرگز عبارت اُس کی

بالیں پہ مصحفی کی آتا جو تو دم نزع
بارے نکل تو جاتی کچھ دل سے حسرت اُس کی

482

وصل کی شب کا وہ جب تک نہ سرانجام کرے
جس نے بے چین کیا مجھ کو نہ آرام کرے

اُس کی چتون سے بڑا پیار ٹپکتا ہے ہنوز
مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چتون کہیں بدنام کرے

آ گیا قہر میں بندہ یہ کسے تھا معلوم
اک نگہ غارتِ دین و دل و آرام کرے

اپنے سائے سے بھی ہر لحظہ جو رم کرتا ہو
ایسے وحشی کو بھلا کیونکے کوئی رام کرے

یہ ستم کیونکے میں دیکھوں، مری آنکھوں کے حضور
قسمتِ غیر وہ سو پیار کی دشنام کرے

دل کے ہاتھوں تو رہے کام مرے سب برہم
کیونکے اس دل کو چلاوے کوئی کیا کام کرے

آشنا تھے سو ہوئے دشمنِ جانی اپنے
آہ کس کس سے کوئی نامہ و پیغام کرے

ساقیِ پیرِ خرابات کا کیا نقصاں ہے
مجھ سے تشنہ کی تسلّی جو بہ یک جام کرے

مصحفی جس کو نہ ہووے سر و سودائے بتاں
جاوے گھر بیٹھ رہے چین سے، آرام کرے

483

نے بت ہے، نہ سجدہ ہے، نے بادہ، نہ مستی ہے — یاں شعر پرستی ہے یا حسن پرستی ہے
ساعد سے ترے شعلے یوں حسن کے اُٹھتے ہیں — ہاتھوں میں ترے گویا مہتابی دستی[1] ہے
بیماریِ سل سے کم سمجھو نہ غمِ الفت — یہ سل مرے سینے سے اب کوئی اُکستی[2] ہے؟
معمورۂ دل اپنا ویران رہا برسوں — وہ کون سی بستی ہے کیا جانے جو بستی ہے؟
مسّی کی دھڑی اُس کی نظروں سے جو ہے غائب — یارب وہ سیہ بدلی کیدھر کو برستی ہے؟
بلبل کو قفس سے کب صیاد تو چھوڑے گا؟ — نظارۂ گل کو یہ ہر سال ترستی ہے

سر دے کے بھی ہاتھ آوے گر تیغِ خمِ ابرو
اے مصحفی ہم تو بھی سمجھیں ہیں کہ سستی ہے

484

طفلی میں یہ تھے اس بتِ محجوب کے چھلّے — پہنے تھا وہ پوروں میں بنا دوب[3] کے چھلّے
کیا سینے کے چھلوں کی کثرت اس کے بتاؤں — دیکھے نہیں میں نے تو اُس اسلوب کے چھلّے
قسمت میں لکھا تھا کہ تری تیغ کے ہاتھوں — ہوں زخمِ ہلالی مرے مکتوب کے چھلّے
زیور جو دوانوں کا نہ ہو سختیِ دوراں — لوہے کے کڑے ہوویں نہ مجذوب کے چھلّے
ہاتھوں کو ترے دیکھ جیسے کیا کوئی کافر — پوریں وہ بلاتس پہ اس آشوب کے چھلّے
قلاب بنیں کیوں نہ پئے صیدِ نہنگاں — مچھلی کے کڑے ہیں مرے محبوب کے چھلّے

ہے مصحفی گل کھانے کی پھر کون سی صورت
طالب کے نہ ہاتھ آویں جو مطلوب کے چھلّے

485

آڑو کی کچی ہے گل مہتاب میں لکڑی — یا ہے یہ مرصع درِ خوش آب میں لکڑی

1- مہتابی دستی = آتشبازی، پھلجھڑی 2- اُکسنا = نکلنا 3- دوب = گھاس

شاید ترے غرفے کے لیے جا کے عصا ہو　　پھینکی تو ہے نالے کی میں گرداب میں لکڑی
یوں مدِ نگہ ناف میں گم ہو گئی اس کی　　جوں گرتے ہی ڈوبے نہ کبھی آب میں لکڑی
دشوار ہے بے دم ہی کو دریا سے گزرنا　　دم دار تو ڈوبے نہ کبھی آب میں لکڑی
گر غیر نے پھولوں کی چھڑی اُس کو چھوائی　　غیرت سے چبھی یاں دلِ بیتاب میں لکڑی
ہوں ہاتھ مرے طوقِ گلو یار کے جب تک　　پیوند ہو شاخِ گلِ سیراب کی لکڑی
سوتے ہیں تصوّر میں جو نازک کمروں کے　　آتی ہے نظر بید ہی کی خواب میں لکڑی

اے مصحفی دربان سے لے تا بہ معلّم
اک دخل عجب رکھتی ہے ہر باب میں لکڑی

486

مژدہ عشاق کو پہنچے شبِ تار آتی ہے　　گلشنِ وصل کے لٹنے کی بہار آتی ہے
روحِ مجنوں جو نہیں ہے تو بھلا ہے پھر کون؟　　یہ جو نت تُربتِ لیلیٰ پہ پکار آتی ہے
تربتِ قیس کو میں دیکھ کے رو دیتا ہوں　　دور سے بھی جو نظر لوحِ مزار آتی ہے
کششِ عشق ہے جو وادیِ مجنوں کی طرف　　نت لیے ہاتھ میں ناقے کی مہار آتی ہے
کوہ کن سے کوئی کہہ دو، دو قدم سیر تو کر　　شیریں اس دشت میں از بہرِ شکار آتی ہے
جو بگولا کہ ہوا وادیِ مجنوں سے جدا　　وہ یہ سمجھا کہ مری ناقہ سوار آتی ہے
ہجر اور وصل کا عالم تو بہت دیکھ چکے　　صورت اب کون سی دیکھیں تو دوچار آتی ہے
لگ چلا ہے تو بہت، اس سے مجھے سوجھے ہے　　آج کل موت تری اے دلِ زار، آتی ہے

مصحفی ہجر میں تو وصل سے نومید نہ ہو
صبر کر پھیر وہی لیل و نہار آتی ہے[1]

487

دیا نہیں قلقِ دل پہ اختیار مجھے　　رفیق و دوست ملامت کریں ہزار مجھے

1- ازروئے قواعد "لیل و نہار آتے ہیں" کہنا چاہیے، مگر یہ عوامی اظہار ہے۔

لحد میں بھی مری آنکھیں کھلی ہیں کیا جانے بوقتِ نزع رہا کس کا انتظار مجھے
الٰہی عمر تغافل دراز ہو جس نے نت آرزو ہی میں رکھا امیدوار مجھے
صفا کا اپنی یہ عالم ہے اب کہ دشمن و دوست بہ رنگِ آئینہ پاتے ہیں بے غبار مجھے
نقاب یاں تو نہ اُٹھے بتوں کے مکھڑے سے مگر بروز قیامت کریں دو چار مجھے
نگاہیں لاتی نہیں تابِ حسن، حیراں ہوں کیا ہے آتشِ سوزاں سے کیوں دوچار مجھے
شروعِ حسن سے اس گل کے مجھ کو سوجھے ہے کہ ایک روز جلاوے گا یہ شرار مجھے
میں اُن کا کیوں نہ ہوں ممنوں کہ باغ میں نہ گئے دکھائی آنسوؤں نے سیرِ آبشار مجھے

خدا کے واسطے اب مصحفی تو چپ مت رہ
ستا رہا ہے بہت نالۂ ہزار مجھے

488

اب کے برس چمن میں گر ہم وطن کریں گے آنکھوں کو بند کر کے سیرِ چمن کریں گے
پانی میں ڈوبے گر ہم تو سر کے بال وا کر ماتم ہمارا واں بھی یہ سیم تن کریں گے
ہاتھ اپنے کیا لحد میں یوں ہی رہیں گے بیٹھے ہم چاک چاک واں بھی جیب و کفن کریں گے
یہ ضعف و ناتوانی گر ہے تو ہم دوانے کاہے کو موسمِ گل دیوانہ پن کریں گے
مت سر کے بال اپنے تو منھ پہ چھوڑ، کافر مردم قیاس اس کو سورج گہن کریں گے
شمشیر گر یہی ہے اور یہ ہی گر کمر ہے تو ترکِ سر ہزاروں شمشیر زن کریں گے
اپنی بساط میں ہے گلہائے بوسہ چھٹ کیا اک روز ان گلوں کو نذرِ سمن کریں گے
مجلس سماع کی ہے یہ کچھ کہ صبح ہوتے دیکھو گے پرزے پرزے ہم پیرہن کریں گے
اس کو رقیب نے گر ہم سے جدا کیا تو ملنے کا اُس کے ہم بھی کچھ اور فن کریں گے
آخر تو عرش پر ہیں ارواحِ شاعراں بھی جاویں گے واں تو ان کی گرم انجمن کریں گے

بعد از فنا بھی ہم سے اے مصحفی نہ ہوگا
ہم اس زباں کے ہوتے ترکِ سخن کریں گے؟

489

کرتے ہیں چھپ کے سب سے ہم اس کو پیار گاہے　　ہو جاوے ہے بدزدی بوس و کنار گاہے

کیا نجد کی طرف کو آتا ہے ناقہ ہردم　　اس دشت سے اُٹھے ہے گرد و غبار گاہے

اے چرخ بے مروت کیا ہو جو رفتہ رفتہ　　پاوے امید اپنی امیدوار گاہے

وہ طاقت اب کہاں ہے جو ہم سے ہجر کی شب　　ہوتا تھا نالہ سرزد بے اختیار گاہے

یاروں کے دل سے ایسے بھولے کہ اب قدم بھی　　پڑتا نہیں کسی کا سوے مزار گاہے

سو بار آئینے کو دیکھا ہے تو نے، غافل　　اب تک نہیں ہوا تو اپنے دوچار گاہے

یار اک طرف، کہ یارو وہ غم بھی ہم سے روٹھا　　دیتا تھا دل جگر کو جو غم فشار گاہے

کہہ دے کہ اک کنارے رستے پہ جا کے بیٹھے　ق　دیکھا نہ ہو گر اُس نے اُس کو شکار گاہے

اے باد مصحفی را زو زودتر خبر کن

کاں شاہ حسن دارد عزمِ شکار گاہے

490

خدا کی قسم پھر تو کیا خیر ہووے　　ہم اور تم اکیلے ہوں اور سیر ہووے

کریں غیر کا شکوہ کس طور پھر ہم　　نہ اپنے سوا جب کوئی غیر ہووے

زیارت کریں دل میں کعبے کی اپنے　　جو مجھ سا کوئی ساکنِ دیر ہووے

ملے ایسے زردار سے کس کی جوتی　　نہ عیار جس سے ترا پیر ہووے

اگر خاموشی کو میں گویائی لکھوں　　تو دیواں مرا منطق الطیر[1] ہووے

ہوا خصم جاں مصحفی وہ تو تیرا

نہ انساں کو انسان سے بیر ہووے

491

کپڑے بدل کے آئے تھے آگ مجھے لگا گئے

اپنے لباسِ سرخ کی مجھ کو بھڑک دکھا گئے

1- منطق الطیر = علم تصوف میں مولانا فریدالدین عطار نیشاپوری کا مشہور رسالہ

بیٹھے ادا سے ایک پل ناز سے اُٹھے پھر سنبھل
پہلو چرا گئے نکل جی ہی مرا جلا گئے

رکھتے ہی در سے پا بروں لے گئے صبر اور سکوں
فتنۂ خفتہ تھا جنوں، پھر وہ اسے جگا گئے

مجھ کو تو کام کچھ نہ تھا گو کہ وہ تھے پری لقا
بارِ خدا یہ کیا ہوا کیوں وہ مجھے ستا گئے

ہے یہ عجب طرح کی بات کیونکے نہ ملیے اپنے ہاتھ
دل پہ ہمارے وہ تو رات چوکی سی اک بٹھا گئے

سحر کیا کہ ٹوٹکا آئی یہ وائے کیا بلا
ہائے یہ جی کدھر چلا زور ادا دکھا گئے

گرچہ نہ تھے کچھ اتنے گرم لیک دکھا ادائے شرم
دل کو لگے جو نرم نرم سخت قلق لگا گئے

آویں گے پھر بھی مصحفی دیکھنے میرے گھر کبھی
اٹکا ہے اب تو ان سے جی گرچہ وہ منھ چھپا گئے

492

شب فراق نہ کچھ مجھ کو خواب میں گزری
تمام شب قلق و اضطراب میں گزری

فراق تلخ پہ تیرے یہی تھا کیا کہیے
جو جاں کنی کی سی حالت شباب میں گزری

نہ پوچھ مجھ سے شب گور کا تو حال اے دوست
عجب طرح کے سوال و جواب میں گزری

میں اُس کو اپنا ہی لختِ جگر قیاس کیا
جو پتّی گل کی کہیں موجِ آب میں گزری

رہا جدا تو میں زلفوں سے اُس کی ہجر کی شب
یہ کیا کہوں کہ عجب پیچ و تاب میں گزری

نہ نکلے تم تو کہیں پردۂ حیا سے بروں
بھلا ہوا کہ تمھاری نقاب میں گزری

شب سیہ میں نہ دیکھے تھے ہم نے یار بغیر
قلق، جو ہم پہ شب ماہتاب میں گزری

ہوئی جو روزِ تولّد سے سرد مہری عام تمام عمر ہماری عذاب میں گزری
رہا تو غیر کے گھر مستِ خواب کیا جانے کہ رات کیونکے کسی کی عذاب میں گزری
بلا کشوں کی بھی بارے گزر گئی کیا غم جو مے کشوں کی شراب و کباب میں گزری

تجا جہان کو کیوں مصحفی میں حیراں ہوں
یہ کیا ترے دلِ خانہ خراب میں گزری

493

تو فراق دیدہ کم ہے تجھے کیا خبر کسی کی کہ ترے فراق میں ہے مژہ کیونکے تر کسی کی
یہ عدم کے جانے والے گئے ایسے ہی عدم کو کہ خبر نہ لے کے آیا کوئی نامہ بر کسی کی
تجھے ڈر ہے یہ بہ فرقت یہ نہ ہو کسی پہ عاشق مجھے غم ہے یہ کہ تجھ پر نہ پڑے نظر کسی کی
ترے دورِ زلف و خط میں یہی رنگ ہے تو اے گل نہ ہوئی ہے اور نہ ہوگی شبِ غم سحر کسی کی
شبِ ہجر سر کو دھن دھن وہ ملے تھا ہاتھ اپنے کبھی آنکھ پڑ گئی تھی تری گات پر کسی کی
بہ چنیں درازیِ مو نہ سمجھ تو جعد اُس کو یہ پڑی ہے آہ پیچھے، بتِ سیم بر کسی کی

کہیں مصحفی نے دی تھی خبر اُس کے قصدِ شب کی
رگِ جاں رہی سحر تک سرِ نیشتر کسی کی

494

غزل کہنے کا کس کو ڈھب رہا ہے وہ رتبہ عشق کا اب کب رہا ہے
بشاشت برگِ گل میں ہے جو اتنی کسی کے لب پر اُس کا لب رہا ہے
مشوش[1] شکل سے اُس گل کی ظاہر یہ ہوتا ہے کہیں وہ شب رہا ہے
پرستش ہی میں شب آخر ہوئی ہے ہمارے پاس وہ بت جب رہا ہے
تمھارے عہد میں اے کافرو ہائے کہاں وہ ملت و مذہب رہا ہے
مرا زانو ترے زانو کے نیچے اُٹھوں کیوں کر کہ کافر دب رہا ہے

1- مُشوش = آشفتہ

اِسے کب ناز بستاں کی ہوس ہے یہ دل نت کشتۂ غبغب رہا ہے
موے جز میر جو تھے فن کے استاد یہی اک ریختہ گو اب رہا ہے
نت اُس کی مصحفی کھاتا ہوں دشنام
یہی تو میرا اب منصب رہا ہے

495

پھر کر دیے وا روزنِ ناسور کسی نے چھپ چھپ کے بنایا مجھے رنجور کسی نے
حاجت رہی کیا پھیرا سے سنگ دلوں کی؟ جب آپ کیا شیشۂ دل چور کسی نے
جی اُٹھی وہیں خواہشِ دل سنتے ہیں اُس کی غصے سے کیا تھا مجھے درگور کسی نے
پچھتائے بہت کیفی ترے جا کے عدم میں پایا جو نہ واں سایۂ انگور کسی نے
عالم ہیں برے جو ترے انداز ہیں کافر اس شکل کی دیکھی ہی نہیں حور کسی نے
غش کر گئے دیکھ اس کو جو تھے صاحبِ بینش تصویر تری کھینچی جو مخمور کسی نے
جس شب تو جدا مجھ سے ہوا کیوں نہ اُسی شب پھیری نہ گلے پر مرے ساطور کسی نے
موسیٰ کے تئیں اوجِ تقدس پہ غش آیا شب نالہ کیا تھا طرفِ طور کسی نے
یہ بوسے لیے جس سے حیا کو عرق آیا پا کر کے نشے میں اُسے کل چور کسی نے
میں اپنی سفارش تو اُٹھاتا پہ کروں کیا پایا نہیں واں بات کا مقدور کسی نے
واں تیر ہوئے آن کے تودے ہی پہ تودے یاں دل کو کیا خانۂ زنبور کسی نے
سو اس کی ہی خاطر کی کہیں مصحفی میں آہ
پر ایک نہ رکھی مری منظور کسی نے

496

رکھے سر زانو پہ بیٹھا ہے حیادار کوئی اولِ شب سے ہے اُس کوچے میں بیدار کوئی
جنس اچھی کے خریدار تو ہم تھے لیکن پھیر یوسف سا نہ آیا سرِ بازار کوئی

اس کے کوچے میں یہ قدغن ہے کہ آوے جاوے　　پر نہ دیکھے طرفِ رخنۂ دیوار کوئی
اب بتاں منہ کو پھرا لیتے ہیں مجھ سے، سچ ہے　　مندرس[1] جنس کا کیا ہووے خریدار کوئی
ہاتھ میں رعشہ نہ پیری سے جو پیدا ہوتا　　کچھ تو لکھتا گلۂ چرخِ ستم گار کوئی
عشق جی لے کے ہی اے مصحفی چھوڑے ہے غرض
ہووے اس دام میں یا رب نہ گرفتار کوئی

497

لیے تھے بوسے جو میں آتشیں عذاروں کے　　نشاں ہیں لب پہ مرے اب تلک شراروں کے
مگر وہ ماہ ہے غرفے میں آج جلوہ فروش　　جھکے پڑیں ہیں جو دیدے ادھر کو تاروں کے
میں تجھ سے گورِ غریباں کا کیا کہوں احوال　　وہ نقشے ہی نظر آتے نہیں مزاروں کے
اُگے ہے تاجِ خروس اس زمیں پر اب جس جا　　ہوئے تھے کاسۂ سر خاک تاج داروں کے
جو دیکھو کم نہیں بزمِ سماع سے گلشن　　کہ چاک چاک ہیں یاں پیرہن ہزاروں کے
نظر انھیں کی طرف جالیوں کے کیوں نہ رہے　　جو دید باز ہیں مارے ہوئے اشاروں کے
بہار آئی ہے جس دن سے، شاہدِ گل کو　　ہمیشہ جاتے ہیں رقعے امیدواروں کے
بہے ہے اب تئیں ریگِ رواں کا واں دریا　　ہوئے ہیں خاک جہاں جسم بے قراروں کے
نہ صید گہ سے پھرا اس کے کوئی بے قسمت　　وہاں تو گوشت ہی بھنتے رہے شکاروں کے
وہ سرگذشت پڑھیں آہ کیونکے اپنی راست؟　　کہ دستِ چپ میں ہیں نامے گناہ گاروں کے
نہ سر کا ہوش رہے مصحفی نہ پھر پا کا
اگر تو دیکھے کھلے بال وضع داروں کے

498

نازِ رفتار ترا بر سرِ رعنائی ہے　　کیا جیوں گا میں جو یہ اس کی شکیبائی ہے
زلف کا اُس کی میں مذکور کہیں کرتا تھا　　سن کے ہمدم سے لگا کہنے ''یہ سودائی ہے''

1- مُندرس = بوسیدہ، خراب

خواب میں بھی نہیں آتا جو تصوّر اُس کا
اُس نے شاید مرے ملنے کی قسم کھائی ہے

حسن لیلیٰ سے ترے حسن کو نسبت کیوں دوں
کہ تو شہری ہے صنم اور وہ صحرائی ہے

لب ساحل پہ کھڑا واں وہ اُڑاتا ہے پتنگ
نکلے آنسو کی یہاں طائرِ دریائی ہے

میری رسوائی کے درپے تو نہ ہو مان کہا
اس میں، اے جانِ جہاں تیری بھی رسوائی ہے

مصحفی لیتے تو ہیں نام شکیبائی کا
پر شکیبائی کہاں وہ جو شکیبائی ہے

499

اب کے بھی سال یوں ہی گئے جانِ من رہے
راتوں کو ہم سے خوب غرض تم بھی چھپ رہے

اُگلی پڑے ہے میان سے وہ تیغ خوش غلاف
یہ موجِ آب دیکھیے کس رخ پہ اب بہے

رنگِ کفک کو دیکھ ترے داغ ہو گئے
لالے کے پھول تھے جو وہ سیراب ڈھڈ ہے

کہیو صبا یہ زمزمہ سنجانِ باغ سے
سنتے کبھی تو آ کے اسیروں کے چہچہے

قاصد تو بھیجتا ہوں میں اس پاس پر مجھے
خطرہ یہی ہے جی میں خدا جانے کیا کہے

جب کاروان دور گیا اُس نے تب کہا
اے وائے سب سے پیچھے میاں مصحفی رہے

500

دل پہ کیوں مارے نہ ہر تار سے نشتر کُرتی
چشم دار اس بتِ کافر کی ہے کافر کُرتی

گات کی اس کے نزاکت لکھوں یا اُس کا بیاں
جیسا ہے قاق[1] بدن ویسی ہے لاغر کُرتی

بیم کیوں پنجۂ شاہیں کا نہ ہو، پستاں سے
دام میں رکھتی ہے اپنے دو کبوتر کُرتی

شکمِ صاف پہ اس بت کے نہیں پھیلے ہیں تار
کھینچتی ہے ورقِ نقرہ پہ مسطر کُرتی

ہو گئے دیکھتے ہی ہم اُسے، اے یار و قتل
اپنے حق میں تو بنی تیغ کے جوہر کُرتی

1- قاق = دُبلا پتلا

خوب رویوں کی پھبن کا بھی عجب عالم ہے — شرط یہ ہے کہ رہے ناف کے اوپر کرتی
گل بدن کو مرے کیا عطر کی پروا ہے کہ ہے — یاں پسینے سے بدن کے ہی معطر کرتی
بوئے گیسو کی صبا تجھ سے جو آج آتی ہے — کس کی سونگھ آئی ہے کافر تو معنبر کرتی

مصحفی جان کو کرتے ہیں طرحدار نثار
جب دوپنتی[1] کبھی پہنے ہے وہ دلبر کرتی

501

ترے منھ چھپاتے ہی پھر مجھے خبر اپنی کچھ نہ ذری رہی
نہ فراق تھا، نہ وصال تھا، رہی اک تو بے خبری رہی

تو ہمیشہ اے بتِ مہ لقا رہا محو اپنی ہی شکل کا
ترے عکسِ حسن کی آرسی ترے سامنے ہی دھری رہی

ترے عہدِ حسن میں یک زماں نہ جنوں سے مجھ کو ملی اماں
وہی نالہ اور وہی فغاں، وہی مشقِ جامہ دری رہی

کوئی ہووے کیونکے نہ تنگ دل ترے دل میں اے بتِ سنگ دل
اثر آہ اپنی نے یہ کیا کہ رہینِ بے اثری رہی

نہ خط آئے پر بھی کمی پڑی تری شانِ حسن میں یک ذری
وہی قد کی فتنہ گری رہی، وہی رخ کی جلوہ گری رہی

کبھی دل لیا، کبھی دیں لیا، کبھی زر لیا، کبھی سر لیا
یوں ہی اپنی مفت دہی رہی، وہی اُس کی مفت بری رہی

نہ کمالِ اوج سے تو گرا کبھی فکرِ شعر میں مصحفی
غزل اور بھی کہی تو نے گر وہی تیری تیز پَری[2] رہی

1- دوپنتی = دوکاج والی 2- تیز پَری = اُڑان

502

قدم اس کا کج ہی پڑا کیا، وہی قد کی فتنہ گری رہی
وہ جو چال سنتے تھے کبک کی سو وہ طاق ہی پہ دھری رہی

شبِ وصل آئی تو یوں کٹی کہ جو رنگی سی اک آگئی
مجھے اُس سے بے خبری رہی اُسے مجھ سے بے خبری رہی

ہوا باغ دستِ زدِ خزاں، کیے دَے[1] نے اپنے علم نشاں
نہ وہ آب جو کا جنوں رہا نہ گلوں کی جامہ دری رہی

مجھے برقِ جلوۂ حسن کا یہی لحظہ لحظہ ہے اب گلہ
مرا باغ سینہ جلا دیا مری کھیتی کیوں نہ ہری رہی

سبھی مرد و زن سے چھپا چھپا، بہزار عشوہ و صد ادا
مری آنکھوں میں وہ پھرا کیا، مرے دل میں جلوہ گری رہی

تو گیا جو بزم سے اُٹھ کے گھر، ترے جاتے ہی بتِ سیم بر
نہ زباں میں ذوقِ کباب تر نہ لبوں میں مے کی تری رہی

بھلا کیونکے آنکھیں میں کھولتا یہ بہار چھوڑ کے مصحفی
کہ تمام شب مرے خواب میں وہی شکل جیسے پری رہی

503

دیکھتے ہی اُس کے کل بے اختیاری ہوگئی　کیا کہیں تم سے عجب حالت ہماری ہوگئی
پھر بنائے دوستی تا زیست ویسی ہی رہی　جس سے عہدِ دلبراں کی استواری ہوگئی
گرچہ وہ گل گلشنِ امکاں سے کچھ باہر نہ تھا　دیکھ کر لٹو اُسے بادِ بہاری ہوگئی
یار کے کوچے تلک اب کس طرح جاویں کہ ہائے　طاقتِ تن تھی سو صرفِ آہ و زاری ہوگئی
جب نہ ضبطِ گریہ پر اپنا رہا کچھ اختیار　ہر بنِ مو سے ندی اک خوں کی جاری ہوگئی

1- دَے = خزاں کا مہینا

اس لگاوٹ کا دوانا ہوں کہ محبوبوں نے آہ　　جس پہ ڈالی آنکھ وو ہیں اُس سے یاری ہوگئی
جب نجوم و رمل سے اپنی ہوئی خاطر نہ جمع　　شکل جو تسکیں کی تھی وہ بیقراری ہوگئی
ٹک نقاب اُٹھا تھا اس کے روئے آتش ناک سے　　کیا کہوں کس کس پہ حالت غش کی طاری ہوگئی
یار نے تم کو کہا بھی کچھ اگر میاں مصحفی
ایسی کیا بے عزتی اس میں تمھاری ہوگئی

504

اس طرح سے نہ جی کو بھائے کوئی　　دل میں یا رب نہ یوں سمائے کوئی
کیوں نہ ہو جائے گھر مرا ویراں　　آہ جب اپنے گھر کو جائے کوئی
دل گرا ہی پڑے ہے پہلو سے　　کاش چاکِ جگر سلائے کوئی
سر پہ کوہِ گرانِ غم ہو جب　　کیونکے بالیں سے سر اُٹھائے کوئی
ہم کہاں ایسے بخت رکھتے ہیں؟　　ہم کو اور اپنے گھر بلائے کوئی
گر مسیحا بھی ہووے ہے یاں دنگ　　ہم سے مردے کو کیا جلائے کوئی
فائدہ کیا جو دیکھیے پھر اسے　　جب کسی سے نظر چُرائے کوئی
میں کوئی چھوڑتا ہوں حسن کی چاہ　　لاکھ صورت سے منھ بنائے کوئی
گر نہ دے ہم کو جامِ شربتِ وصل　　زہر کا جام تو پلائے کوئی
بے قراری ترا برا ہووے　　کب تلک آہ تلملائے کوئی
کیوں نہ اُس کی بلائیں لے دو جہاں　　ایدھر اودھر جو منھ پھرائے کوئی
گو شبِ وصل ہو تو ہو، کیونکر　　بختِ خوابیدہ کو جگائے کوئی
شمع سے جوں پتنگ جلتا ہے　　یوں کسی کا نہ جی جلائے کوئی
تجھ تلک پہنچے یہ دعا ہے مری　　فرصت اتنی کبھی نہ پائے کوئی
مصحفی ہم سے اتنی شفقت پر　ق　ہو کے روکھا جو گھر کو جائے کوئی
اُس کی پھر ہم کو بھی ہے کیا پرواہ　　جائے جب ہم سے منھ چھپائے کوئی

505

ہو سبک دنیا سے ترکِ جسم فانی کیجیے فائدہ کیا جو کسی دل پر گرانی کیجیے

خواب میں دے بوسہ شب اُس نے مجھے ہنس کر کہا اور کیا اس سے زیادہ مہربانی کیجیے

دل میں تیرے کوئی شے اپنی جگہ پاتی نہیں دشمنِ جاں کیونکے تجھ کو یار جانی کیجیے

محرم اپنا کون ہے یاں جز خیالِ روے یار کس سے افشاے غم دردِ نہانی کیجیے

شب تڑپ کر نالہ پہلو سے مرے جاتا رہا برق کے شعلے کی کب تک پاسبانی کیجیے

لعلِ یاقوتی کا بوسہ دیجیے عاشق کو، جان کچھ تو اُس کا بھی علاجِ ناتوانی کیجیے

چشمہ تیری تیغ کا ہے چشمۂ آبِ حیات زخم کاری کھایئے تب زندگانی کیجیے

آپ یاں ہم جل رہے ہیں کب رواہے، اے فلک تودۂ باروت پر آتش فشانی کیجیے

بات جو کہتا ہے قاصد سو وہ ہے بے اصل آہ کیونکے باور اُس کا پیغامِ زبانی کیجیے

اُس کی عصمت میں نہیں شک لیک میں مجبور ہوں عشق چاہے ہے کہ ہر دم بدگمانی کیجیے

کچھ تو منھ سے پھوٹیے[1] اس کے بھی آگے مصحفی

خامشی تا چند ترکِ کم زبانی کیجیے

506

جی میں ہے اب ترکِ سوداے فلانی[2] کیجیے بیٹھ رہیے جا کے، چندے زندگانی کیجیے

غیرت اس کے در سے ہم کو دور پھینکے ہے و لے رشک چاہے ہے کہ مل مل پاسبانی کیجیے

جس سے ہو ہرگز کسی صورت نہ رک رہنا صلاح کیونکے پھر ایسے کے حق میں بدگمانی کیجیے

عشق پیری بھی تو ہرگز لطف سے خالی نہیں چند یادِ شورشِ عشق و جوانی کیجیے

بات وصلِ خواب کی تقریر کے قابل ہے کب جی ہی جی میں کیوں نہ اپنے شادمانی کیجیے

آہ بیداری کے آنے سے تو ہم محروم ہیں خواب میں ہی آ وَ اتنی مہربانی کیجیے

1- منھ سے پھوٹو = کچھ بولنے کا تقاضا (روزمرہ) 2- فلانی = یعنی فلانی عورت

لکھنے لگیے اُس کو جب حالِ دل اپنا مصحفی
رنگ اک کاغذ کا پرزہ زعفرانی کیجیے

507

شب کر کے تم جو وعدۂ فردا چلے گئے
آنسو ہمارے جانبِ دریا چلے گئے

کیا کیا نہ پیرِ خانقہ و صومعہ نشیں
ہو اُس جواں کے عشق میں رُسوا چلے گئے

در پر تمھارے اہلِ ہوس رہ گئے، میاں
حسرت کشانِ زخم تمنّا چلے گئے

کانوں کے موتیوں پہ ترے موے زلف دیکھ
نالے مرے بہ سوے ثریا چلے گئے

آئے تری گلی میں جو سرگشتہ ہم کبھو
جوں گرد بادِ دامنِ صحرا چلے گئے

دارا رہا نہ جم نہ سکندر نہ فیلسوف
ہستی سے لوگ دیکھ تو کیا کیا چلے گئے

لوٹیں بہاریں حسن کی اوروں نے بزم میں
ہم کم نصیب وقتِ تماشا چلے گئے

اے ہمرہانِ پیش قدم تم کو کیا ہوا
وادی میں ہم کو چھوڑ کے تنہا چلے گئے

کیا جانے کس مقام کو کوچے سے یار کے
آوارگانِ دشتِ تمنّا چلے گئے

نکلی نہ منھ سے ایک کے کچھ اس کے آگے بات
منھ دیکھ دیکھ خضر و مسیحا چلے گئے

ہم وے گناہگار ہیں خوباں کے مصحفی
جب آئے کر کے دور سے مجرا چلے گئے

508

آئے تھے میرے گھر سو وہ لڑ کر چلے گئے
غصے سے آپھی آپ بگڑ کر چلے گئے

اتنا ہی میں کہا تھا کہ ''آؤ نہ میری جاں''
جاتے تھے سامنے سے اکڑ کر چلے گئے

دریوزہ حسن کا نہ ملا اُس کے در سے خاک
آزاد پیشہ سیکڑوں اُڑ کر چلے گئے

دستِ جنوں کے ایک اشارے میں بعد دوخت[1]
دامن کو چاکِ جیب ادھڑ کر چلے گئے

1- دوخت = سیون، سلائی

قصہ ہوا نہ دَورِ تسلسل[1] کا اُن سے دُور　　کیا کیا نہ منطقی کہ جھگڑ کر چلے گئے

بھٹکیں ہیں کارواں سے کہ اس قافلے کے بیچ　　ساتھی ہمارے ہائے بچھڑ کر چلے گئے

گلشن میں حکمِ دخل نہ تھا ہم کو اس پہ رات　　ہم دامنِ نسیم پکڑ کر چلے گئے

ہر ملک سے بسے تھے کہ آ آ کے مصحفی　ق　آخر وہ لکھنؤ سے اُجڑ کر چلے گئے

بیٹھا ہے کس لیے تو جب اِس گلستاں سے یار　　سب نخل بیخ و بُن سے اکھڑ کر چلے گئے

509

زلف سے اس کی پیشتر عارضِ رشکِ ماہ ہے　　پیکِ نگہ جو جائے تو رات بسے کی راہ ہے

پردۂ ناز میں چھپے تم ہو کہ کوئی دوسرا　　منھ سے تو بولو اک ذرا مجھ کو بھی اشتباہ ہے

ایک ادا میں سیکڑوں مارے پڑیں ہیں جس جگہ　　کہتے ہیں جس کو بارہویں[2] یہ وہی وعدہ گاہ ہے

مفت میں جی ہوا تلف پھر گئی مجھ سے صف کی صف　　بولے ہے اُس کی ہی طرف میرا بھی جو گواہ ہے

پاس جب آؤ، جاؤ بچ، کرتے رہو عدو کی بچ　　ہم نے یقیں کیا ہے سچ تم کو ہماری چاہ ہے

تیرے مریضِ عشق کا دم ہے رُکا ہوا کہ آج　　نالۂ نیم شب ہے نے نعرۂ صبح گاہ ہے

دن کو ہیں تارے جلوہ گر چاند بھی آئے ہے نظر　　کس کے یہ دودِ آہ سے روئے ہَوا سیاہ ہے

آنکھوں میں آرہا ہے دم، مجھ کو صنم تری قسم　　اب بھی جو تو کرے کرم طاقتِ یک نگاہ ہے

چھوڑ بتوں کی دوستی رکھوں مشوّش[3] اپنا جی
اب کوئی روز وں مصحفی ہے تو یوں ہیں نباہ ہے

510

کھائے تھے ہم نے گل جو حبیبوں کے ہاتھ سے　　باندھے پھریں ہیں اُن کو رقیبوں کے ہاتھ سے

پینا سدا شراب رقیبوں کے ہاتھ سے　　کھانا نہ برگ پان غریبوں کے ہاتھ سے

1- دَور　منطق کی اصطلاح جب علّت و معلول ایک ہو جائیں　2- بارہویں　یعنی بارہ ربیع الاول کی محفل۔ پہلے زمانے میں پردہ کی سختی کی وجہ سے ایسی مجلسیں ہی نظر بازی کے کام بھی آتی تھیں۔ اس کی طرف درگاہ قلی خاں نے بھی ''مرقع دہلی'' میں اشارہ کیا ہے۔　3- مشوّش = تشویش زدہ، پریشان

یوں چھوٹ جاوے گوشۂ دامانِ وصلِ یار — شکوہ جو ہم کو ہے تو نصیبوں کے ہاتھ سے

کیا کیا ہمارے تن پہ نہیں تازہ گل کھلے — خوباں کی بوٹے دار جریبوں[1] کے ہاتھ سے

وارفتہ ہم سے سیکڑوں پھرتے ہیں دادخواہ — ان دلبرانِ پاشنہ زیبوں[2] کے ہاتھ سے

بالیں پہ میری بہر تسلی ہی لا رکھو — نسخہ کوئی لکھا کے طبیبوں کے ہاتھ سے

آخر وہی ہوئیں ہمیں انگشتِ رہنما — کھائی تھیں قمچیاں جوادیبوں کے ہاتھ سے

آیا نہ اُن کو ترسِ خدا حیف اک ذرا — دل چھین لے گئے جو غریبوں کے ہاتھ سے

مسجد میں جب رکھا ہے قدم اُس فصیح نے — خطبے چھنے گئے ہیں خطیبوں کے ہاتھ سے

دار الشفائے عشق کے بیمار مصحفی
آخر ہوئے تمام طبیبوں کے ہاتھ سے

511

ساتھ لگاوٹ کے رکاوٹ بھی ہے — ہائے غضب اس پہ لگاوٹ بھی ہے

ساعد[3] فربہ ہی نہیں خصمِ جاں — سمجھیو، یارو کہ گلاوٹ[4] بھی ہے

جان نہ ورزش میں کرو تم قصور — سج ہے تو جامے کی سجاوٹ بھی ہے

کہتا ہے قاصد ترے منہ کی و لے — اس میں کچھ اک اس کی بناوٹ بھی ہے

آج تو صحرا کو تو چل مصحفی
سبزہ ہے اور لطف مہاوٹ[5] بھی ہے

512

بس ہم ہیں شب اور کراہنا ہے — یہ اور طرح کا چاہنا ہے

ہے وعدۂ وصل آج مجھ کو — اسباب طرب بساہنا[6] ہے

1-جریب (پیمائش کا آلہ) جیسے گز، یہاں مراد ہاتھ کی چھڑی ہے 2- پاشنہ = ایڑی، پاشنہ زیب، خوبصورت سجی ہوئی ایڑی والے 3- ساعدِ فربہ = موٹی کلائی 4-گلاوٹ = گداز
5- مہاوٹ = برسات (خصوصاً موسم سرما کی) 6- بساہنا = فراہم کرنا، جوڑنا

ہیں ناوک غمزہ گرچہ کاری میرا ہی جگر سراہنا ہے
دنیا ہے سرائے فانی اس میں جو آیا ہے یاں سو پاہنا[1] ہے
چتون میں کہے ہے یوں وہ مغرور "تجھ سے مجھے کیا نباہنا ہے"
اے مصحفی دل رہا ہے پیچھے
اُس کو بھی ذرا نباہنا[2] ہے

513

ہر موجِ آہ سبزۂ آتش رسیدہ ہے ہر نالہ عندلیبِ قفس آرمیدہ ہے
نالہ نہیں کہ سنگ سے کھینچے ہے سر بہ کوہ خونِ شہید عشق گریباں دریدہ ہے
ہر آرزوئے کشتہ و بوس و کنارِ وصل دوری سے تیری بسملِ درخوں طپیدہ ہے
گو پاسبانِ سینہ بہ عصمت ہو واں کہ یاں دستِ ہوس تو آپ ہی دستِ بریدہ ہے
گرمی بھری ہوئی ہے ہر اک عضوِ یار میں سر تا قدم وہ شعلۂ قامت کشیدہ ہے
کیا بوئے داغِ سوختہ پہنچے اُسے کہ یہ صبر گریز پائے، غزالِ رمیدہ ہے
جو لختِ دل اُڑے ہے مرا برگِ گل کی طرح ہم آشیانِ طائرِ رنگِ پریدہ ہے
نے ناشپاتی اُس کے مقابل ہے نے بہی غبغب کا سیب بھی عجب اک سیب چیدہ ہے
محروم مصحفی کو نہ رکھ خوانِ وصل سے
آخر ترا وہ عاشقِ حسرت چشیدہ ہے

514

الفت ہی مری تم نے بس جی سے مٹا ڈالی تصویر محبت کی ہاتھوں میں چھپا ڈالی
اتنی بھی حیا صاحب انصاف تو ٹک کیجے واں لب پہ ملی مسّی یاں جان کھپا ڈالی
دو انگلیاں[3] مسّی کی کاغذ کی پڑی[4] میں تھیں کافر نے نڈر ہو کر ہونٹوں سے لگا ڈالی

1- پاہنا = مہمان 2- نباہنا ہے = ساتھ رکھنا ہے 3- دو انگلیاں مسّی کی = مقدار
4- پڑی = (پوڑیا)

تصویر جو پیش آئی صورت گرِ قدرت نے — لے کر کے قلم وو ہیں یک دست[1] بنا ڈالی

طعنوں سے طبیبوں نے سینے کی جراحت پر — غیر از نمکِ سودہ کیا اور دوا ڈالی؟

میوے کی بھری رُت میں بہتر تو ہے گلشن سے — مرغانِ قفس کو بھی بھیجے جو صبا ڈالی

شب شانہ یہ کہتا تھا "یارب میں کدھر جاؤں — زلفوں کے بکھرنے نے کیا مجھ پہ بلا ڈالی"

ڈر ہے دلِ بلبل کو صدمہ نہ کہیں پہنچے — اے بادِ صبا گل کی ہر دم نہ ہلا ڈالی

آساں نہیں ہاتھ آنا اُس پائے حنائی کا — میں خونِ جگر رو رو الفت کی بنا ڈالی

دنیا میں ٹھکانا جب کوئی نہ ملا مجھ کو — لاش اپنی ترے در پر آخر کو میں لا ڈالی

ہے سب یہ ظہورِ دم اے مصحفی صانع نے
اس خاک کے پتلے میں یہ زور ہوا ڈالی

515

چھوڑے ہے جب کہ آہ شرر بار پھلجھڑی — سو رنگ کے دکھاتی ہے گلزار پھلجھڑی

جا کر شبِ برات میں گلشن کی سیر کر — بوٹا جو شاخِ گل ہے تو ہے خار پھلجھڑی

حیراں ہوں میں کہ رات کو کرتی ہے کہکشاں — کس کی برات کے لیے تیار پھلجھڑی

آنکھوں سے میری گرتے ہیں یوں اشک پے بہ پے — پھولوں کا باندھ دیتی ہے جوں تار پھلجھڑی

آتش سے کچھ مزہ نہ ملا اُس کو بعد ازیں — رکھتی ہے داغِ عشق کا درکار پھلجھڑی

سودا قلم[2] کا ہے جو گراں کو دکانِ شہر — سستی سمجھ کے لیتے ہیں ناچار پھلجھڑی

میں بھی جو شرط باندھ کے رونے کو ڈٹ گیا — بازی ان آنسوؤں سے گئی ہار پھلجھڑی

ہنگامِ نالہ جھڑتے ہیں یوں اس سے لختِ دل — گویا ہے عندلیب کی منقار پھلجھڑی

از بسکہ شب انار[3] نے کی دل کشی بہت — بس دیکھ اُس کو رہ گئی من مار پھلجھڑی

پھیلے ہمارے نالۂ آتش فشاں لگے — جس جا دھریں تھے برسرِ بازار پھلجھڑی

1- یک دست = ہاتھوں ہاتھ، فوراً 2- قلم = آتشبازی کی ایک قسم 3- انار = آتشبازی کی ایک قسم

اے مصحفی بس آگ لگانے کی دیر ہے
یہ جسمِ کاغذی ہے مرا یار پھلجھڑی

516

جب اپنی گل فشانی پر آتی ہے پھلجھڑی کیا کیا بہار ہم کو دکھاتی ہے پھلجھڑی
شاید کہ ہے یہ ساعدِ مجنوں کا استخواں نت جس کو سر سے آگ لگاتی ہے پھلجھڑی
ہنستا ہوں خوش میں جاگ کے اس شعلہ رو بغیر؟ آٹھ آٹھ آنسو مجھ کو رُلاتی ہے پھلجھڑی
اے پانچ چار پھول یہ کم ظرفی دیکھیو باغِ فلک سے آنکھ لڑاتی ہے پھلجھڑی
دیتا ہے دستِ غیر میں جس دم وہ اپنا ہاتھ شعلہ ہمارے دل سے اُٹھاتی ہے پھلجھڑی
جب تک تو آنکھ کھول کے دیکھے بہارِ عمر دم میں تمام ہی ہوئی جاتی ہے پھلجھڑی
اے خفتگانِ خاک، پھر آئی شبِ برات جاگو نہیں تو ہم کو جگاتی ہے پھلجھڑی
مہتاب کا نہ ہووے بھلا کیونکے رنگ زرد کچھ بے طرح سے آنکھیں دکھاتی ہے پھلجھڑی
کیا بد بلا ہے بازیِ آتش کی بھی ہوس مصحف کے کاغذوں کو بناتی ہے پھلجھڑی
شورہ نہ ہو تو یوں نہ جھڑیں اس سے اتنے پھول شورے کے ساتھ دھوم مچاتی ہے پھلجھڑی

اے مصحفی قلم کو نہ رکھ ہاتھ سے کہ یار
رنگیں غزل اک اور لکھاتی ہے پھلجھڑی

517

جوں جوں بہارِ گل کی دکھاتی ہے پھلجھڑی دوں دوں خزاں ہی کچھ ہوئی جاتی ہے پھلجھڑی
آہِ شرر فشاں سے مری روکشی کرے اپنے میں یہ سکت نہیں پاتی ہے پھلجھڑی
ہر چند جاہی جوہی بھی ہے قہر پر کوئی اپنے خیال میں نہیں لاتی ہے پھلجھڑی
چھوڑے ہے اپنے ہاتھ سے جس دم وہ طفلِ شوخ مثلِ چھچھوندر[1] اس کو نچاتی ہے پھلجھڑی

1- چھچھوندر = آتشبازی کی ایک قسم

لیلیٰ شبِ برات میں لڑکوں کے ہاتھ سے　جب سے سنا ہے، مول منگاتی ہے پھلجھڑی
چلمن کی جا گہ چشم کے پردے لگا کے آہ　مجنوں کے آنسوؤں کی بناتی ہے پھلجھڑی
ہتھ پھول[1] لگ سکے ہے اسے اور نے انار　جب اپنی گل فشانی پہ آتی ہے پھلجھڑی
اُٹھتی نہیں ہے اس سے فغاں، داغِ دل کے ساتھ　سوز و گداز اپنا سناتی ہے پھلجھڑی

میں کیونکے نخلِ گل نہ کہوں اُس کو مصحفی
اک شاخ سے یہ پھول کھلاتی ہے پھلجھڑی

518

آیا ہے گر جہاں میں عالم کا دید کر لے　گزری[2] لگی ہوئی ہے سودا خرید کر لے
گل خاک و خوں میں پیاسے کیسے تڑپ رہے ہیں　تو یک نگہ میں اُس کو اپنا شہید کر لے
تجھ کو قسم ہے اپنی، اے فتنۂ قیامت　جاتے ہوئے تو ہم سے وعدہ وعید[3] کر لے
پھر بعد مرگ ناداں یہ عشرتیں کہاں ہیں　جو دم ہے زندگی کا تو اس میں عید کر لے
ہم ہیں حسینؑ مشرب سمجھیں گے اس سے کل کو　جو آج ہم پہ چاہے ظلم اے یزید کر لے
دل لے گیا جو مجھ کو اُس کی گلی میں، بولا　تو بھی ادھر کو سجدہ اے نا امید کر لے

دیکھے ہے مصحفی کیا تو راہِ ابرِ رحمت
نامہ سیاہ اپنا رو کر سپید کر لے

519

نہ کیونکے اس بتِ صندل جبیں سے دل لپٹے　یہ نقشِ مار کہاں تک بہ آب و گل لپٹے
لپٹ گیا میں مٹھائی میں جیسے تل لپٹے　الٰہی یوں نہ کسی کا کسی سے دل لپٹے
گر اُس کے کاکلِ پیچاں سے اپنا دل لپٹے　بہ رنگِ موجِ دخاں نالہ متصل لپٹے
جو لف[4] کوہ کا خواہاں ہو سوزِ نالہ مرا　بہ رنگِ تختۂ کاغذ ہر ایک سل لپٹے

1- ہتھ پھول = آتشبازی کی ایک قسم
2- گذری = بازار، اسے بہ فتح ذال بھی باندھا ہے: ہوتا ہے سرِ شام تماشا گذری کا
3- وعدہ وعید (روزمرہ) [حالانکہ وعید دھمکی کے مفہوم میں آتا ہے] 4- لفِ کوہ کا = پہاڑ کو لپیٹنے کا

رکھے تھے اُس نے جو محرم میں بن کھلے کئی پھول
بدن کے ساتھ پسینے سے وہ بھی کِھل لپٹے

ہمارے لختِ جگر یوں جمیں ہیں تہ بر تہ
کتابِ نم کے ورق جوں ہوں متصل لپٹے

تو میری گور کی کہگل [1] نہ کر محرم میں
روا ہے دستِ حنائی سے تیرے رِگل لپٹے

معانقے کا شبِ وصل کے وہ سمجھے مزہ
تو روزِ عید کسی کے گلے سے دل لپٹے

جو رستموں سے بھی کشتی کبھی نہ کھاتا ہو
پھر اُس سے کیونکے بھلا عاشقِ خجل لپٹے

ہو گو فلک زدہ موذی، تو اُس سے کر پرہیز
مباد پانو سے یہ مارِ مضمحل لپٹے

ملے نہ کیوں کفِ افسوس مصحفی اس دم
بدن سے جب ترے بٹنابتِ چگل [2] لپٹے

520

کر کے بناؤ رخ پہ جو اپنے نگاہ کی
خود اس پری نے دیکھ کے آئینہ آہ کی

رہنے لگا وہ بر سرِ قصرِ بلند، یار
فریاد جا سکے نہ جہاں داد خواہ کی

اس کی صفائے رخ کا بیاں کس سے ہو سکے
تلووں پہ جس کے پھسلے نظر مہر و ماہ کی

اپنے ہی وہ بناؤ کا دن رات محو ہے
کیا اُس کو ہے خبر مرے حالِ تباہ کی

بے چین یہ ہوا دلِ مضطر [3] کہ آخرش
زنجیر کھل پڑی تری جعدِ سیاہ کی

کیا نکلے اس سے راہِ ملاقات دیکھیے
پہنی ہے اُس نے آج قبا راہ راہ [4] کی

سطح سے شب کی جلوے میں ہیں تیرہ روزیاں
لوحِ جبیں نہ ہو یہ کسی پُر گناہ کی

غیرت تو دیکھ ہم بھی وہیں اُس سے بھڑ گئے
جب اُس نے اپنی ناز سے ٹیڑھی کلاہ کی

بن بن کے آج سانگ گئے ہیں اُدھر بہت
چل مصحفی کہ سیر کریں عید گاہ کی

1- کہگل (کاہ + گِل) محرم میں قبروں کی مرمت کرتے ہیں۔ 2- چگل چین سے منسوب ایک شہر جہاں کے حسین روایتی طور پر مشہور ہیں۔ 3- مصحفی نے مضطر بہ معنی مضطرب استعمال کیا ہے مضطر کے معنی ہیں زچ ہو جانا اور مضطرب بے چین کو کہتے ہیں۔ 4- راہ راہ = لباس کی ایک قسم، دھاری دار

521

جو اس چمن میں نہ عاشق کی داد کو پہنچے　　خدا کرے نہ وہ میوہ مراد کو پہنچے

کہوں جو شعر کوئی اس کے وصفِ ابرو کا　　سوائے نون نہ ہرگز وہ صاد کو پہنچے

میں نامہ بر کو بھی دیتا نہیں خط اس ڈر سے　　کہ نامہ بر تو نہ اس کے سواد کو پہنچے

نہ جوشِ خوں کا مرے کر سکے علاج مسیح　　نہ جب تک اس کے صلاح و فساد کو پہنچے

جو تعزیوں پہ ملاقات ہو محرّم میں　　سلامِ دور تو اُس حور زاد کو پہنچے

ہے آگے قد کے ترے چوبِ ناتراشیدہ　　درختِ سرو نہ جب تک خراد کو پہنچے

پلاوے حیف ہے ساقی، تو اور کو سر جوش　　یہ کم نصیب نہ پیالے کی گاد کو پہنچے

فراق کا نہ رہے نام اور نشاں باقی　　جو چاہ مرتبۂ اتحاد کو پہنچے

ہے مشتِ خاک مری جمع اُس کے کوچے میں　　صبا یہ مژدہ کبھی برق و باد کو پہنچے

ترا وہ عاشقِ شوریدہ ہو گیا مجنوں　　مری طرف سے یہ پیغام صاد کو پہنچے

فلک روا ہے پڑھی جاوے میرے ہاں یٰسین　　دمیکہ یار کا حسن اِنْ یَّکادُ[1] کو پہنچے

لکھے غزل کا مری مصحفی وہ شخص جواب
جو کوئی مشق قلم میں عماد[2] کو پہنچے

522

شب دردِ دل سے اُٹھی جو پہلو میں ہوک سی　　کروٹ کے ساتھ بس وہیں آئی ہٹوک[3] سی

کیا شدّ و مد سے بولے ہے بلبل چمن کے بیچ　　نالے میں اس کے نکلے ہے قمری کی کوک سی

سیدھی نگہ نے گو کہ دلوں کو اُلٹ دیا　　ترچھی نظر بھی پر نظر آئی اَچوک سی

رہتی تھی سامنے جو مرے بام پر سدا　　کیسی وہ شکل چھپ گئی یک بار سُوک سی

کیا جاؤں میں چمن میں کہ سروِ سہی کی شکل　　آنکھوں میں میری لگتی ہے بن یار، دوک[4] سی

1- قرآن کریم، سورۃ القلم 68 آیت 51 کی طرف اشارہ ہے　　2- عماد الحسینی مشہور خطاط

3- ہٹوک = ہچکی، اڑچن　　4 دوک = گلے کا پھندا

اس خوب رو سے مل کے کوئی کیونکے بچ رہے — ظاہر میں جس کی وضع ہو خود ناسلوک سی

میدانِ پُردلی کا تو رامح[1] ہے مصحفی
چمکا سنا[2] کو اور دہن خرس[3] و خوک[4] سی

523

چھوٹا ہووے اگر اب کے خریداری[5] سے — پھر نہ دیکھوں میں کہیں چشم خریداری سے

کس پری زاد نے کافر یہ بنا واہ کیا — اپنا دل کانپ گیا اس کی تو طیّاری سے

دیکھ کر نبض مری عیسیِ مریم بولا — مر گئے ہیں کئی بیمار اسی بیماری سے

شب کو تک سوئے فلک دیکھ، کہ کیا کیا شکلیں — سر نکالے ہوئے ہیں پردۂ زنگاری سے

فرشِ گل ہیں تری مجلس میں صبا سے کہہ دے — یاں رکھے پانو یہ گر اپنا تو ہشیاری سے

مصحفی خانۂ دل کی میں خبر لیتا لیک
مجھ کو فرصت نہ ملی جسم کی معماری سے

524

خط کے آنے سے ہوئے عارضِ گل فام برے — تازہ گل جیسے ہوں مرجھا کے سرِشام برے

آیا قاصد تو دیے اُس نے بھی پیغام برے — دوش دیں کس کو، کہ ہیں اپنے ہی ایّام برے

ہوں میں ایسا ہی بد اعمال عجب کیا اِس کا — کہ برائی سے مری ہوں مرے ہم نام برے

فاسقوں میں مجھے لکھا قلمِ قدرت نے — روزِ اول ہی زبس مجھ سے ہوئے کام برے

کیا بلا ہے یہ کہ دن رات تصوّر میں ترے — خواب دیکھوں ہوں میں، اے زلفِ سیہ فام برے

باغِ خوبی کا جو میوہ ہے سو ہے ذائقے دار — یاں کے پستے ہی برے دیکھے نہ بادام برے

جس طرف جائے ادھر ہمرہِ صیاد ہیں یہ — پیچھے بلبل کے پڑے ہیں قفس و دام برے

کیا اجل کوچۂ قاتل میں لیے جائے ہے آج — دل میں آتے ہیں خیال اپنے جو ہر گام برے

1- رامح = نیزہ باز 2- سِنا = سنان، نیزہ 3- خرس = ریچھ 4- خوک = سور، خنزیر
5- بہ معنی غلامی، مملوکیت

ننگا پنڈا بھی اک انداز سے خالی کب ہے یوں بھی لگتے نہیں خوبانِ خوش اندام برے

عشقِ طفلاں سے نہ اے مصحفی میں پھل پایا
طعم[1] میں نکلے بہت یہ ثمرِ خام برے

525

ہوویں ہم بھیج کے کیوں نامہ و پیغام برے آگے ہی کھائے ہوئے بیٹھے ہیں الزام برے

پھر گیا ہم سے جو وہ، شکوہ ترا کیا کیجے دن ہیں اپنے ہی کچھ، اے گردشِ ایّام برے

شیخ و زاہد سے کوئی آن کے پوچھے تو سہی کس کو لگتے ہیں یہ خوبانِ خوش اندام برے

تیرے گالوں کی صفائی تو نہ لے جائیں کہیں مجھ کو یہ ڈر ہے، ہیں اس شہر کے حجّام برے

سیم بر پاس نہ ہو تو شبِ مہتاب کے بیچ کیوں نہ بستر پہ لگیں بالشِ آرام برے

بوئے خوں آتی ہے تقریر سے اُن کی، مجھ کو اس بھلائی پہ ہیں یہ صاحبِ اسلام برے

مصحفی کا نہیں مذکور بھی مطلق کرتے
سچ تو یہ ہے کہ ہیں سرکار کے خدّام برے

526

کاشکے اس دلِ بے تاب کو تسکیں ہووے مصرعۂ آہ، قدِ یار سے تضمیں ہووے

دم نہ نکلے ترے مشتاق کا اس پر دمِ نزع ختم سو بار اگر سورۂ یٰسیں ہووے

مجلسِ یار میں ملتی نہیں عاشق کے تئیں اتنی رخصت، کہ جلیسِ صفِ پائیں ہووے

مرگئی باغ میں بلبل یہ وصیّت کر کے نخلِ گل سے مرے تابوت کو تزییں ہووے

آرسی ہاتھ سے چھٹتی ہی نہیں اک ساعت سچ تو یہ ہے کوئی اتنا بھی نہ خود بیں ہووے

خنجرِ رشک کی یہ جا ہے، کہ خسرو نہ رہے یعنی اب اس کا خلف مالکِ شیریں ہووے

حسرتیں ساتھ لیے جائے ہے وہ دنیا سے کیوں نہ تابوت ترے کشتے کا سنگیں ہووے

1- طعم (بہ ضمِ اول) ذائقہ

گر کھلے غنچۂ عشرت چمنِ دل میں کبھی　　اس پہ انگشت قضا فندقِ گل چیں ہووے
اشک نظارے کو اتنی نہیں فرصت دیتے　　کہ کسی کے چمنِ حسن کا گل چیں ہووے
لذّتِ فقر و فنا چاہیے درویشی میں　　غم نہیں اس کا اگر کاسہ سفالیں ہووے
جس پہ خط لکھتے ہوئے خون میں روتا جاؤں　　صفحہ اس نامے کا پھر کیونکے نہ رنگیں ہووے
خواب کو صبح تک آنکھوں میں نہ جادوں شبِ وصل　　شمعِ مجلس جو تری ساقِ بلوریں ہووے
چاہتا مرگ بھی اپنی میں نہیں اس ڈر سے　　میرے مرنے سے تو، اے دوست نہ غمگیں ہووے
ہم گرفتار رہیں حلقۂ آہن میں دریغ　　غیر کا طوقِ گلو ساعدِ سیمیں ہووے
آنکھ لگ جائے تو یا رب یہی دکھلا تو مجھے　　کہ مرے ہاتھ میں وہ پائے نگاریں ہووے
شانہ ساں اس کا جگر چاہیے ہووے صد چاک　　وہ جو سودا زدۂ کاکلِ مشکیں ہووے

مرگِ دشمن کی دعا مصحفی اب مانگے ہے
چاہیے مقتدیو، جوششِ آمیں ہووے

527

مارا ہوا اس نرگسِ فتّاں[1] کا کہاں جائے؟　　بسمل ہو جو یوں خنجرِ مژگاں کا کہاں جائے؟
میں چاک سے دامن کے تو چاک اس کا ملایا　　اب دیکھیے سر رشتہ گریباں کا کہاں جائے؟
وہ دستِ حنائی ہی تصوّر میں رہے جب　　آشوب مرے دیدۂ گریاں کا کہاں جائے؟
دیکھا ہو جو سو بار تجھے روزنِ در سے　　پھر آنکھ لڑانا مہِ تاباں کا کہاں جائے؟
چھوٹے نہ تری قید سے ہم، سچ ہے یہ ظالم　　جو شخص گرفتار ہو زنداں کا کہاں جائے؟
گلشن میں نہ بیٹھے تو وہ کیا خاک پہ بیٹھے　　اُڑ کر کے بھلا مرغ گلستاں کا کہاں جائے؟
جز یہ کہ گرفتار رہے حلقۂ غم میں　　سودا زدہ اس زلف پریشاں کا کہاں جائے؟
تو ہی نہ رکھے اس پہ اگر وصل کا مرہم　　سچ یہ ہے کہ زخمی ترے پیکاں کا کہاں جائے؟
اس کا تو ٹھکانا ہے وہیں، بعدِ فنا بھی　　باشندہ جو ہو کوچۂ جاناں کا کہاں جائے؟

1- فتّاں = دلربا، دلفریب

جھمکیں ہیں زیادہ شبِ تاریک میں تارے مستی میں چمکنا ترے دنداں کا کہاں جائے؟

فریاد کی جا کون سی ہے مصحفی، سچ ہے
آفت زدہ اس گنبدِ گرداں کا کہاں جائے؟

528

پلّے میں مشتری بھی اُس مہ کے کم تلی ہے کیا گات کامنی[1] ہے، کیا آنکھ چلبلی ہے
سوتے سے آنکھ میری جب رات کو کھلی ہے اس مشتری کی صورت نظروں میں آملی ہے
اس گل نے سادہ وضعی جو اختیار کی ہے جوڑا بھی پانو میں ہے اس کے تو بلبلی[2] ہے
خواہش رہی ہے مجھ کو کب گل رخاں، کی یارو دل کا مرے کبوتر داغوں سے خودگلی[3] ہے
جس دشت میں پڑا تھا مجنوں کا کاسۂ سر پیشانی اپنی برسوں واں خاک میں رُلی ہے
آئینے کی طرف تو دیکھا بہت کرے ہے اب تیری بھی طبیعت شاید ادھر ڈُھلی ہے
تحریری جو اس نے کاجل کی ایک دی تھی میں کیا کہوں کہ اُس کی آنکھوں میں کیا گھلی ہے
موجِ نسیم مجھ کو دیتی ہے مشک کی بو اُس نازنیں کی شاید چوٹی کہیں کھلی ہے

تعزیر کیوں نہ پہنچے نا شاعروں کو تجھ سے
اے مصحفی تو فن کا اپنے علی قلی[4] ہے

529

دامن کی اس کے چین جو ساری نکل گئی ہم کیا کہیں کہ جان ہماری نکل گئی
ڈالا مڑوڑ ہاتھ کو اس ناتواں نے واہ بس آپ کی چھری و کٹاری نکل گئی
لیلیٰ کی تب خبر ہوئی مجنوں کو نجد میں جب واں سے دور اُس کی عماری نکل گئی
آئی بہار باغ میں اس دھوم سے کہ بس دیوانہ ہو کے بادِ بہاری نکل گئی
تو چشم خوں فشاں کا مرے دے سکا نہ ساتھ شیخی تری بھی، ابرِ بہاری، نکل گئی

1- کامنی = نازک، کومل 2- بلبلی = جوتی کی ایک قسم 3- گلی = کبوتر کی ایک قسم
4- علی قلی والہ داغستانی مصنف تذکرہ ریاض الشعراء وغیرہ۔

اب خاک زار روویں کہ دو آنسوؤں میں رات		تھی وہ جو دل میں حسرت و زاری نکل گئی

لمبے[1] ہوئے وہ، کھاتے تھے زخم اس کی تیغ کے		بس ایک دم میں یاروں کی یاری نکل گئی

بو کس کی زلف کی اسے پہنچی کہ باغ سے		آشفتہ ہو نسیمِ بہاری نکل گئی

جب شاخِ گل نے اس سے لیا اپنا منھ پھرا		آبِ رواں کی آئینہ داری نکل گئی

فانوس میں پتنگ گرفتار رہ گیا		اور صبح ہوتے شمعِ حصاری[2] نکل گئی

بیٹھا ہے انتظار[3] تو یاں کس کے مصحفیؔ
ناداں ادھر سے اُس کی سواری نکل گئی

530

ہوا ہے مجھ پہ ستم میری آہ و زاری سے		گلہ نہیں مجھے کچھ دل کی بے قراری سے

خدا پرست بڑا مرد اسے کہیں ہیں جو شخص		قدم رکھے ترے کوچے میں ہوشیاری سے

☆☆☆☆

مثلّث در مصرعہ ہائے فارسی

بند یک مصرعہ تضمین است

ہے سخت اُس کا سینہ مانندِ سنگ خارا
دل می رود ز دستم صاحبدلان خدا را
دردا کہ راز پنہان خواہد شد آشکارا

مثلّث دیگر بہ زبانِ ہندی

پیمانہ اپنی عمر کا اب بھر چکے ہیں ہم
اک جان ہے سو نذر تری کر چکے ہیں ہم
یہ جان لے تو، جان مری، مر چکے ہیں ہم

☆☆☆☆

رباعیات

1

کس کام کی ہے یہ نقشِ باطل مٹی
پژمان[1] و ضعیف و ست و کاہل مٹی
آگاہیِ حق نہ ہووے جس انساں میں
پھبتا ہے جو کہیے اس کو غافل مٹی

2

معنی مرے ہر ایک ہیں مثبت بھولے
نقطوں کی صفا سے عقل ات گت بھولے
کب بافت مری اُڑا سکے ہے کوئی
تا میں نہ بتاؤں ہے یہ دیکھت بھولے

3

تا چند مرا عشق میں جی کھاوے دل
پھر اس کی ادا پر مجھے لے جاوے دل
اے کاش کہیں اپنا کیا پاوے دل
سینے میں تڑپ تڑپ کے رہ جاوے دل

1- پژمان = بجھاہوا، اُدھموا

4

کیا بد ہے جو ہووے ربطِ شاعر تم سے
خوش دل ہو شب وصل مجھ سا ماہر تم سے
اب تم بھی سمجھ کے جی میں مل ہی جاؤ
بدنام تو ہم ہوئے ہیں آخر تم سے

5

چھپ جائے ہے ٹک بھی وہ گر از پیشِ نظر
ہو جاؤں ہوں اتنے ہی میں، میں تو مضطر
جب وصل میں مصحفی یہ حالت ہو مری
کیا جانے فراق میں کٹے گی کیونکر

6

وہ جن کے لباس لالہ گوں ہوتے ہیں
کمتر وہ ذروں سے بہ بڑوں ہوتے ہیں
کیا جانتے یہ نہیں کہ یہاں گلیوں میں
پاجامۂ گلبدن[1] پہ خوں ہوتے ہیں

7

قدموں کو ترے چھوڑ کدھر جاؤں میں
تیرا کہلا کے کس کے گھر جاؤں میں
آتا ہے یہی جی میں کہ اُٹھ کر سو بار
تجھ پر سے نثار ہو کے مر جاؤں میں

1- گلبدن = کپڑے کی ایک قسم

8

یا گوشۂ عافیت کہ نہ تنہا ہووے
یا دامنِ دشت و در کہ صحرا ہووے
اُس دم میں کہوں جو تو مقابل ہو مرے
مخفی[1] تو ہووے، اور دنیا ہووے

9

جس شب میں تجھے پیار کیا ہووے گا
تو نے اُسی شب یار کیا ہووے گا
القصہ کہ شاہدِ تصوّر کو مرے
اپنی ہی طرح خوار کیا ہووے گا

10

تحلیل نہ ہووے کیونکے یہ جسم گلی
اس پر تو سدا فوجِ غم آتی ہے چلی
کیا خاک میں زندگی کروں دنیا میں
جو چیز کہ میرے دل نے چاہی نہ ملی

11

شر ہے سو شر ہے، خیر پھر خیر ہی ہے
کعبہ کعبہ ہے دیر پھر دیر ہی ہے
تم کیوں نہ پھرو اپنوں سے ملتے، سچ ہے
اپنا اپنا ہے غیر پھر غیر ہی ہے

1- مخفی مصحفی کی محبوبہ کا نام ہے

12

صاحب زادے نے پائی چیچک سے شفا
جو داغ تھا پوست کندہ وہ صاف ہوا
اول تو بدن تھا اس کا جوں ماہ تمام
اب چرخِ منقّش نے ستاروں سے جڑا

13

خوں کم جو کیا آپ نے بعد از نو روز
رخسارۂ خوش دلی ہوا جلوہ فروز
بادام و چھوارہ و گری، خواں میں لیے
حاضر ہے فلک اس در دولت پہ ہنوز

14

خوں آپ نے بہر صحتِ تن جو لیا
کیا کیا نہ فلک نے خونِ دل اپنا پیا
تھا طائرِ پَر بستہ قفس میں گویا
آتے ہی بہار اُس کو آزاد کیا

15

آتے ہی ترے خوشی ہوئی اپنے تئیں
آنے سے ترے شاد ہُوا چرخ بریں
جوں مَقدمِ نو روز یہ آنا تیرا
ہو سب کو مبارک اے مہِ زہرہ جبیں

16

یا رب نہ میں تجھ سے جاہ و حشمت مانگوں
نے مال و زر اور نہ ملک و دولت مانگوں
جب تو ہی کہے کہ "مانگ کیا مانگے ہے؟"
تب میں کہیں ایک نگاہِ حسرت مانگوں

17

یا رب مرے دل سے تو آگاہ ہے خوب
شاعر کے تہِ دل سے تجھے راہ ہے خوب
پتلے سے مرے کہا تھا کوئی مجھ سے
"جا چاہ بتاں کو وہاں کہ ہاں چاہ ہے خوب"

18

چاہے تھا کوئی مجھ سے کہ آمیزش ہو
جوں چاہے ہے دل ادھر سے انگیزش ہو
پر ہو جو سیاہ نامۂ خواریِ عشق
کہہ تو ہی قلم سے اُس کے خیزش ہو

19

جوں آب ہو بہہ چلے ہے رونا ہے وہی
جو آگو ہی مر مٹے ہے سونا ہے وہی
اندیشہ نہ یاں کے رنج و غم کا کیجے
تقدیر میں جو لکھا ہے ہونا ہے وہی

20

یا رب نہ میں مست گل صفا کے قابل
نے زُہد و ورع نہ اتّقا کے قابل
یہ بس، کہ کیا مجھ کو مسبّب نے ترے
صد گونہ مصیبت و بلا کے قابل

21

جب تک کہ نہ کربلا کے زائر یہ تھے
ظاہر ہے کہ دشت کے مسافر یہ تھے
بن کر آئے ہیں وہاں سے پاکیزہ بلا
کہنے کو وگر نہ یاں تو شاعر یہ تھے

22

جو بانیِ دین ہیں اُن کو دیتے ہیں بھوگ
اور کرتے ہیں زر کے واسطے برسوں جوگ
کھا جاتے ہیں سیکڑوں بہ تقواے صلاح
پھر اُس پہ بھی بے طمع کہاتے ہیں یہ لوگ

23

شمشاد، نہ نخلِ تاک کو کہتے ہیں
خورشید، نہ مشتِ خاک کو کہتے ہیں
یاں دینِ فسادیوں کا مذکور نہیں
ہم شیعہ، گروہِ پاک کو کہتے ہیں

24

اے مصحفی ہے تجھ سے ہر اک شخص کو لاگ
رنڈی مردوں سے اس محلّے کے بھاگ
مل جائے مکان دل نشیں سا تجھ کو
شاید ترے بختِ خفتہ جاویں جاگ

25

اس رنج میں تو نے بہت دکھ پایا
اور مارے قلق کے سخت تو گھبرایا
اب ہے یہ دعا کہ مصحفی تجھ پہ رہے
اللہ و محمدؐ و علیؑ کا سایا

مخمسات

مخمس بر غزل سودا

گو زمانے نے کیا صاحبِ دیواں مجھ کو
بندگی لکھتے ہیں سب گبر و مسلماں مجھ کو
پر بتاں سمجھیں ہیں کب ظلم کے شایاں مجھ کو
چیز کیا ہوں جو کریں قتل وہ انکھیاں مجھ کو
پھیر لیں دیکھ کے منھ، خنجرِ مژگاں مجھ کو

مردم اس چشم کی خوں ریزی سے مانگیں ہیں حذر
کیونکہ اک خلق ہوئی ہے علفِ تیغ و تبر
نے غلط بلکہ جو میں غور سے کرتا ہوں نظر
سیر کرتا ہے خیال اس کی نگہ کا جیدھر
نظر آتے ہیں اُدھر گنجِ شہیداں مجھ کو

نہ مری دبدبۂ حشمتِ شاہی پہ نظر
نہ مرا کوے گدایاں و تونگر میں گزر
گو کہ ہو گلشنِ فردوس جہاں سر تا سر
گل و گلزار ترحم ہوں کسی کے سر پر
جا خوش آتی نہیں جز گورِ غریباں مجھ کو

سر میں ہر غنچے کے آتی ہے نظر بادِ غرور
اور جو گل ہے سو وہ ہے مرے سائے سے نفور

سرکشی کا میں نہالوں کی کروں کیا مذکور
اے نسیمِ سحری مہر و مروت سے دور
بے نہایت نظر آیا یہ گلستاں مجھ کو

آئی رخصت مجھے کرنے نہ صبا چلتے وقت
ہمرہی کو نہ کوئی نخل اُٹھا چلتے وقت
کی مرے ساتھ کسی نے نہ وفا چلتے وقت
ایک گل تک مرے مانع نہ ہوا چلتے وقت
خار نے بھی نہ رکھا کھینچ کے داماں مجھ کو

بادشاہوں سے سلوک اُس نے کیا، کیا کیا کچھ
بےنواؤں نے بھی چھاندے[1] میں لیا، کیا کیا کچھ
تشنہ کامانِ محبت نے پیا، کیا کیا کچھ
ایک عالم کو زمانے نے دیا، کیا کیا کچھ
پر کبھی میں نہ کہا اُس سے، کہ دوراں مجھ کو

کس کے گھر کر کے گیا تھا تو بہانا سچ کہہ
کون الفت کا سناتا تھا فسانا سچ کہہ
کس کی آغوش میں بیٹھا تھا تو جانا[2] سچ کہہ
ہاتھ کس کا تھا تری زلف کا شانا سچ کہہ
رات آتے تھے نظر خوابِ پریشاں مجھ کو

ملحدی کا مری ہے شہر میں چرچا، اے شیخ
خوش نہیں طور سے میرے کوئی اصلا، اے شیخ

1- طفیل میں 2- جانا = یعنی اے جان (الف ندائیہ ہے)

عندیہ میرا کسی پر نہیں کھلتا، اے شیخ
کس کی ملت میں گنوں آپ کو بتلا، اے شیخ
تو کہے گبر مجھے، گبر مسلماں مجھ کو

صحبت ان کی نہیں گر دیکھیے جائے غَش غَش
سیم اخلاص کو پاتا نہیں مطلق بے غَش
جتنے یہ گرم ہیں وتنے ہی ہیں خو کے سرکش
مجھ میں اور یاروں میں ہے ربطِ سپند و آتش
اِن کی جوشش نے کیا اُن سے گریزاں مجھ کو

مصحفی کے یہ معاصر تو ہیں درپے، سودا
اُن کی باتیں یہ اُٹھایا کرے تا کے سودا
آج کے دن کو تو منصف نہیں، ہے ہے سودا
ریختہ اور بھی دنیا میں رہے اے سودا
جینے دیوے جو کبھی کاوشِ یاراں مجھ کو

مخمس بر غزل سودا

کیوں کر کہوں یہ سوز دلِ بحر و بر میں ہے
یا سینۂ کواکب و شمس و قمر میں ہے
نے آہنِ گداختہ و نے حجر میں ہے
آتش جو عشق کی ہے سو نورِ بصر میں ہے
شعلہ زباں دراز مری چشم تر میں ہے

ہیں مجھ سے کیں کشی پہ جو اہلِ قلم تو کیا
کرتے ہیں بازگونہ[1] مضامیں رقم تو کیا

1- بازگونہ مضامیں = دہرائے ہوئے

یاروں کے ہم اُٹھاتے ہیں جور و ستم تو کیا
آتے نہیں نظر میں کسی کی جو ہم تو کیا
عالم تو سب طرح کا ہماری نظر میں ہے

تازی[1] کو جانتے ہیں کج انصاف خر سے کم
سمجھیں ہیں آفتاب کو جُرمِ قمر سے کم
جُرمِ گہر ہو کیا جو شبیہ ہو گہر سے کم
اب ہے جہاں میں بدگہری کس ہنر سے کم
عیب اس زمانے میں جو کہو سو ہنر میں ہے

بالقوہ[2] یہ کہاں کہ لکھے پے بہ پے وہ مدح
یا تحفہ لاوے از پے کاؤس و کے[3] وہ مدح
کیوں لغو بولے سمجھے اگر کچھ بھی شے وہ مدح
ہاجی[4] کا جو سخن ہے مرے حق میں ہے وہ مدح
کب رتبہ میری ہجو کا اُس کی نظر میں ہے

میں اپنی نا کسی کا کہوں کس سے ماجرا
شایستہ قبول نہیں حالِ بد مرا
منہ پھیر لیویں دوست ہی جب مجھ سے ہو جدا
مجھ سے کی پرورش میں، رہے کون تجھ سوا
یہ حوصلہ بہ زیرِ فلک کس بشر میں ہے

اتنا بھی ہرہی پہ مری مر نہ عندلیب
راہِ منازعت[5] میں قدم دھر نہ عندلیب

1- تازی = عربی نسل کا گھوڑا 2- بالقوہ = صلاحیت Potential 3- کے = کیقباد
4- ہاجی = ہجو کرنے والا 5- منازعت = جھگڑا

دعویٰ فغاں کا ساتھ مرے کر نہ عندلیب
رخصت نہیں ہے میرے تیئں ورنہ عندلیب
تاثیرِ صد ترانہ اک آہِ سحر میں ہے

عاشق ہیں جو ترانۂ لیل و نہار کے
رہتے ہیں گرد اپنے ہی جو اعتبار کے
جویا ہوں کیوں نہ غش سخنِ آبدار کے
دنداں مثالِ در ہیں دہن میں جو یار کے
مصرع مری زباں کا بھی سلکِ گہر میں ہے

گو دعوت اک جہاں کی خداے جہاں کرو
بادام کوکب، اور مہ و خور طشتری بنو
کیا ذکرِ نانے و نوش سے حاصل ہے دوستو
خوانِ فلک ہے نعمتِ[1] اَلواں سے پُر تو ہو
قسمت جہاں تہاں مری خونِ جگر میں ہے

وہ کینہ کش ہے در صَددِ قتلِ ذی حیات
مشکل ہے اُس کے ہاتھ سے ملنی رہِ نجات
ایسے میں رستم اُس سے کوئی کر سکے ہے بات
شمشیر جوں ہلال محرّم ہے اُس کے ہات
شیون دہے کی طرح سے ہر ایک گھر میں ہے

اس مفلسی میں ہووے بھلا کس چمن کا سیر
موقوفِ زر ہے، چاہے کوئی جس چمن کا سیر

1- نعمت اَلواں = رنگ برنگ نعمتیں

زر ہی نہ ہو تو کیجیے کس کس چمن کا سیر
جوں غنچہ ہو گرہ میں تو کر اس چمن کا سیر
جھمکا ہزار رنگ کا اک مشتِ زر میں ہے

دامِ بلا میں مصحفی ہوتی اسیر خلق
جاتی چبوترے[1] ہی کو ہو دست گیر خلق
پر شکر ہے کہ ہونے نہ پائی حقیر خلق
سودا کی ے خوری سے ہے منّت پذیر خلق
قاضی بھی فتویٰ دے ہے کہ خیر اس کی شر میں ہے

مخمس در خطاب نواب وزیر الممالک آصف الدولہ مرحوم

بہ امام ہجو و مہاجاۃ از انشا در حالتِ قلق گفتہ شد

در بیان متّہم شدن ہجو گفتن شاہزادہ عالمیان مرزا سلیمان شکوہ بہادر و انکار آن و استغاثہ نمودن بہ جناب نواب آصف الدولہ بہادر مغفور

اوّل تو مدح گوے پیمبرؐ ہے مصحفی
پھر نغمہ سنجِ مدحتِ حیدر ہے مصحفی
مسکیں فقیر ہے، نہ تونگر ہے مصحفی
ملکِ سخن کا صاحب افسر ہے مصحفی
سب جانتے ہیں اُس کو کہ بے شر ہے مصحفی

اُس کا دہن ہے یہ، جو کرے شاہ کی ہجا
ہے سب یہ اُس غریب پہ انشا کا افترا

1- چبوترے سے مراد پاداش، جہاں مجرموں کو سزا دی جاتی تھی

بغض اپنا وہ نکالے ہے لے شہ کا اڑتلا[1]
کس واسطے کہ اُس کا سخن اس پہ ہے رسا
فکرِ غزل میں لاکھوں سے بہتر ہے مصحفی

واقف ہیں میر سوز بھی خوب اس کے حال سے
کچھ مطلع ہیں میر بھی اس کے کمال سے
نفرت ہے اُس کو ایسے تو قال و مقال سے
لیکن عجب نہیں یہ زمانے کی چال سے
گر سب کہیں کہ تیغ کے درخور[2] ہے مصحفی

ہے جاے عدل، آصفِ دوراں تری جناب
رکھتا ہے عرض تجھ سے یہ مدّاحِ بوترابؑ
پہنچے یہ اپنی داد کو اور ہووے کامیاب
تا سب کہیں کہ ''ناجی ہے یہ باب بے حساب''
ہاجی نہیں کسی کا، ثنا گر ہے مصحفی

آیا تھا لکھنؤ کو سمجھ کر یہ جاے امن
گوشے میں پا شکستہ پڑا تھا براے امن
اخبار میں لکھا ہی گیا ماجراے امن
بگڑی نظر پڑے ہے مجھے اب ہواے امن
جو حکم ہو سو کہیے کہ مضطر ہے مصحفی

اُس کا نہ کوئی یار نہ یاور ہے اس جگہ
نے خویش و آقربا نہ برادر ہے اس جگہ

1- اڑتلا = حمایت، سہارا، پشت پناہی 2- درخور (بروزن برسر) = سزاوار

پر کیا کہے جو حادثہ اس پر ہے اس جگہ
ہر سو اُسی کی ہجو کا دفتر ہے اس جگہ
ناحق مغلّطات کا مَصْدر[1] ہے مصحفی

ایسی ہی بدعتیں ہوئیں گر شہر میں عیاں
اہلِ کمال کاہے کو کوئی رہے گا یاں
کیا وا کرے گا شعر و سخن میں کوئی زباں
ہوویں گی شاعروں کی یہ رسوائیاں جہاں
اِس ماجرے سے سخت مکدّر ہے مصحفی

شاعر جو آپ اس سے کرے ابتدائے ہجو
لکھوا کے بھیجے شعر و غزل از برائے ہجو
کیا مدح یہ جواب میں لکھے بجائے ہجو
اس کی سنے نہ اپنی پھر اس کو سنائے ہجو
کیا شاعروں میں اتنا محقّر ہے مصحفی؟

پوچھو تو یاں جواب ہے ہر اک سوال کا
پر تب جو محکمہ ہو کہیں قیل و قال کا
جب حرف درمیان میں آیا قتال کا
پھر کیا کمال تظمِ ظہیر، و کمال کا[2]
حاصل کہ ہم فنوں میں قدآور ہے مصحفی

1- مغلطات کا مصدر خود کو کہنے سے تو اُلٹا مفہوم نکلتا ہے۔ یہاں مغلطات کا ہدف یا مورد کہنا چاہتے تھے۔

2- ظہیر فاریابی اور کمال خجندی فارسی شعراء کی طرف اشارہ ہے

مخمس

آئے تھے دیکھنے کو سراپا چلے گئے
بس جھوٹ موٹ دے کے دلاسا چلے گئے
رہنے کو گر کہا تو نہ مانا چلے گئے
شب کر کے تم جو وعدۂ فردا چلے گئے
آنسو ہمارے جانبِ دریا چلے گئے

رکھتے تھے داغِ سجدہ جو آرایشِ جبیں
رہتا تھا سر جنھوں کا سدا ساجدِ زمیں
رختِ سفر کو باندھ نہ کچھ اُٹھ چلے ہمیں
کیا کیا نہ پیر صومعہ و خانقاہ نشیں
ہو اس جواں کے عشق میں رسوا چلے گئے

رکھا جو تیغِ ناز کو ٹک تم نے پر فشاں
کیا کیا نہ دہر میں ہوئیں خوں ریزیاں عیاں
کیا تم سے میں بیاں کروں احوالِ رفتگاں
در پر تمھارے اہلِ ہوس رہ گئے میاں
حسرت کشانِ زخمِ تمنا چلے گئے

کیا کیا نہ تفرقے ہوئے گیسوے زلف دیکھ
آنسو دراز ہو کے بہے روے زلف دیکھ

آہیں جو کہکشاں کو گئیں خوے زلف دیکھ
کانوں کے موتیوں پہ ترے موے زلف دیکھ
نالے مرے بہ سوے ثریا چلے گئے

پھرتے رہے ہمیشہ بہ سودائے رنگ و بو
مثلِ نسیم ہم کو رہی گل کی جستجو
گلشن سے ہو کے کرتے ہوئے سیر کو بہ کو
آئے تری گلی میں جو سرگشتہ ہم کبھو
جوں گرد بادِ دامنِ صحرا چلے گئے

تھی جن کی سرکشوں کو تمنائے خاک بوس
تابع میں جن کے زنگ سے تھا تا بہ روم و روس
بامِ فلک پہ جن کا سدا باجتا تھا کوس
دارا رہا، نہ جم، نہ سکندر، نہ فیلقوس
ہستی سے لوگ دیکھ تو کیا کیا چلے گئے

مشتاق ایک عمر سے تھے ہم تو آپ کے
ہر چند آپ پردۂ خلوت میں کچھ نہ تھے
پر کیجیے کیا نصیب ہی یاری اگر نہ دے
لوٹیں بہاریں حسن کی اوروں نے بزم سے
ہم کم نصیب وقتِ تماشا چلے گئے

کچھ پاسِ دوستی بھی زمانے میں ہے بھلا
اتنا تو دور بھی نہ گیا تھا یہ قافلا

وا ماندہ گو میں ساتھ تمھارا نہ دے سکا
اے ہمرہانِ پیش قدم تم کو کیا ہوا؟
وادی میں مجھ کو چھوڑ کے تنہا چلے گئے

تختے لکھے ہوئے ہیں گل و لالہ زار کے
پتھر میں رخنے کرتے ہیں نالے ہزار کے[1]
اہلِ جنوں کو ڈھونڈتے ہیں دن بہار کے
کیا جانے کس مقام کو کوچے سے یار کے
آوارگانِ دشتِ تمنّا چلے گئے

یارو یہ آئی دیکھنے میں طرفہ واردات
تھی جن کے زیرِ حکم سدا موت اور حیات
روز اُن کا جب کہ ہونے لگا خودشبِ وفات
نکلی نہ منھ سے ایک کے کچھ اس کے آگے بات
منھ اُس کا دیکھ خضر و مسیحا چلے گئے

ہرگز نہ اُن کی چینِ جبیں کی گرہ کھلی
دیکھا کبھو نہ چہرے پہ رنگ شگفتگی
پیدا ہو پھیر کیونکے ہمیں اُن سے رفتگی
ہم وہ گناہگار ہیں خوباں کے مصحفی
جب آئے کر کے دور سے مجرا چلے گئے

☆☆☆☆

1- ہزار ایک چھوٹا سا پرندہ (مولا)

مسدّسات

مسدّس، ترجیع بند

عیسیِ مریم آپ ہو میرے سے جب شفا طلب
ہجر کے درد کی کروں کس سے میں پھر دوا طلب
طرفہ قلق میں ہے مرا آہ دلِ بلا طلب
دو میں سے ایک کام کر، بس نہیں اس سوا طلب
یا منِ ناصبور را پیشِ خود از وفا طلب
یا کہ تو پاک دامنی صبر من از خدا طلب

دل ہے یہی تو عشق میں تیرے میں چین پا چکا
گر ہے یہی قلق تو بس راتوں کو خواب آچکا
پردۂ ننگ و شرم کو صاف میں اب اُٹھا چکا
صبر کہاں تلک کروں صبر سے کام جا چکا
یا منِ ناصبور را پیشِ خود از وفا طلب
یا کہ تو پاک دامنی صبر من از خدا طلب

اے کہ ہے تیرے حسن میں جلوہ گر اک جہانِ حسن
خالِ عذار ہے ترا نیّرِ آسمانِ حسن
عشق کی پاس رکھ مرے، کچھ تو تجھے بجانِ حسن
اتنے میں گھٹ نہ جاوے گی کچھ تری عزّ وشانِ حسن

یا منِ نا صبور را پیشِ خود از وفا طلب
یا کہ تو پاک دامنی صبر من از خدا طلب

بے طلب آؤں تجھ تلک میرا یہ حوصلہ نہیں
صبر پہ دل رکھوں اگر، صبر کبھی کیا نہیں
حال جو کچھ کہ ہے مرا، تجھ سے سو وہ چھپا نہیں
تیرے مریضِ عشق کی اس کے سوا دوا نہیں

یا منِ نا صبور را پیشِ خود از وفا طلب
یا کہ تو پاک دامنی صبر من از خدا طلب

دیکھ تو درمیاں رہے شرم و حجاب کب تلک
لب پہ خموشی تا بہ کے، منھ پہ نقاب کب تلک
لاوے دلِ حزیں مرا ہجر کی تاب کب تلک
کوئی اُٹھاوے جانِ من نت کے عذاب کب تلک

یا منِ ناصبور را پیشِ خود از وفا طلب
یا کہ تو پاک دامنی صبر من از خدا طلب

شانِ تغافل ان دنوں رکھ دے اُٹھا کے طاق میں
کیونکہ یہ جاں بہ لب ترا مر ہی نہ جا فراق میں
لطف ہے کیا کہ دے کوئی جان کو اشتیاق میں
بیٹھ کے مثلِ خسرواں سب سے الگ رواق میں

یا منِ نا صبور را پیشِ خود از وفا طلب
یا کہ تو پاک دامنی صبر من از خدا طلب

خاک بہ سر پھرا کروں کب تئیں آہ کو بہ کو
مثلِ صبا لگی رہے گل کی ہمیشہ جستجو
لے تو نہ جاؤں تجھ سے میں دل میں امید رنگ و بو
تیرے دلِ رحیم سے ہے یہی دل میں آرزو

یا منِ ناصبور را پیشِ خود از وفا طلب
یا کہ تو پاک دامنی صبر من از خدا طلب

کیونکے کہوں زمانے میں مہر نہیں وفا نہیں
لیلیٰ نے قیس کے تئیں جی سے طلب کیا نہیں
جورِ فراق سے ترے مجھ میں تو کچھ رہا نہیں
مجھ سے تغافل اس قدر تجھ کو صنم روا نہیں

یا منِ ناصبور را پیشِ خود از وفا طلب
یا کہ تو پاک دامنی صبر من از خدا طلب

ایک ہی شہر میں رہوں تجھ سے جدا میں روز و شب
اس کے سوا زمانے میں ہووے گا اور کیا غضب
اتنی ہی تجھ سے آرزو رکھے ہے اب یہ جاں بہ لب
تیری دعا قبول ہے تجھ سے ہی ہو سکے ہے سب

یا منِ ناصبور را پیشِ خود از وفا طلب
یا کہ تو پاک دامنی صبر من از خدا طلب

گرچہ ہنوز ہے صنم قصۂ عشق گو مگو
جی بھی مرا یہ کھا گیا راتوں کو زار زار رو

اس دلِ بیقرار کو چین کسی طرح تو ہو
سخت الم کشیدہ ام از ستمِ فراقِ تو

یا منِ ناصبور را پیشِ خود از وفا طلب
یا کہ تو پاک دامنی صبرِ من از خدا طلب

دل سے اُٹھے ہے دم بہ دم شعلہ مری زباں تلک
جاوے ہے نالہ ہر گھڑی مضطرب آسماں تلک
کام ہی ہو چکا ہے یاں ناز کے امتحاں تلک
ضبطِ غمِ فراق آہ کوئی کرے کہاں تلک

یا منِ ناصبور را پیشِ خود از وفا طلب
یا کہ تو پاک دامنی صبرِ من از خدا طلب

ترکِ فلک ہے متصل بر سرِ جور کافری
طالعِ دوں کی میں سہوں کب تئیں یہ ستم گری
کر گئی ہے نظر تری مجھ پہ تو سحر سامری
چاہے ہے زیست میری تو از رہِ لطف اے پری

یا منِ ناصبور را پیشِ خود از وفا طلب
یا کہ تو پاک دامنی صبرِ من از خدا طلب

خون بجل ہوا مرا رنگِ حنا کے واسطے
خاک میں مل گیا ہوں میں اس کفِ پا کے واسطے
جاوے ہے جان ہی مری ایک ادا کے واسطے
دیکھ زیادہ مت ستا، مان خدا کے واسطے

یا منِ ناصبور را پیشِ خود از وفا طلب
یا کہ تو پاک دامنی صبرِ من از خدا طلب

طول نہ دے فراق کو عصمتِ بے وفا کے طور
کیونکہ اُٹھائے ہیں بہت میں نے جدائیوں کے جور
مطلب و مدعا مرا اِس کے سوا نہیں کچھ اور
حالِ تباہ پر مرے کر کے ذرا نگاہِ غور

یا منِ ناصبور را پیشِ خود از وفا طلب
یا کہ تو پاک دامنی صبر من از خدا طلب

تیری خوشی ہے جو پھروں کوچہ بہ کوچہ در بہ در
چشم پہ آستیں رکھے اور بڑھائے موے سر
دل کو رکھے گا روک کب تیئں، قصہ مختصر
مصحفی قاصد آوے تو اب کے یہی تو عرض کر

یا منِ ناصبور را پیشِ خود از وفا طلب
یا کہ تو پاک دامنی صبر من از خدا طلب

مسدّس حسب حال خود و ابناے زمانہ گوید

ابناے روزگار کا کیا ماجرا لکھوں
طاقت نہیں ہے ضبط کی، پر چپ ہی کیوں رہوں
سارے جہاں کو لاگ ہے، جس سے وہ میں ہی ہوں
اب حسب حال چاہیے مطلع یہی پڑھوں

مشتے خسیس ریزہ کہ اہل سخن نیند
با من قِران کنند قرینانِ من نیند

ظاہر ہے ان کے شعر کا ہر اک پہ مرتبا
یہ لوگ اک تو ہوتے نہیں منفعل ذرا
منھ میں جو کچھ کہ آوے ہے (بکتے ہیں) بے حیا
پھر مجھ سے بزم شعر میں آنکھیں ملا ملا

مشتے خسیس ریزہ کہ اہلِ سخن نیند
با من قِران کنند قرینانِ من نیند

یہ جانتے نہیں میں وحیدِ زمانہ ہوں
اس فنِ شعر میں بہ فصاحت یگانہ ہوں
نقاش ثانیِ غزلِ عاشقانہ ہوں
کیوں کر کہ تیرِ طنز کا اُن کے نشانہ ہوں

مشتے خسیس ریزہ کہ اہل سخن نیند
با من قِران کنند قرینانِ من نیند

بے صرفہ بک اُٹھے یہ جو آیا دہن کے بیچ
زنہار ان کو فرق نہیں مرد و زن کے بیچ
نسبت مری اگرچہ یہ ناقص ہیں فن کے بیچ
پر پھول پھول بیٹھ کے بزمِ سخن کے بیچ

مشتے خسیس ریزہ کہ اہل سخن نیند
با من قِران کنند قرینانِ من نیند

ہیں آپ ہی یہ معاملہ گوئی پر اپنی شاد
لعنت برایں معاملۂ عشقِ پُر فساد

ایسا ہی ہووے دیوے جو ان کے سخن کی داد
ہے ننگ شاعراں کو، جو طرزِ سخن ہے یاد
مشتے خسیس ریزہ کہ اہل سخن نیند
با من قِران کنند قرینانِ من نیند

اعجاز سے سخن کے مگر آشنا نہیں
شاید اُنھوں نے فنِ بلاغت پڑھا نہیں
لکھی غزل نہیں کہ قصیدہ بنا نہیں
پھر اس پہ غیرِ غلغلۂ واہ وا نہیں
مشتے خسیس ریزہ کہ اہل سخن نیند
با من قِران کنند قرینانِ من نیند

رکھتے ہیں رات دن مرے کینے کا یہ خیال
میں بھی جوان کو سمجھوں ہوں خایے کا اپنے بال
ہے یہ تو فنِ شعر میں ان کے تئیں کمال
کر کر کے جھومتے ہیں بیاں اپنا حسبِ حال
مشتے خسیس ریزہ کہ اہل سخن نیند
با من قِران کنند قرینانِ من نیند

مشہور ہے کلام مرا جز رسوں کے بیچ
یہ بات بھی میں کم نہیں ان سے کسوں کے بیچ
پر کیا کروں گذر ہے مرا ناکسوں کے بیچ
تب تو گمان اپنے میں یہ مجلسوں کے بیچ
مشتے خسیس ریزہ کہ اہل سخن نیند
با من قِران کنند قرینانِ من نیند

ویسی ہی کانا پھوسی ہے ویسی ہی زرگری
سمجھیں ہیں شاعروں کو یہ ہزّال مسخری
وضعِ سخن میں اُن کی نکلتی ہے ابتری
اس پر سمجھ کے آپ کو سعدی و عنصری
مشتے خسیس ریزہ کہ اہل سخن نیند
با من قِران کنند قرینانِ من نیند

ہر دم مری شکست کا ان کو رہے خیال
یہ جانتے نہیں یہ بڑا امر ہے محال
کو آفتابِ تیز و کجا آتشِ زغال[1]
لیکن یہ اس سمجھ پہ لگا کر کے مور چال
مشتے خسیس ریزہ کہ اہل سخن نیند
با من قِران کنند قرینانِ من نیند

بر جائے گوش و چشم بنا ناک کان کو
اپنی زبان سمجھیں ہیں اُردو زبان کو
حیف اب اگر گگن نہ کہیں آسمان کو
تو کیونکے جیتیں معرکۂ امتحان کو
مشتے خسیس ریزہ کہ اہل سخن نیند
با من قِران کنند قرینانِ من نیند

ہر چند پنڈے والوں کو اس کی بلا ہے قدر
دُھرپت کے آگے پر کھوپٹے کی کیا ہے قدر
جو ہووے ساتھ قدر کے وہ خوشنما ہے قدر

1- زُغال = کوئلہ

بجّو[1] کی تان سین کے آگے روا ہے قدر؟

مشتے خسیس ریزہ کہ اہل سخن نیند
با من قِران کنند قرینانِ من نیند

باندھیں یہ نظمِ ست میں جب معنیِ سخیف
اور اپنے زعم میں اسے سمجھیں بہت لطیف
تس پر یہ آ کے مجھ تنِ تنہا کے ہوں حریف
کیوں کر ہنسیں نہ ان پہ پھر اس کام کے ظریف

مشتے خسیس ریزہ کہ اہل سخن نیند
با من قِران کنند قرینانِ من نیند

میں جانتا ہوں یہ کہ رکھیں ہیں یہ مجھ سے لاگ
سو بار موڑ دی ہے میں ان ناکسوں کی باگ
اس آرزو میں جاوے مگر بختِ خفتہ جاگ
کرتے ہیں سامنا مرا پھر پھر کے بھاگ بھاگ

مشتے خسیس ریزہ کہ اہل سخن نیند
با من قِران کنند قرینانِ من نیند

سو جا سخن میں ان کے ہے گنجایشِ سخن
سمجھیں ہیں اس سخن کو جو ہیں کاملانِ فن
ہر چند رات دن یہ کیا کرتے ہیں متن
آتا ہے مجھ کو خندہ، بہ این لب بہ این دہن

مشتے خسیس ریزہ کہ اہل سخن نیند
با من قِران کنند قرینانِ من نیند

1- بجّو = بیجو باورا موسیقار

چپ رہ کہ تیرے شعر کی شہرت ہے جا بجا
کس روز تجھ سے آکے کوئی دو بدو ہوا
کیوں کیجیے اس زمانے کا اے مصحفی گِلا
خاقانی اپنے عہد میں آگے ہی کہہ گیا
مشتے خسیس ریزہ کہ اہلِ سخن نیند
با من قِران کنند قرینانِ من نیند

مسدّس

کیا میں فرض کہ آتا ہے سر پہ ماہِ صیام
جہاں میں بہتری کی اُس نے دی صلائے عام
ہماری چاہ کا دیکھیں تو ہووے کیا انجام
ولے کرے ہے یہی عرض بندگی میں غلام
اسیرِ رنجِ کہن غم سے چھوٹ جاوے گا
کنار و بوس میں روزہ نہ ٹوٹ جاوے گا
ابھی معاملۂ دوستی ہے سرد و گُم
نہال مہر و وفا کو لگا ہے ماہ دہم
دکھاوے کیا مجھے دیکھوں تو گردشِ انجم
پہ وصل اتنا تو مشکل نہیں جو چاہو تم
اسیرِ رنجِ کہن غم سے چھوٹ جاوے گا
کنار و بوس میں روزہ نہ ٹوٹ جاوے گا

وہی جنوں، وہی وحشت ہے اور وہی سودا
نہ جان تو کہ گھٹا میرا عشقِ شور افزا
یہ کون وضعِ تغافل ہے، شوخِ بے پروا
کڑھا نہ اتنا مجھے، آ کہیں گلے لگ جا
اسیرِ رنجِ کہن غم سے چھوٹ جاوے گا
کنار و بوس میں روزہ نہ ٹوٹ جاوے گا

نہ گزرے عشرے سے کم جان ہم پہ یہ دہ ماہ
نہ وعدہ عشرۂ ثانی کا دو، سخن کوتاہ
ہمیں تو خوں میں لٹاتی ہے نت تمھاری چاہ
ملو شتاب مرے حالِ بد پہ کر کے نگاہ
اسیرِ رنجِ کہن غم سے چھوٹ جاوے گا
کنار و بوس میں روزہ نہ ٹوٹ جاوے گا

بہانا روزے کا ہے اب، تو پیشتر کیا تھا
کبھو بھی لب پہ مرے تو نے لب کو رکھا تھا
نصیب اپنے تو یہ سال بھر کا روزا تھا
اب آؤ لگ لو گلے، جانے دو نہ تھا یا تھا
اسیرِ رنجِ کہن غم سے چھوٹ جاوے گا
کنار و بوس میں روزہ نہ ٹوٹ جاوے گا

کرو ہو وعدہ محرّم کا مجھ سے کیا صاحب
میں کم نصیب محرّم تلک جیا صاحب
جگر میں باقی نہیں صبر تا کجا صاحب
سخی کے آگے نہیں اتنی یہ عطا صاحب

اسیرِ رنجِ کہن غم سے چھوٹ جاوے گا
کنار و بوس میں روزہ نہ ٹوٹ جاوے گا

کہے ہے کون کہ بندے سے ملیے درشبِ قیر[1]
جو صاف دل ہو تو شب ماہ کی ہے کیا تقصیر
ہے میری جان تو ہونٹوں پہ اے بتِ بے پیر
جو تجھ سے ہو سکے جینے کی میرے کر تدبیر
اسیرِ رنجِ کہن غم سے چھوٹ جاوے گا
کنار و بوس میں روزہ نہ ٹوٹ جاوے گا

ہمیں صنم ترے ملنے کی رہ گئی حسرت
ہمارے شوق پہ تو نے نہ کی کبھی سبقت
زہے حیا و زہے شرم اور زہے غیرت
پر اب بھی کچھ نہیں بگڑا، نظر بہ ایں فرصت
اسیرِ رنجِ کہن غم سے چھوٹ جاوے گا
کنار و بوس میں روزہ نہ ٹوٹ جاوے گا

نہ کر تو میرے تئیں قومِ فاسقین سے قیاس
تو جانتا ہے میں جیسا رکھا ہے تیرا پاس
کہاں تلک میں پھروں رنج نا کسی سے اُداس
گلے سے آکے مرے لگ بھی جا بلا وسواس
اسیرِ رنجِ کہن غم سے چھوٹ جاوے گا
کنار و بوس میں روزہ نہ ٹوٹ جاوے گا

1- شبِ قیر = اندھیاری رات

ہزار حیف کہ رخصت کے دن ہیں اب نزدیک
نہ کیونکے روز سپید اپنا ہو شبِ تاریک
پڑی نہ منھ سے ترے میری آستیں پر پیک[1]
کمر کی اپنے خبر دے کہ وقت ہے باریک
اسیرِ رنجِ کہن غم سے چھوٹ جاوے گا
کنار و بوس میں روزہ نہ ٹوٹ جاوے گا

دریغ و درد کہ فوجِ فراق کا لشکر
ہمارے سر پہ چڑھ آیا بہ نیزہ و خنجر
چھپوں نہ گر ترے دامن میں اب میں جاؤں کدھر
بچھوں تو تب جو تری التفات کی ہو نظر
اسیرِ رنجِ کہن غم سے چھوٹ جاوے گا
کنار و بوس میں روزہ نہ ٹوٹ جاوے گا

تو گھر چلا ہے اگر اپنے، اے بتِ چالاک
تو کس کے قدموں تلے سونپتا ہے میری خاک
کیا مجھے تو صدائے فراق ہی نے ہلاک
جو ہو سکے تو صنم اب بھی کر لے مجھ سے تپاک
اسیرِ رنجِ کہن غم سے چھوٹ جاوے گا
کنار و بوس میں روزہ نہ ٹوٹ جاوے گا

پھر اس طرح سے کرے جان تجھ کو مجھ سے قریں
یہ اعتماد ہے کس کو بہ دورِ چرخِ بریں
کہاں کا روزہ کہاں کا محرّم اے بت چیں

1- پیک = (بروزن ٹھیک) پانوں کا لعاب دہن

لگا دے منھ سے مرے آ کے اپنا روے حسیں
اسیرِ رنجِ کہن غم سے چھوٹ جاوے گا
کنار و بوس میں روزہ نہ ٹوٹ جاوے گا

میں تجھ سے دست درازی کروں یہ کیا مقدور
نہ اب ہے مجھ میں صنم اور نہ آگے تھا مقدور
خدا نے تجھ کو بنایا ہے آپ با مقدور
نہ کر دریغ تو ملنے میں میرے تا مقدور
اسیرِ رنجِ کہن غم سے چھوٹ جاوے گا
کنار و بوس میں روزہ نہ ٹوٹ جاوے گا

گیا تو چھوڑ محرّم ہی میں اگر مجھ کو
ہزاروں کوس پہ ہو جائے گا یہ گھر مجھ کو
فلک بھی وام[1] نہ دیوے گا بال و پر مجھ کو
لگا لے چھاتی سے، اے شوخ سیم بر مجھ کو
اسیرِ رنجِ کہن غم سے چھوٹ جاوے گا
کنار و بوس میں روزہ نہ ٹوٹ جاوے گا

کہے کو مان مرے دور کر تغافل کو
روا نہ رکھ بہت اس امر میں تساہل کو
فراقِ گل ہے، مری جان موت بلبل کو
مزاج اپنے میں، بس جا نہ دے تامل کو
اسیرِ رنجِ کہن غم سے چھوٹ جاوے گا
کنار و بوس میں روزہ نہ ٹوٹ جاوے گا

1- وام = قرض

سمن برا تجھے اپنی سمن بری کی قسم
جبین و رخ کی نہیں ماہ و مشتری کی قسم
نگاہ مست کی، غمزے کی، کافری کی قسم
ملا دے چھاتی ذرا، تجھ کو دلبری کی قسم
اسیرِ رنجِ کہن غم سے چھوٹ جاوے گا
کنار و بوس میں روزہ نہ ٹوٹ جاوے گا

تو اس برس میں اگر مجھ سے میری جاں نہ ملا
ہمیشہ سال دگر تک رہے گا میرا گلا
کسی کو کیوں نہ کہوں، جان ہوں میں تیرا ہلا[1]
اک آدھ قطرہ ہی دے گو نہ جامِ وصل پلا
اسیرِ رنجِ کہن غم سے چھوٹ جاوے گا
کنار و بوس میں روزہ نہ ٹوٹ جاوے گا

میں اپنے شوق کو دوں طول اب کہاں تک جان
غرض یہی ہے مری، مصحفی کا کہنا مان
ترا تو اب بھی ہے قابو، سمجھ نہ او نادان
گلے میں ڈال دے بانہیں کہ نکلے تک ارمان
اسیرِ رنجِ کہن غم سے چھوٹ جاوے گا
کنار و بوس میں روزہ نہ ٹوٹ جاوے گا

1- ہلا (ہلا ہوا) مانوس (عوامی)

مثنویات

در صفتِ بکری

یہ جو بکرے کی پٹھ[1] ہے اپنے پاس
ننھی منّی سی اور مجھولی[2] راس

شکل مطبوع و جلد اعضا خوش
مثلِ آہو برہ[3] سراپا خوش

پیر کے دن ہوئی تھی جو پیدا
نام پیرو رکھا گیا اس کا

غرض آوردہ ہے یہ بولن[4] کی
کیا کہوں اس کے شور و شیون کی

'میں' ہی ہر دم کیا کرے ہے مدام
رات اور دن یہی ہے اُس کا کام

جب تلک رو بہ رو رہوں بیٹھا
پیار سے منھ تکا کرے ہے مرا

اور جو جاؤں میں گھر سے ٹک باہر
جان کھا جائے میری ممیا[5] کر

1- پٹھ (بہ فتح اول) پٹھا، میمنا　2- مجھولی راس = منجھلی اولاد　3- برہ (برّہ) بکرے کا بچہ
4- بولن = کسی عورت کا نام　5- ممیانا (بہ کسر اول) = بکری کا آواز نکالنا

انس انساں سے وہ رکھے ہے بلا
کیونکہ گاہے رہی نہیں تنہا

کیا ہوا رنگ میں سیاہ ہے وہ
مردمِ چشم[1] مہر و ماہ ہے وہ

دونوں ہاتھ اس کے پر دو داغ سپید
تیرہ شب میں عیاں دو صبح امید

ہے دو رنگی میں وہ ملیح و صبیح
بربری[2] پر بھی اس کو ہے ترجیح

چھوٹی چھوٹی سنگوٹیاں[3] وہ تیز
جو دلِ چرخ میں ہوں روزن ریز[4]

وقت بازی جو سر کرے اونچا
لرزہ تن پر جدی[5] کے ہو پیدا

اُس کی ٹکر کا دیکھ کر انداز
قوچ[6] کے ہوش کر گئے پرواز

گردش چشم چرخِ شعبدہ باز
گوش مانند گوش[7] پیچ دراز

رشک جرع یمانی[8] قدحِ چشم
نخِ[9] ریشم سے نرم تر کچھ پشم

1- مردمِ چشم = آنکھ کی پتلی 2- بربری = سیاہ و سفید، چتی دار 3- سنگوٹیاں = چھوٹے سینگ
4- روزن ریز = شگاف ڈالنے والے 5- جدی = برج (Capricon) 6- قوچ = مینڈھا
7- گوش پیچ = ایک جانور جس کے لمبے کان بل کھائے ہوئے ہوتے ہیں 8- جرع یمانی = یمنی پیالہ، جام 9- نخ = ریشم کا باریک تار

سنبلیں موے اور آہو سُم
چوں شبِ وصل کوتہ اُس کی دُم

دیکھ بالوں کی اُس کے انبوہی[1]
سر بہ صحرا ہوئی بُزِ کوہی

اس کے دانتوں کو میں کیا جو قیاس
پارے شب، جیسے ریزۂ الماس

اِس قدر اُس کی تیز ہیں کھریاں[2]
دلِ خارا میں لگتی ہیں چھریاں

شوخ و شنگی میں ہے وہ از بس پانچ
مثل آہو کے وہ بھرے ہے کلانچ

دونوں باگ اس طرح مڑی ہے کہ بس
کہ دو باگا بھی واں ہے دنگ فرس

تس پہ مستک[3] کی اُس کے ہے وہ ادا
جس سے اک کوفت ہے بہ روے ہوا

طیش کھا کر جو ہووے ہے سرکش
دل کرے ہے کلائیوں پر غش

چار سُم رکھ کے بر سرِ دیوار
کود جاتی ہے وہ فلک کے پار

ہر ادا میں ہے اُس کی محبوبی
بُو، مَیں دیکھی نہیں بہ این خوبی

1- انبوہی = گٹھیلاپن 2- کھریاں = کھر 3- مستک= سر

لعب بازی میں وہ کرے ہے جو جَست
چوکڑی جوں بھرے ہے آہوے مست

اہلِ ورزش پہ ہو نہ عرصہ تنگ
جب دکھاوے وہ مشق پختہ شلنگ[1]

خصمِ سی پارہ، جیسے طفلِ لوند[2]
قل ہو اللہ چپائے با الحمد

تھے جو مغشوش[3] مجھ کنے اوراق
کھا گئی ان کو وہ بشانِ قاق[4]

دفترِ شعر خورد بُرد ہے یاں
بلکہ قرآن گاو خورد ہے یاں

کیا شجاعت کی اُس کی لکھوں بات
ہے مقابل وہ شیر کے دن رات

باگ بکری جو کھیلتے ہیں کبھو
تو انھیں بکریوں میں جان اس کو

بلکہ سنکار[5] دے جو کوئی تنک
حملہ آور ہو وہ بہ شیرِ فلک

اس کی گرمی کے آگے ہے ٹھنڈی
گوسپندِ فلک کی بُز منڈی

اس قدر پر نہیں طعام تلاش
ہے فقط سانی[6] پر ہی اُس کی معاش

1- شلنگ = چھلانگ　2- لوند (بروزن کند) = شریر، طناز　3- مغشوش (بروزن محسوس) درہم برہم، پراگندہ　4- قاق = سوکھی روٹی　5- سنکارنا = حملے پر اُبھارنا　6- سانی = جانوروں کے لیے تیار کیا ہوا مرکب کھانا

خانہ باش، اور ہے روٹیوں کی پلی
نہیں کھائی ببول کی بھی پھلی

مثل درویش صائم و شاغل
ہے مرے کھانے میں مگر شامل

آ رہے ہے غذا میں نت اس کی
نانِ گندم کبھی، کبھی کھچڑی

ان غذاؤں پہ نت رہے ہے شاد
سبزی کی قید سے ہے وہ آزاد

گر کسی نے کچھ آگے لا ڈالا
اُس نے چاہا جسے چبا ڈالا

نرم چارہ ہی اُس کا ہے مرغوب
یعنی خوش ہو کے کھاتی ہے وہ دوب[1]

کام چنداں نہیں درختوں سے
صلح پر ہے وہ سبز بختوں سے

ہاں مگر برگِ سِدرہ[2] اور امرود
کوئی لاوے تو کھائے زود از زود

کیا ہری ٹہنیاں چباتی ہے
خشک پتے جھڑے وہ کھاتی ہے

گرچہ صورت میں ہے وہ خرمنِ مشک
کہنا لازم ہے اس کو زاہدِ خشک

1- دوب = ہری گھاس 2- برگ سِدرہ = بیری کے پتے

نکلے ہے وقت معنی اندیشی
پوست پوشی سے اس کی درویشی

ہوتے بابا فرید[1] بھی گر آج
حق پرستی میں اس کو دیتے باج

مثل پورِ خلیل[2] لا ثانی
مستعد ہے برائے قربانی

ہے فدا وہ بہ خنجرِ تسلیم
ذبح ہونے سے اس کو کیا ہے بیم

گو گلے میں نہ اس کے ہووے پڑا
بہ تکلف بھنور لگے پٹا

طوقِ الفت کی ہے یہاں وہ اسیر
چاہیے کیا قلادہ[3] و زنجیر

خود گرفتارِ دامِ الفت ہے
گرچہ وحشی ہے، رامِ الفت ہے

نہ کہوں کیوں پری میں اس کے تئیں
جس کی پشکل[4] ہوں خالِ روے زمیں

دن کو گو ان میں ہے زحل کا رنگ
شب بہ پرویں ہے اس سے عرصہ تنگ

یعنی جب ہوتیاں ہیں آگ میں لال
دیدنی تب ہے ان کا حسن و جمال

1- حضرت بابا فریدالدین مسعود گنج شکر (ف: 5 محرم 670ھ) 2- حضرت اسمٰعیل علیہ السلام
3- قلادہ = پٹا 4- پشکل = مینگنی

ہو ستاروں کے ساتھ چشمک زن
دیگ داں کو کرے ہے رشکِ چمن

فقر و فاقے کی اُن میں ہے تاثیر
کیوں نہ خاکستر اُن کی ہو اکسیر

ابھی وہ نازنیں نہیں جھوٹی
اُس نے سونگھی نہیں جڑی بوٹی

جیسے صوفی کرے ہے گھر میں وجد
مثل لیلٰی گئی نہیں سوے نجد

نہیں دیکھی بہار سبز و شاخ
دامنِ کوہسار دشتِ فراخ

لب جو پر چری کب اس نے گھاس
کب گئی وہ کسی کے کھیت کے پاس

یہ جو صحرا کی ہے بناس[1] پتی
آئی کس روز اکل میں اُس کی

غم نہیں، ہے جو قیدی آٹھ پہر
غم نہیں، ہے جو بیش و کم لاغر

ہو کے گابھن جو ہو گی صحرا رَو
گوشت اس کا بڑھے گا دو دو جو[2]

ایک دو بچے بھی جنے ہی گی
الغرض وہ زچہ بنے ہی گی

☆☆☆☆

1- بناسپتی = سبزی، گھاس　2- جَو = ناپ کا اشاریہ (جَو برابر)

مثنوی قوچ کہ بہ زبان ہندی مینڈھا می گویند

یہ جو اُترا ہے چرخ سے مینڈھا
خالہ زادہ جدی[1] کا ہے گویا
سچ جو پوچھے کوئی تو میرے گھر
دولت آئی ہے پھاڑ کر چھپر

عالمِ غیب کا ہے ہاں یہ رسول
اس نے اوپر سے جو کیا ہے نزول
قشقہ زرد اس کی جو جبیں پر تھا
جان ہر ایک اس کو صدقے کیا

سمجھا کوئی پٹھ اسے بھوانی[2] کی
اور کوئی نارسنگ[3] کی چوکی
دیکھ اس کو کسی نے بے یارہ
کوئی لیتا گیا وہیں چارہ

کوئی کہنے لگا برائے ثواب
ذبح اب کرکے کیجے اس کے کباب

1- بُرج کا نام جسے انگریزی میں Capricorn کہتے ہیں 2- بھوانی (ہندوؤں کی دیوی)
3- نارسنگ، نرسمہا (دیوتا)

پر میں سمجھا بہ ایں ہمہ زحمت
ہے نزولِ فرشتۂ رحمت

کوئی پڑھنے لگا برب الناس
کیش بزہ کیا کسی نے قیاس

آج آیا ہے یہ بوقت دوپہر
کل براق آئے گا ز اوج سپہر

رہا دو شب تو وہ اسیرِ الم
خانۂ خالی میں بحالتِ غم

سر فگندہ رہا بہ روے زمیں
آب و دانا دیا میں اُس کو وہیں

گھر میں لایا نہ اُس کو کر وسواس
دل میں میرے پھرا کیا جو ہراس

یوں پھر آخر میں کودکوں سے کہا
یعنی جو طفل ہو قرآن پڑھا

پڑھ کے ماتھے پہ آیۃ الکرسی
یکدم اس کی کرے عزا پرسی

قل ھو اللہ پڑھ کے کوئی سہ بار
مارے پانی کے چھینٹے بے زنہار

کوئی والناس پڑھ کے بہر خدا
ہووے اعضا سے اس کے عقدہ کشا

غرض اس پر جو کچھ کہ تھا آسیب
ہوگیا ایک دم میں پا بہ رکیب[1]

1- پابہ رکیب = پابہ رکاب کی جگہ باندھا ہے

لرزہ پانْووں سے اُس کے دور ہوا
سایہ جو اس پہ تھا نفور ہوا

بعد از آں دے کے اس کو غسل بہ آب
کر دیا شستہ میں نے جوں مہتاب

روئیں اُس کے روئی سے کھل گئے سب
ہو گیا صاف اس کا چرک[1] و قصب[2]

نہیں بے چارہ کچھ طعام تلاش
اب مرے ہاتھ ہی ہے اس کی معاش

جب وہ پھرنے لگا بغیرِ رسن
از پئے پاسِ خاطرِ بولن

اس کا رکھ ناؤں[3] نیک نامی میں
دیا پیرو کی میں غلامی میں

دہن اس کا ہے گرچہ اب جکڑا
لیک فربہ ہو ہووے گا پڑا[4]

گر سیہ خط و خال ہے کوئی
لیک پشمِ بدن ہے جوں لوئی[5]

ہے ابھی تو وہ طفلِ نو رَستہ
لیک جب ہوئے گا حنا بستہ

دیکھیو تم تب اُس کی رنگینی
کیجیو تب چمن سے گل چینی

1- چرک = میل کچیل　2- قصب = نتھنے، سانس کی نالی　3- ناؤں = نام

4- پڑا = چوڑا　5- لوئی = آٹے یا میدے کا پیڑا، مراد نرم

ابھی شاخیں ذرا ذرا سی ہیں
کونپلیں ہیں سو کم نما سی ہیں

کیا وہ انداز جانے ٹکّر کا
ہے کسی کے پلا ہوا گھر کا

اُس نے کاہے کو دیکھا صدمۂ جنگ
آئیں کب شاخیں اس کی بر سرِ سنگ

جی میں ہے جب کہ ہو یہ سال پلٹ[1]
اس کو سنواؤں یارو کھٹ کھٹ

برگِ پلپل سے کر جبیں کو داغ
کر دوں چہرے کو اس کے لالہ باغ

اور بلا کر کے دستکار پسر
اس کے بالوں کو یوں کہوں کہ کتر

لاشہ[2] اس کا برہنہ ہو جو تمام
کر دوں مہندی لگا کے سب گلفام

پھر جہاں مَیں چلوں، وہ نامِ خدا
اُٹھ چلے ساتھ میرے پھُندنا سا

گر کوئی پوچھے کیوں یہ پالا ہے
میں کہوں لطفِ حق تعالیٰ ہے

سمجھو مریم کہ اس کی ہے یہ دلیل
نسل میں ہے نوادۂ[3] جبریل

1- یعنی ایک سال کا ہو جائے 2- لاشہ = بمعنی بدن استعمال کیا ہے 3- نوادہ = نواسہ

یا کہ کہتے ہیں جس کو ذبحِ عظیم
ہے اُسی طرح واجب التعظیم

سرکشی کا نہیں ہے اس میں نام
صورتِ حلم ہے وہ مینڈھا تمام

گر لِٹاوے کوئی رہے لیٹا
گر بٹھاوے کوئی رہے بیٹھا

ہاتھ پانْو اپنے کر دے خود وہ سست
وقتِ رفتار گرچہ ہے گا چست

اُس نے پایا جو ہے مزاج حلیم
اس سے واضح ہے معنیِ تسلیم

نشیدی روئی کا گالا ہے
یا اندھیرے کا وہ اُجالا ہے

اس کی پشمیں ہیں جیسے نخ کا تار
سگ پشمیں کب اُس کی پائے بہار

ہے یہ وصف دوم کہ یہ حیواں
نہیں کرتا بہ وقتِ ذبح فغاں

یعنی شکوے سبھی ہیں اُس کے بند
نہیں بانگ اس کی بُز کی طرح بلند

ہے ز بس واقفِ مقامِ رضا
جی سے عاشق ہے اس کی تیغ قضا

گرچہ مسلخ میں دہر کے بُز و میش
ذبح ہوتے چلے ہی آئے ہمیش

لیکن ایسا ذبح نرم گلو
نہیں دیکھا میں آج تک تو کبھو

جس کی گردن پہ پھیریں گر انگشت
تو وہ کر جائے کارِ تیغ درست

خلق کو مثلِ خالقِ بیدل[1]
اُس نے اب اپنا خوں کیا ہے بحل

مصحفی کشتۂ مقامِ رضا
سچ ہے کرتے ہیں یوں ہی جی کو فدا

لوٹے پوٹے بہ دامنِ قاتل
اور نہ کھاوے کبھی غمِ بسمل

☆☆☆☆

1- بیدل = محبت کرنے والا

مثنوی

در صفتِ طوطی کہ مسماۃ بی بولن خادمۂ میاں مصحفی مرحوم پروردہ بود

توتا بولن نے وہ جو پالا تھا
اس کا بندہ ہی رکھنے والا تھا

پہلے حجرے میں تھا مکاں اُس کا
کہ وہ حجرہ تھا بوستاں اُس کا

نے غلط، بلکہ آسمانِ بریں
نے غلط، بلکہ خوشۂ پرویں

ضیق سے اس میں وہ رہے تھا خفا
جوں قفس اس میں تھی یہ اپنی قضا

گرچہ اُس کی صفیر[1] تھی پُر سوز
اُس میں پر بولتا نہ تھا وہ ہنوز

دیکھ بولن نت اُس کا ضبطِ نفس
لائی اک جا سے مانگ کُہنہ قفس

بعضی چوبیں جو اُس میں تھیں کچھ سست
رسیاں باندھ کر درست کیں چُست

خارِ کج[2] اس کا آسماں پہ ہلال
چوب اڈّے کی اُستوا کی مثال

1- صفیر = پرندے کی بولی 2- خارِ کج = ٹیڑھا تار (قفس میں پرندے کے بیٹھنے کے لیے)

پیالیاں، کی جو میں بغور نگاہ
پیالیاں اُس کی رشکِ مہر و ماہ

ہوا حجرے سے جب قفس میں وہ بند
اُس سے ہونے لگی صفیر بلند

اُس میں وہ شاد شاد رہنے لگا
بارے ایک آدھ ہانک کہنے لگا

جب کہ منقار تیز کرتا تھا
اس میں اکثر وہ ریز[1] کرتا تھا

سبز پوشی سے اُس کی سبزک داغ
تھا خیاباں قفس کا اُس سے باغ

نت بہار خیال میں خوش تھا
عالمِ زیرِ بال میں خوش تھا

سُفتہ کرتی تھی دل کو اس کی صفیر
تھا زمرد قفس کے بیچ اسیر

بسکہ وہ اس کی لالہ گوں منقار
صاف ٹپکے تھا جس سے خونِ بہار

دلِ عاشق کو ریش کرتی تھی
دم بہ دم کارِ نیش کرتی تھی

منھ یہ چاکِ قفس میں ڈالے تھا
یوں وہ دل کی ہوس نکالے تھا

1- ریز کرنا = آواز نکالنا

چاہتا تھا بہ سوزنِ منقار
دے شگافِ قفس کو سی یکبار

تا نہ دیکھے وہ روے زاغِ فلک
باز کرتا نہ تھا پلک سے پلک

کبھی کرتا تھا عاشقانہ فغاں
کبھی کرتا تھا دلبرانہ بیاں

تھی صفیر اُس کی شدّ و مد کے ساتھ
بولتا تھا نہ جدّ و کدّ کے ساتھ

ناگہاں صرصرِ فراق آئی
لے اُڑی اُس کے تئیں شکیبائی

یعنی اک روز سر قفس سے نکال
باہر آیا وہ جھاڑ کر پر و بال

آکے بیٹھا جو گھر کے آنگن میں
نہ کیا فرق دوست دشمن میں

نہ تو راسو کا اُس کو ڈر آیا
اور نہ گربہ کا کچھ خطر آیا

دیکھ کر مرد و زن سے گھر خالی
پھر رہا تھا ولے بہ خوش حالی

ناگہاں جوں ہی گھر میں میں آیا
گھر کے آنگن میں اُس کو میں پایا

جوں ہی چاہا کہ پھر اسیر کروں
یا کسی طرح دست گیر کروں

مجھ سے آنکھیں ملا ملا توتا
رو بہ سوے فلک اُڑا توتا

اُس کے اُڑنے کا جو ہوا حد غم
میرے توتے سے اُڑ گئے اُس دم

آخرش اُس نے بے وفائی کی
اپنی خدمت سے یوں جدائی کی

اس کے جانے کا جو ملال ہوا
سر میرا صرف زیرِ بال ہوا

لیں جو اس بے وفا نے آنکھیں پھیر
اس کو جاتے لگی نہ مطلق دیر

تب یہ مضمون مجھ کو یاد آیا
جو کسی اہلِ دل نے فرمایا

یعنی ان تینوں میں نہیں ہے وفا
بیسوا اور سپاہی اور توتا

سن کے توتے کا یہ شگرف بیاں
آ کے بولن بھی حد ہوئی حیراں

دن گیا آئی باری جب شب کی
غم طوطی سے اُس نے تو تب کی

توتے کی بے وفا ہے، یارو ذات
بے وفائی کی اُس کی کیا کہوں بات

سالہا گر یہ پیشِ چشم رہے
لیک پھر آشنا نہیں جب اُڑے

کیونکہ آخر کو پھر جدائی ہے
کچھ بھی توتے کی آشنائی ہے

مصحفی کا یہ کارِ خامہ ہے
داستاں یا یہ طوطی نامہ ہے

☆☆☆☆

مثنوی دیگر

طوطی بہ پاس خاطر بی بولن

طوطی ہے جو زمرّدیں بال
چونچ اُس کی ہے مثلِ گُل لال

تصویرِ پری کا پاے خامہ
خونیں جگروں کا یا ہے نامہ

یا شمع و چراغ کی وہ لَو ہے
یا سرخ شفق میں ماہِ نَو ہے

پَر بھی اُس کے جو ہیں کم و بیش
تنکے یہ رکھیں ہیں نوش اور نیش

یا ہیں وہ بعینہ ماہ پارے
یا ہیں وہ شفق میں دو ستارے

ہوتی ہے نگاہ نغمہ راز
ناخن زنِ تارِ صوت آواز

مقراض میں کم نہیں یہ تیزی
آہن پہ کریں ہیں زخم ریزی

یعنی وہ قفس جو آہنی تھا
تار اُس کے کٹے پڑے ہیں صد جا

چوبیں قفس اس کے آگے کیا ہے
یاں لوہے تلک قلم پڑا ہے

آہن کی جو تیلیاں ہیں جوں خار
ہیں حائلِ زخم ہائے منقار

امرود ہو اُس کے آگے یا بیر
کر ڈالے ہے وہ کتر کتر ڈھیر

خوش خوش وہ نہ ہوئے کیوں ثمر خوار
خود میوہ خوری ہے اُس کی منقار

گر ہو وہ بہ لعلِ تازہ ہم سنگ[1]
ہیں پر بھی بہ برگ توت ہم رنگ

ان میں سے جو بعضے پستئی ہیں
وہ سبز پری کے جوا جئی ہیں

رکھتے ہیں جو بعضے رنگ دھانی
ہیں خود وہ بلائے آسمانی

ہیں بعضے کلاں کلاں جو ماشی[2]
ہے ان سے بہار سبزہ ناشی[3]

اور بعضے جو مونگ سے ہرے ہیں
وہ پر ان سے بھی کچھ پَرے ہیں

چشم اُس کی ہیں شکل مَردم چشم
باشکل عدس[4] دو دانہ پشم

1- ہم سنگ = ہم پلہ، برابر 2- ماشی = ماش کا رنگ 3- ناشی = پیدا ہونے والا
4- عدس = LENS

یا کہتے ہیں جس کے تئیں سویدا
سبزے میں ہوئی ہے آ کے پیدا

یا آپ پری کی ہیں وہ تمثال
یا چشم پری کے ہیں وہ دو خال

تجھ سے وہ منخروں[1] کے سوراخ
یا تاب دو تابدان یک کاخ

کاخ اس کا ہے کیا دماغِ پر سوز
چھتا ہے مومے جس کے تاموز

سبزے میں نہاں جو اس کے ہیں گوش
ہے سامعہ ناطقہ سے روپوش

یعنی کہ نوائے زاغکِ[2] زشت
زیبندہ نہیں بہ سبزہ و کشت

کہتے ہیں یہ جس کے تئیں ہریوا
باغوں میں ہے اس کا نام لیوا

سبزک کوئی اس پہ زہر کھاوے
یہ سبزیِ پَر کہاں سے لاوے

قیمت میں ہے اُس کی مُردہ مقصور
فیروزۂ سبزۂ نشاپور

کرتا ہے خوشی میں آ وہ جب ریز[3]
ہو جائے ہے جامِ سادہ لبریز

1- منخر (بروزن مسطر) = نتھنے 2- زاغک (کاف تصغیر کا ہے) حقیر کوا 3- ریز = چہچہا

دیکھے پر حور و بوریا باف
سیتل پاٹی سے یک قلم صاف

سبزے سے بھی جس کے نرم ہوں پر
دکھلاوے نہ باغِ سبز[1] کیوں کر

بے ریزۂ نرمی خستہ ہے یہ
پیوند ہزار بستہ ہے یہ

پھر تس پہ وہ لہریں اس کی دل کش
دل جس سے ہو غرقِ آب و آتش

شمشیرِ کشیدہ سی ہے وہ دُم
پروازِ خیال ہو جہاں گم

پا اس کے سوا جو کیجے تحریر
لکھیے ان کو دو ترکشِ تیر

دست اس کے میں کیا کہوں کہ کیا ہیں
رفتار کے وقت وہ بھی پا ہیں

قدرت سے ہے حق کی کون آگاہ
یاں خضر چلے ہے ہاتھوں سے راہ

پھر آٹھوں وہ انگلیوں کے ناخن
سر سبز بسانِ خارِ گُلبن

نشتر سے اگرچہ ہیں وہ سب تیز
لیکن نہیں نازکوں کے خوں ریز

1- باغ سبز دکھانا = دھوکا دینا مغالطہ میں رکھنا

رکھ دے جو وہ برگِ گل پہ پنجہ
پنجے سے نہ برگِ گل ہو رنجہ

پنجہ گری سے نیاز بازی
ناحق میں ہے اُس کی فتنہ سازی

گل سے دلِ بلبل صفیری
لیتا ہے بہ زور پنجہ گیری

پر جھاڑے تو گرد دل کی جھڑ جائے
سُنکھ ہو پسِ نگاہ لڑ جائے

ہوتی ہے گہے صفیر ریزی
دھانوں سے زباں کو اس کی تیزی

یعنی ہے برنج اس کا مطلوب
محبوب کو چاہیے ہے محبوب

بخشے مینا سے کیوں نہ مُکھ پھاٹ
میں اور بھی دیں ہیں اس کو سو چاٹ

اِس پر بھی ولیک ہو کے بیزار
لیتا ہے پھرا وہ آنکھیں یک بار

ڈر ہے یہ بہ تیغِ بے وفائی
کر دیوے نہ قطعِ آشنائی

اِس مُشت پَری[1] پہ وقت طیراں[2]
ہے آئینہ دیکھ اس کو حیراں

1- مشت پَری = مٹھی بھر پروں سے 2- طیران = اُڑان

سو کھانے وہ چٹ کرے ہے فی الحال
قُوت[1] اس کا ہے کیا چنے ہی کی دال

ہو کیوں نہ طبیعت اُس کی پھر تیز
یاں فلفل سرخ ہے سرِ میز

مانند بہشتیانِ ابرار
رکھتا ہے قلم سے بھی سروکار

گہہ آکے دوات ساتھ کھیلے
منقار میں گہہ قلم کو لے لے

تا اپنی بہ گاہِ لعب بازی
وہ آپ کرے ثنا طرازی

بن جھولے کبھی قفس میں جھولے
بن باد کبھی وہ آپ پھولے

کاغذ پہ رکھے ہے جب کہ منقار
ہے کلکِ فرید الدین عطار[2]

تا ملہم غیب کی زبانی
لکھے وہ پرندوں کی کہانی

اس تاج پہ ہدہدِ سلیماں
لایا ہے بہ حرباء[3] تحفۂ جاں

زاغ اس سے جو کچھ پھرا ہوا ہے
چڑیا کا وہ باولا ہوا ہے

1- قُوت (بروزن سُوت) غذا 2- مشہور صوفی شیخ فریدالدین عطار مصنف منطق الطیر وغیرہ جس کی طرف اگلے شعر میں اشارہ ہے 3- حربا = گرگٹ

کیا ڈر ہے جو وہ کریز[1] میں ہے
منقار تو اُس کی ریز میں ہے

پریوں سے ہے اُس کی ہم نشینی
اور خوانِ شہاں سے ریزہ چینی

رکھتا ہے غرض یہ مرغ دامی
با طوطیِ ہند ہم کلامی

شیریں ہے کلام اس کا یک سر
مصری ہو خوراک، خواہ شکر

اس پر ہے وہ چہچہے میں تیزی
گویا وہ کرے ہے سحر بیزی

پھر کیوں نہ ہو یعنی ہے یہ توتا
شاگرد کمینہ مصحفی کا

وہ مصحفی جس کی نظم دل کش
دیتی ہے لگا دلوں کو آتش

پتھر سے کرے ہے سبزہ پیدا
صامت کو بنائے ہے وہ گویا

ثانی کوئی اُس کا اور کم ہے
اس عہد میں یہ بھی مغتنم ہے

☆☆☆☆

1- کریز میں ہے = یعنی اگر اس کے پَر جھڑ رہے ہیں

قطعات

تاریخ وفات مسماۃ بی بی کلّو بنت بی بولن

جانتے ہیں سب اُس کو لاشک و ریب
گھر کی بولن کے جان تھی کلّو

اور میں بھی پکارتا تھا اُسے
کہہ کے اکثر یہ حرف: ''بی کلّو''

صرصرِ مرگِ نوجوانی سے
گل سی پژمردہ جب ہوئی کلّو

روئیں سر پیٹ پیٹ ماں بہنیں
کر کے یوں بین: ''اے مری کلّو''

مان بی بی بھی حد ہوئی گریاں
جوں ہی دیکھا کہ اب چلی کلّو

لے گئی تحفہ باغِ جنت میں
خندہ روئی، شگفتگی کلّو

ساتھ جنگلو کا اُس نے چھوڑ دیا
یعنی حورا سے جا ملی کلّو

سالِ تاریخ مصحفی نے لکھی
''داغ کیسا یہ دے گئی کلّو''
(=1212ھ)

قطعۂ وفات شخصے

اے باد صبا اگر تو جاوے
اس حجرے میں ہے جہاں فلانی

کہیو کہ ترا مریضِ دیدار
تھی جس کو تجھی سے شادمانی

اب تیرے فراق میں کرے ہے
بدتر از مرگ زندگانی

جاتے ہی تو اُس کو یوں گیا بھول
اے جانِ جہانِ مہربانی

جان اُس کی فراق سے ہے لب پر
رہتا ہے بہ حالِ نیم جانی

نے بات بھلی لگے کسی کی
نے خواب خوش آئے، نے کہانی

لب خشک ہیں اور چشم تر ہے
چہرے کا ہے رنگ زعفرانی

ہے گوشہ دامن اس کی کف میں
مژگاں ہیں بہ شکل خوں فشانی

خط بھیجنے کا نہیں جو مقدور
بارے بہ تسلّی زبانی

کر شاد اسے اور اس کے ہمراہ
کچھ بھیج دے ہاتھ کی نشانی

جاناں یہ سلوک ہو تو بہتر
ورنہ من و مرگِ ناگہانی

قطعہ در تہنیت عید مرزا علی حسن

شب اپنی بزم میں حسن مقطعات کے بیچ
چلا جو تہنیت عید کا کہیں مذکور

خیال میں مرے گزرا یہ مطلعِ عالی
کہ جس کا مطلع اختر ہے مدح سے معمور

زہے یگانہ کہ دارد ہرانچہ ہست ضرور
حسب، نسب، کرم، اقبال، دل، ہنر زر وزور

دعائے مصحفی یہ ہے کہ یہ نہالِ کرم
کہ جس کی جود سے پیر و جواں ہیں سب مشکور

رہے بہ مسندِ اقبال تا قیامِ جہاں
ہمیشہ سجدہ کرے ماہِ عید اس کے حضور

قطعہ برائے مرزا علی حسن

بس اس زمانے میں مرزا علی حسن کے سوا
رہا نہیں ہے مجھے مصحفی کسی سے کام
جو گھر رہوں ہوں تو لکھتا رہوں ہوں اُس کی مدح
جو یاں میں آؤں ہوں چل کر تو از برائے سلام

قطعہ بطور عرضی

لکھی میں یہ مدحتِ گرامی
مِن بعدِ قصیدہ قطعۂ چند
بعد اس کے قصیدۂ دگر بھی
جوں سلکِ گہر کیا قلم بند
دو تین میں قطعے بھی پڑھے تھے
اب مدح گری ہے بعد مانند
کی مدحتِ آں جناب میں نے
در صحت و رنج تا بہ فرزند
رومال کے بعد پھر رہا میں
نت نقد صلہ کا آرزومند
یہ بھی نہ سہی امید تنخواہ
تھی، سو وہ پڑی ہے قید میں بند

معلوم نہیں کہ ہوں میں نوکر
یا نقد کش کفِ خداوند

ہرچند کہ آپ کی زباں ہے
خوش تر از صد نبات و صد قند

پر ڈر ہے مجھے یہ حرف شیریں
ہوویں نہ تواضعِ سمرقند

القصہ بہر طریق مجھ کو
کچھ کیجیے عطا کہ ہوں میں خورسند

حاصل اس گفتگو سے یہ ہے
میں نے جو رقم کیا ہے یہ بند

اے آن کہ تو می خوری طعامے
بر شاعرِ خویش فاقہ مپسند

☆☆☆☆